کرشن چندر کے
34 بہترین افسانے

مرتبہ

عبدالرزاق واحدی

کرشن چندر کے
34 بہترین افسانے

عبدالرزاق واحدی

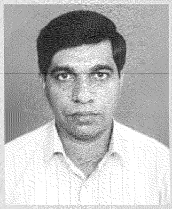

عبدالرزاق واحدی

کتاب ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھیئے اور

اپنی رائے کا اظہار ضرور کیجئے۔

ای میل abdulrazzaqwahidi@gmail.com

razafsana@yahoo.com

http://www.facebook.com/urdubook

کرشن چندر کے

34 بہترین افسانے

ترتیب و انتخاب

عبدالرزاق واحدی

فہرست

❖ پیش لفظ -- 5

1- ایک طوائف کا خط --- 7

2- دانی -- 15

3- بھگت رام -- 33

4- ایرانی پلاؤ --- 38

5۔ آدھے گھنٹے کا خدا -- 44

6۔ کالو بھنگی -- 59

7۔ تائی ایسری --- 77

8۔ پریتو -- 96

9۔ پورے چاند کی رات --- 109

10۔ مامتا -- 121

11۔ مچھلی جال -- 126

12۔ پانی کا درخت --- 135

13۔ سوروپے -- 152

14۔ دردگردہ -- 163

15۔ آنگی -- 175

16۔ شہزادہ -- 185

17۔ تالاب کی حسینہ -- 204

18۔ چڑیا کا غلام -- 210

19۔ نیا خزانہ -- 125

20۔ پھانسی کے سائے میں -- 227

21۔ سیٹھ جی -- 237

22۔ سیما -- 244

23۔ پہلا اور تیسرا -- 262

24۔ چندروز کی دنیا -- 271

25۔ جہلم میں ناؤ پر -- 285

26۔ سڑک کے کنارے -- 295

27۔ سفید جھوٹ -- 305

28۔ آتا ہے یاد -- 314

29۔ یرقان -- 328

30۔ پُل -- 343

31۔ آخری بس -- 350

32۔ دوفرلانگ لمبی سڑک -- 368

33۔ مہالکشمی کا پل -- 375

34۔ کچرا بابا -- 391

کرشن چندر — تعارف

کرشن چندر کے پورے خاندان نے دل و جان سے اردو کی خدمت کی تھی ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ بھی اردو کے افسانہ نگار تھے لیکن انہیں وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی حالاں کہ افسانہ نگاری میں مہندر ناتھ کا اپنا اسلوب تھا۔

اس کے علاوہ ان کی بہن سرلا دیوی بھی اردو کی کہانی کار تھی انہوں نے بھی کافی افسانے لکھے لیکن ذہنی توازن بگڑ جانے کے سبب ان کا لکھنا پڑھنا ختم ہو گیا تھا۔ سرلا دیوی کے شوہر ریوتی شرن شرما بھی اردو کے افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار تھے۔ آغا حشر کشمیری کے بعد ایک طرح سے ریوتی شرن شرما نے اردو ڈرامے اور اسٹیج کو زندہ کیا تھا۔ اس طرح سے اردو ادب پر کرشن چندر کے خاندان کے کافی احسانات ہیں۔

کرشن چندر کا خاندان کشمیری تھا لیکن ذہنی طور پر ان کی پرداخت لاہور میں ہوئی تھی۔ انہوں نے وہیں سے تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ انگریزی میں ایم اے اور پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت حاصل کر لی تھی۔ مگر وہ اس میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے اور پھر فلم لائن میں چلے گئے۔ انہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں منظر نامے اور مکالمے لکھے۔

کرشن چندر نے لکھنا شروع کیا تو مسلسل لکھتے رہے یہاں تک کہ جب ان کا انتقال

ہوا تب بھی وہ بیٹھ کر ایک مضمون لکھ رہے تھے۔ جس کا عنوان تھا ''ادب برائے بطخ'' اس کا انہوں نے صرف اولین جملہ ہی لکھا تھا۔ ''نورانی کو بچپن سے ہی پالتو جانوروں کا شوق تھا۔ کبوتر، بندر، رنگ برنگی چڑیاں''...... لیکن یہ جملہ مکمل بھی ہونے نہ پایا تھا کہ ان پر دل کا زبردست دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ کرشن چندر نے اپنی زندگی میں 20 ناول لکھے ان کے 30 افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

یہ ایک المیہ ہے کہ ایک ادیب جو صرف اپنے قلم کی کمائی پر زندہ تھا اور جسے بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو اس پر ایک خطیر رقم کا قرض تھا جسے اس وقت بمبئی کانگریس کے خازن رجنی پٹیل نے ادا کیا۔ شاید اسی لیے جاں نثار اختر کو کہنا پڑا تھا:

کوئی آسودہ نہیں اہل سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

عبدالرزاق واحدی

اپنی رائے کا اظہار ضرور کیجئے۔

ای میل abdulrazzaqwahidi@gmail.com

razafsana@yahoo.com

http://www.facebook.com/urdubook

ایک طوائف کا خط

مجھے اُمید ہے کہ اس سے پہلے آپ کو کسی طوائف کا خط نہ ملا ہوگا۔ یہ بھی امید کرتی ہوں کہ آج تک آپ نے میری اور اس قماش کی دوسری عورتوں کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو میرا یہ خط لکھنا کس قدر معیوب ہے اور وہ بھی ایسا کھلا خط مگر کیا کروں حالات کچھ ایسے ہیں اور ان دونوں لڑکیوں کا تقاضا اتنا شدید ہو کہ میں یہ خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ خط میں نہیں لکھ رہی ہوں، یہ خط مجھ سے بیلا اور بتول لکھوا رہی ہے۔ میں صدقِ دل سے معافی چاہتی ہوں، اگر میرے خط میں کوئی فقرہ آپ کو ناگوار گزرے۔ اسے میری مجبوری پر محمول کیجئے گا۔ بیلا اور بتول مجھ سے یہ خط کیوں لکھوار ہی ہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں اور ان کا تقاضا اس قدر شدید کیوں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے سے پہلے میں آپ کو اپنے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہوں، گھبرایئے نہیں۔ میں آپ کو اپنی گھناؤنی زندگی کی تاریخ سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں کب اور کن حالات میں طوائف بنی۔ میں کسی شریفانہ جذبے کا سہارا لے کر آپ سے کسی جھوٹے رحم کی درخواست کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں آپ کے دردمند دل کو پہچان کر اپنی صفائی میں جھوٹا افسانہ محبت نہیں گھڑنا چاہتی۔ اس خط کے لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو طوائفیت کے اسرار و رموز سے آگاہ کروں۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں صرف اپنے متعلق چند ایسی باتیں بتانا چاہتی ہوں جن کا آگے چل کر بیلا

اور بتول کی زندگی پر اثر پڑ سکتا ہے۔

آپ لوگ کئی بار بمبئی آئے ہوں گے۔ جناح صاحب نے تو بمبئی کو بہت دیکھا ہوگا مگر آپ نے ہمارا بازار کاہے کو دیکھا ہوگا۔ جس بازار میں میں رہتی ہوں وہ فارس روڈ کہلاتا ہے۔ فارس روڈ، گرانٹ روڈ اور مدن پورہ کے بیچ میں واقع ہے۔ گرانٹ روڈ کے اس پار لمنگٹم روڈ اور اوپر ہاؤس اور چوپاٹی میرین ڈرائیور اور فورٹ کے علاقے ہیں جہاں بمبئی کے شرفا رہتے ہیں۔ مدن پورہ میں اس طرف غریبوں کی بستی ہے۔ فارس روڈ ان دونوں کے بیچ میں ہے تاکہ امیر اور غریب اس سے یکساں مستفید ہوسکیں۔ گو فارس روڈ پھر بھی مدن پورہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ ناداری میں اور طوائفیت میں ہمیشہ بہت کم فاصلہ رہتا ہے۔ یہ بازار بہت خوبصورت نہیں ہے، اس کے مکین بھی خوبصورت نہیں ہیں اس کے بیچوں بیچ ٹرام کی گڑگڑاہٹ شب و روز جاری رہتی ہے۔ جہاں بھر کے آوارہ کتے اور لونڈے اور شہدے اور بے کار اور جرائم پیشہ مخلوق اس کی گلیوں کا طواف کرتی نظر آتی ہے۔ لنگڑے، لولے، اوباش، مدقوق تماش بین۔ آتشک وسوزاک کے مارے ہوئے کانے، گنجے، کوکین باز اور جیب کترے اس بازار میں سینہ تان کر چلتے ہیں۔ غلیظ ہوٹل، سیلے ہوئے فٹ پاتھ پر میلے کے ڈھیروں پر بھنبھناتی ہوئی لاکھوں مکھیاں لکڑیوں اور کوئلوں کے افسردہ گودام، پیشہ ور دلال اور باسی ہار بیچنے والے کوک شاستر اور ننگی تصویروں کے دُکان دار، چینی حجام اور اسلامی حجام اور لنگوٹے کس کر گالیاں بکنے والے پہلوان، ہماری سماجی زندگی کا سارا کوڑا کرکٹ آپ کو فارس روڈ پر ملتا ہے۔ ظاہر ہے آپ یہاں کیوں آئیں گے۔ کوئی شریف آدمی ادھر کا رُخ نہیں کرتا، شریف آدمی جتنے ہیں وہ گرانٹ روڈ کے اس پار رہتے ہیں اور جو بہت ہی شریف ہیں وہ ملبار ہل پر قیام کرتے ہیں۔

میں ایک بار جناح صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گزری تھی اور وہاں میں نے جھک کر سلام بھی کیا تھا بتول بھی میرے ساتھ تھی۔ بتول کو آپ سے (جناح صاحب) جس قدر عقیدت ہے اس کو میں کبھی ٹھیک طرح سے بیان نہ کرسکوں گی۔ خدا اور رسول کے بعد دنیا

میں اگر وہ کسی کو چاہتی ہو تو صرف وہ آپ ہیں۔ اس نے آپ کو تصویر لاکٹ میں لگا کر اپنے سینے سے لگا رکھی ہو۔ کسی بُری نیت سے نہیں۔ بتول کی عمر ابھی گیارہ برس کی ہے، چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے وہ۔ گو فارس روڈ والے ابھی سے اس کے متعلق بُرے بُرے ارادے کر رہے ہیں مگر خیر وہ کبھی بھی آپ کو بتاؤں گی۔ تو یہ ہے فارس روڈ جہاں میں رہتی ہوں، فارس روڈ کے مغربی سرے پر جہاں چینی حجام کی دُکان ہے اس کے قریب ایک اندھیری گلی کے موڑ پر میری دُکان ہے۔ لوگ تو اسے دُکان نہیں کہتے مگر خیر آپ دانا ہیں آپ سے کیا چھپاؤں گی۔ یہی کہوں گی وہاں پر میری دُکان ہے اور وہاں پر میں اس طرح بیوپار کرتی ہوں جس طرح بنیاد، سبزی والا، پھل والا، ہوٹل والا، موٹر والا، سینیما والا، کپڑے والا یا کوئی اور دُکاندار بیوپار کرتا ہے اور ہر بیوپار میں گاہک کو خوش کرنے کے علاوہ اپنے فائدہ کا بھی سوچتا ہے۔ میرا بیوپار بھی اسی طرح کا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ میں بلیک مارکیٹ نہیں کرتی اور مجھ میں اور دوسرے بیوپاریوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دُکان اچھی جگہ پر واقع نہیں ہے۔ یہاں رات تو کجا دن میں بھی لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس اندھیری گلی میں لوگ اپنی جیبیں خالی کر کے جاتے ہیں۔ شراب پی کر جاتے ہیں۔ جہاں بھر کی گالیاں بکتے ہیں۔ یہاں بات بات پر چھرا زنی ہوتی ہے، وہ ایک خون دوسرے تیسرے روز ہوتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہر وقت جان ضیق میں رہتی ہے اور پھر میں کوئی اچھی طوائف نہیں ہوں کہ پونا جا کے رہوں یا ورلی پر سمندر کے کنارے ایک کوٹھی لے سکوں۔

میں ایک بہت ہی معمولی درجے کی طوائف ہوں اور اگر میں نے سارا ہندوستان دیکھا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ہر طرح کے لوگوں کی صحبت میں بیٹھی ہوں لیکن اب دس سال سے اسی شہر بمبئی میں۔ اسی فارس روڈ پر۔ اسی دُکان میں بیٹھی ہوں اور اب تو مجھے اس دُکان کی پگڑی بھی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے حالانکہ یہ جگہ کوئی اتنی اچھی نہیں۔ فضا متعفن ہے، کیچڑ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ گندگی کے انبار لگے ہوئے ہیں اور خارش زدہ کتے گھبرائے ہوئے گاہکوں کی طرف کاٹ کھانے کو لپکتے ہیں پھر بھی مجھے اس جگہ کی پگڑی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔ اس جگہ میری دُکان ایک منزلہ مکان میں ہے۔ اس کے دو کمرے ہیں۔ سامنے کا

کمرہ میری بیٹھک ہے۔ یہاں میں گاتی ہوں، ناچتی ہوں، گاہکوں کو رجھاتی ہوں، پیچھے کا کمرہ، باورچی خانے اور غسل خانے اور سونے کے کمرے کا کام دیتا ہے۔ یہاں ایک طرف نل ہے۔ایک طرف ہنڈیا ہے اور ایک طرف ایک بڑا سا پلنگ ہے اور اس کے نیچے ایک اور چھوٹا سا پلنگ ہے اور اس کے نیچے میرے کپڑوں کے صندوق ہیں، باہر والے کمرے میں بجلی کی روشنی ہے لیکن اندر والے کمرے میں بالکل اندھیرا ہے۔ مالک مکان نے برسوں سے قلعی نہیں کرائی نہ وہ کرائے گا۔اتنی فرصت کسے ہے۔ میں تو رات بھر ناچتی ہوں،گاتی ہوں اور دن کو وہیں گاؤ تکیے پر سر ٹیک کر سو جاتی ہوں۔ بیلا اور بتول کو پیچھے کا کمرہ دے رکھا ہے۔اکثر گاہک جب اِدھر منہ دھونے کے لیے جاتے ہیں تو بیلا اور بتول پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگ جاتی ہیں جو کچھ ان کی نگاہیں کہتی ہیں۔ میرا یہ خط بھی وہی کہتا ہے۔اگر وہ میرے پاس اس وقت نہ ہوتیں تو یہ گناہ گار بندی آپ کی خدمت میں یہ گستاخی نہ کرتی، جانتی ہوں دنیا مجھ پر تھوتھو کرے گی جانتی ہوں شاید آپ تک میرا یہ خط بھی نہ پہنچے گا۔پھر بھی مجبور ہوں یہ خط لکھ کے رہوں گی کہ بیلا اور بتول کی مرضی یہی ہے۔

شاید آپ قیاس کر رہے ہوں کہ بیلا اور بتول میری لڑکیاں ہیں۔نہیں یہ غلط ہے میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ان دونوں لڑکیوں کو میں نے بازار سے خریدا ہے۔جن دنوں ہندو مسلم فساد زوروں پر تھا، اور گرانٹ روڈ، فارس روڈ اور مدن پورہ پر انسانی خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ان دنوں میں نے بیلا کو ایک مسلمان دلال سے تین سو روپے کے عوض خریدا تھا۔ یہ مسلمان دلال اس لڑکی کو دہلی سے لایا تھا جہاں بیلا کے ماں باپ رہتے تھے۔ بیلا کے ماں باپ راولپنڈی میں راجہ بازار کے عقب میں پونچھ ہاؤس کے سامنے کی گلی میں رہتے تھے، متوسط طبقے کا گھرانہ تھا،شرافت اور سادگی گھٹی میں پڑی تھی۔ بیلا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور جب راولپنڈی میں مسلمانوں نے ہندوؤں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا اس وقت چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ یہ بارہ جولائی کا واقعہ ہے۔ بیلا اپنے اسکول سے پڑھ کر گھر آ رہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے سامنے اور دوسرے ہندوؤں کے گھروں کے سامنے ایک جم غفیر

دیکھا۔ یہ لوگ مسلح تھے اور گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور لوگوں کو اور ان کے بچوں کو اور ان کی عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر انہیں قتل کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے جاتے تھے۔ بیلا نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ وحشی مسلمانوں نے اس کے پستان کاٹ کر پھینک دیئے تھے۔ وہ پستان جن سے ایک ماں کوئی ماں، ہندو ماں یا مسلمان ماں، عیسائی ماں یا یہودی ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور انسانوں کی زندگی میں کائنات کی وسعت میں تخلیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے وہ دودھ بھرے پستان اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کاٹ ڈالے گئے۔ کسی نے تخلیق کیساتھ اتنا ظلم کیا تھا۔ کسی ظالم اندھیرے نے ان کی روحوں میں یہ سیاہی بھر دی تھی۔ میں نے قرآن پڑھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ راولپنڈی میں بیلا کے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسلام نہیں تھا وہ انسانیت نہ تھی، وہ دشمنی بھی نہ تھی، وہ انتقال بھی نہ تھا، وہ ایک ایسی سعادت، بے رحمی، بزدلی اور شیطنت تھی جو تاریخی کے سینے سے پھوٹتی ہے اور نور کی آخری کرن کو بھی داغدار کر جاتی ہے۔ بیلا اب میرے پاس ہے۔ مجھ سے پہلے وہ داڑھی والے مسلمان دلال کے پاس تھی، بیلا کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی جب وہ چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اپنے گھر میں ہوتی تو آج پانچویں جماعت میں داخل ہو رہی ہوتی۔ پھر بڑی ہوتی تو اس کے ماں باپ اس کا بیاہ کسی شریف گھرانے کے غریب سے لڑکے سے کر دیتے، وہ اپنا چھوٹا سا گھر بساتی، اپنے خاوند سے، اپنے ننھے ننھے بچوں سے، اپنی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے۔ لیکن اس نازک کلی کو بے وقت خزاں آ گئی، اب بیلا بارہ برس کی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی عمر تھوڑی ہے لیکن اس کی زندگی بہت بوڑھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو ڈر ہے۔ انسانیت کی جو تلخی ہے یا اس کا جو لہو ہے موت کی جو پیاس ہے قائداعظم صاحب شاید اگر آپ اسے دیکھ سکیں تو اس کا اندازہ کر سکیں۔ ان بے آسرا آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر سکیں۔ آپ تو شریف آدمی ہیں۔ آپ نے شریف گھرانے کی معصول لڑکیوں کو دیکھا ہوگا ہندو لڑکیوں کو مسلمان لڑکیوں کو، شاید آپ سمجھ جاتے کہ معصومیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ ساری انسانیت

کی امانت ہے۔ ساری دنیا کی میراث ہے جو اسے مٹاتا ہے اسے دنیا کے کسی مذہب کا کوئی خدا معاف نہیں کر سکتا۔

بتول اور بیلا دونوں سگی بہنوں کی طرح میرے ہاں رہتی ہیں۔ بتول اور بیلا سگی بہنیں نہیں ہیں۔ بتول مسلمان لڑکی ہے۔ بیلا نے ہندو گھر میں جنم لیا۔ آج دونوں فارس روڈ پر ایک رنڈی کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ اگر بیلا راولپنڈی سے آئی ہے تو بتول جالندھر کے ایک گاؤں کھیم کرن کے ایک پٹھان کی بیٹی ہے۔ بتول کے باپ کی سات بیٹیاں تھیں، تین شادی شدہ اور چار کنواریاں، بتول کا باپ کھیم کرن میں ایک معمولی کاشتکار تھا۔ غریب پٹھان لیکن غیور پٹھان جو دیوں سے کھیم کرن میں آ کے بس گیا تھا۔ جاٹوں کے اس گاؤں میں یہی تین چار گھر پٹھانوں کے تھے، یہ لوگ جس حلم و آشتی سے رہتے تھے شاید اس کا اندازہ پنڈت جی آپ کو اس امر سے ہوگا کہ مسلمان ہونے پر بھی ان لوگوں کو اپنے گاؤں میں مسجد بنانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ لوگ گھر میں چپ چاپ اپنی نماز ادا کرتے، صدیوں سے جب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عنان حکومت سنبھالی تھی کسی مومن نے اس گاؤں میں اذان نہ دی تھی۔ ان کا دل عرفان سے روشن تھا لیکن دنیاوی مجبوریاں اس قدر شدید تھیں اور پھر رواداری کا خیال اس قدر غالب تھا کہ لب وا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بتول اپنے باپ کی چہیتی لڑکی تھی۔ ساتوں میں سب سے چھوٹی، سب سے پیاری، سب سے حسین، بتول اس قدر حسین ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔ پنڈت جی آپ تو خود کشمیری النسل ہیں اور فن کار ہو کر یہ بھی جانتے ہیں کہ خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔ یہ خوبصورتی آج میری گندگی کے ڈھیر میں گڈمڈ ہو کر اس طرح پڑی ہے کہ اس کا پرکھ کرنے والا کوئی شریف آدمی اب مشکل سے ملے گا۔ اس گندگی میں گلے سڑے مارواڑی، گھن، مونچھوں والے ٹھیکیدار، ناپاک نگاہوں والے چار بازاری ہی نظر آتے ہیں۔ بتول بالکل اَن پڑھ ہے۔ اُس نے صرف جناح صاحب کا نام سنا تھا، پاکستان کو ایک اچھا تماشہ سمجھ کر اس کے نعرے لگائے تھے۔ جیسے تین چار برس کے ننھے بچے گھر میں انقلاب زندہ باد کرتے پھرتے ہیں، گیارہ برس ہی کی تو وہ ہے۔ اَن پڑھ بتول، وہ چند دن ہی ہوئے میرے

پاس آئی ہے۔ ایک ہندو دلال اسے میرے پاس لایا تھا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے میں خرید لیا۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ ہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے بہت کچھ کہا ہے کہ اگر آپ اسے سن لیں تو شاید پاگل ہو جائیں۔ بتول بھی اب نیم پاگل ہے۔ اس کے باپ کو جاٹوں نے اس بیدردی سے مارا ہے کہ ہندو تہذیب کے پچھلے چھ ہزار برس کے چھلکے اتر گئے ہیں اور انسانی بربریت اپنے وحشی ننگے روپ میں سب کے سامنے آ گئی ہے۔ پہلے تو جاٹوں نے اس کی آنکھیں نکال لیں پھر اس کے منہ میں پیشاب کیا، پھر اس کے حلق کو چیر کر اس کی یہ آنتیں تک نکال ڈالیں۔ پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی منہ کالا کیا۔ اسی وقت ان کے باپ کی لاش کے سامنے، ریحانہ، گل درخشاں، مرجانہ، سوہن، بیگم، ایک ایک کر کے وحشی انسان نے اپنے مندر کی مورتیوں کو ناپاک کیا۔ جس نے انہیں زندگی عطا کی، جس نے انہیں لوریاں سنائی تھیں، جس نے ان کے سامنے شرم اور عجز سے اور پاکیزگی سے سر جھکا دیا تھا۔ ان تمام بہنوں، بہوؤں اور ماؤں کے ساتھ زنا کیا۔ ہندو دھرم نے اپنی عزت کھو دی تھی اپنی رواداری تباہ کر دی تھی، اپنی عظمت مٹا ڈالی تھی، آج رگ وید کا ہر منتر خاموش تھا۔ آج گرنتھ صاحب کا ہر دوہا شرمندہ تھا۔ آج گیتا کا ہر اشلوک زخمی تھا۔ کون ہے جو میرے سامنے اجنتا کی مصوری کا نام لے سکتا ہے۔ اشوک کے کتبے سنا سکتا ہے، ایلورا کے صنم زادوں کے گن گا سکتا ہے۔ بتول کے بے بس بھینچے ہوئے ہونٹوں، اس کی بانہوں پر وحشی درندوں کے دانتوں کے نشان اور اس کی بھری ہوئی ٹانگوں کی ناہمواری میں تمہاری اجنتا کی موت ہے۔ تمہارے ایلورا کا جنازہ ہے۔ تمہاری تہذیب کا کفن ہے۔ آؤ آؤ میں تمہیں اس خوبصورتی کو دکھاؤں جو کبھی بتول تھی۔ اس متعفن لاش کو دکھاؤں جو آج بتول ہے۔ جذبے کی رو میں بہہ کر میں بہت کچھ کہہ گئی۔ شاید یہ سب مجھے نہ کہنا چاہئے تھا۔ شاید اس میں آپ کی ہتک ہے۔ شاید اس سے زیادہ ناگوار باتیں آپ سے اب تک کسی نے نہ کی ہوں نہ سنائی ہوں گی۔ شاید آپ یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ شاید تھوڑا ابھی نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ہمارے ملک میں آزادی آ گئی ہے۔ ہندوستان میں اور پاکستان میں اور شاید ایک طوائف کو بھی اپنے رہنماؤں سے پوچھنے کا یہ حق ضرور ہے کہ

اب بیلا اور بتول کا کیا ہوگا۔ بیلا اور بتول دو لڑکیاں ہیں، دو قومیں ہیں، دو تہذیبیں ہیں، دو مندر اور مسجد ہیں۔

بیلا اور بتول آج کل فارس روڈ پر ایک رنڈی کے ہاں رہتی ہیں جو چینی حجام کی بغل میں اپنی دُکان کا دھندا چلاتی ہے۔ بیلا اور بتول کو یہ دھندا پسند نہیں۔ میں نے انہیں خریدا ہے۔ میں چاہوں تو ان سے یہ کام لے سکتی ہوں۔ لیکن میں سوچتی ہوں میں یہ کام نہیں کروں گی جو راولپنڈی اور جالندھر نے ان سے کیا ہے۔ میں نے انہیں اب تک فارس روڈ کی دنیا سے الگ تھلگ رکھا ہے پھر بھی جب میرے گاہک پچھلے کمرے میں جا کر اپنا منہ ہاتھ دھونے لگتے ہیں، اس وقت بیلا اور بتول کی نگاہیں مجھ سے کہنے لگتی ہیں مجھے ان نگاہوں کی تاب نہیں۔ میں ٹھیک طرح سے ان کا سندیسہ بھی آپ تک نہیں پہنچا سکتی ہوں۔ آپ کیوں نہ خود ان نگاہوں کا پیغام پڑھ لیں۔ پنڈت جی میں چاہتی ہوں کہ آپ بتول کو اپنی بیٹی بنا لیں۔ جناح صاحب میں چاہتی ہوں کہ آپ بیلا کو اپنی دختر نیک اختر سمجھیں ذرا ایک دفعہ انہیں اس فارس روڈ کے چنگل سے چھڑا کے اپنے گھر میں رکھے اور ان لاکھوں روحوں کا نوحہ سنئے۔ یہ نوحہ جو نوا کھالی سے راولپنڈی تلک اور بھرت پور سے بمبئی تک گونج رہا ہے۔ کیا صرف گورنمنٹ ہاؤس میں اس کی آواز سنائی نہیں دیتی، یہ آواز سنیں گے آپ؟ آپ کی مخلص فارس روڈ کی ایک طوائف۔

دانی

دانی لمبا اور بدصورت تھا۔ اس کی ٹانگوں اور بانہوں پر بال کثرت سے تھے اور بے حد کھردرے تھے۔ صبح سویرے چارک روڈ کے ہائیڈ رینٹ پر نہاتے ہوئے وہ دور سے دیکھنے والوں کو بالکل بھینس کا ایک بچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم میں واقعی ایک بیل کی سی طاقت تھی۔ اس کا سر بڑا، ماتھا چوڑا اور کھوپڑی بڑی مضبوط تھی۔ دن بھر وہ چارک روڈ کے ناکے پر ایرانی ریستوران میں بڑی مستعدی سے کام کرتا اور رات کو ٹھراپی کر ایک مینڈھے کی طرح سر نیچا کر کے ہر کس و ناکس سے کہتا۔ ''آؤ میرے سر پر ٹکر مارو۔'' مگر یار لوگ ہنس کر طرح دے جاتے تھے کیونکہ دانی کا سر ہی نہیں اس کا جسم بھی بے حد مضبوط تھا۔ دو تین بار تھوگا لین اور ڈورا گلی کے چند کسرتی نوجوانوں نے اس کا چیلنج منظور کرتے ہوئے اسے نکڑ پر گھیرا تھا اور نتیجہ میں اپنے سر پھڑوا کر چلے گئے تھے پھر کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ دانی کے سر سے ٹکر لے سکے۔

غالباً دانی کے سر میں ہڈی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر مغز کا گودا ہوتا تو وہ باآسانی تھوڑی سی عقل صرف کر کے بمبئی کا دادا بن سکتا تھا۔ اس سے کم ڈیل ڈول اور طاقت والے نوجوان اپنے اپنے علاقوں کے ذی اثر دادا بن چکے تھے اور غنڈوں کی پلٹنوں پر حکومت کرتے تھے، شراب اسمگل کرتے تھے، سٹہ کھلاتے تھے، سینما کے ٹکٹ بلیک میں بیچتے تھے۔ رنڈیوں کے کوٹھے چلاتے تھے اور الیکشن کے موقعے پر اپنے علاقے کے ووٹ بیچتے تھے۔

مگر شاید دانی کی کھوپڑی میں بھیجا نہ تھا کیونکہ اسے اس قسم کے تمام کاموں سے الجھن سی ہوتی تھی۔ جب کوئی اسے اس قسم کا مشورہ دیتا تو اس کے چہرے پر شدید بیزاری کے اثرات نمایاں ہو جاتے اور وہ کہنے والے کی طرف اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی چوڑی کر کے، ہونٹ بھینچ کر سر جھکا کے، کندھے سکیڑ کے ایک حملہ کرنے والے مینڈھے کی طرح خطرناک پوز لے کر کہتا۔ ''پھر بولا تو ٹکر مار دوں گا۔''

اور مشورہ دینے والا کھسیا کر ہنس کر پرے ہٹ جاتا۔

دانی کو پڑھنے سے نفرت تھی۔ وہ تعلیم یافتہ آدمیوں کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا۔ دانی کو شہرت سے نفرت تھی۔ جب کبھی کسی بڑے اور مشہور آدمی کا جلوس چارک پارک سے گزرتا اور اس عظیم الشان ہستی کو پھولوں میں لدے ہوئے، ایک کھلی کار میں بیٹھے ہوئے دو رویہ ہجوم کی سلامی لیتا ہوا دیکھتا تو کہتا:

''واہ، کیا سجا ہوا مینڈھا ہے۔ اس سے پوچھو، میرے سر سے ٹکر لے گا؟''

واقعی ذرا غور کرو تو صرف جنگِ آزادی کے دنوں میں دبلے پتلے لیڈر آتے تھے۔ آجکل جوں جوں عوام کی حالت پتلی ہوتی جاتی ہے، لیڈر موٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اس قدر لحیم و شحیم اور موٹے تازے دستیاب ہوتے ہیں۔ آجکل کہ ان پر باآسانی کسی مینڈھے یا ناگوری بیل کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔

دانی کو سیاست سے بھی سخت نفرت تھی۔ اونچی سیاست تو خیر اس کے پلے ہی نہ پڑتی تھی۔ لیکن وہ جو ایک سیاست ہوتی ہے، گلی، محلے، بازار اور ریستوران کی، وہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ بس اسے صرف کام کرنا پسند تھا۔ حالانکہ دانی مسلسل سولہ گھنٹے کام کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر ریستوران کا مالک بھی کیا کرے، وہ قانون کے ہاتھوں مجبور تھا اور دانی اپنی فطرت کے ہاتھوں، اس لئے وہ صبح سویرے سب سے پہلے ریستوران میں آتا اور سب نوکروں کے بعد جاتا اور دن بھر کھڑے کھڑے انتہائی چوکسی سے سب کام سب سے پہلے کرتا اور جب ریستوران بند ہو جاتا اور دن بھر کی مشقت سے بھی دانی کا جسم نہ تھکتا تو وہ انتہائی بیزار

ہو کر ٹھرا پی لیتا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر اپنے دوستوں سے ٹکریں لڑانے کو کہتا اور جب کوئی تیار نہ ہوتا تو وہ مایوس ہو کر اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیتا اور فٹ پاتھ پر گر کر سو جاتا۔ بس یہی اس کی زندگی تھی۔

کم و بیش یہی اس کے دوسرے ساتھیوں کی زندگی تھی، جو اس کے ساتھ ریستوران میں کام کرتے تھے اور اسی فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ جو چارک چوک کے ریستوران کے بالکل سامنے سڑک پار کر کے چارک چرچ کے سامنے واقع ہے۔ چارک چرچ ایک چھوٹے سے میدان میں ایک طرف نیلے پتھروں کا بنا ہوا ایک خوبصورت گراؤنڈ ہے۔ جس میں مقدس ماں کا بت ہے۔ ایک طرف گل مہر کے دو پیڑ ہیں۔ جن کا سایہ دن میں فٹ پاتھ کے اس حصے کو ٹھنڈا رکھتا ہے۔ ان پیڑوں کی چھاؤں میں غریب عیسائی، موم شمعیں، یسوع مسیح اور مریم کے مومی بت اور گیندے کے ہار بیچتے نظر آتے ہیں۔ دو بھکاری دن میں بھیک مانگتے ہیں اور رات کو کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر سڑک کے کنارے چھتے ہوئے بس اسٹاپ میں، جہاں بس کا کیو لگانے والوں کے علاوہ آس پاس کے نوجوانوں کا بھی مجمع رہتا ہے۔ کیونکہ یہ بس اسٹاپ مسافروں کے ویٹنگ روم ہی نہیں، عاشقوں کے ملاقات گھر بھی ہیں۔ پانچ بجے ڈی اسٹاپ پر مل جانا، روزی گرجا سے نکلتے ہوئے، دزدیدہ نگاہوں سے اپنے عاشق وکٹر کو دیکھتی ہوئی آہستہ سے کہتی ہے اور پھر اپنی خوفناک اماں کے ساتھ گھبرا کر آگے بڑھ جاتی ہے اور پھر وکٹر یا جیمس یا چارلس دھڑکتے ہوئے دل سے اور بے چین نگاہوں سے کبھی گھڑی دیکھتا ہوا، کبھی اپنی پیٹی کستا ہوا روزی کا انتظار کرتا ہے، ساڑھے چار بجے ہی سے۔ اور دیکھتا ہے کہ جوزف اپنی ڈیزی کو لے کر گیا اور ٹام اپنی ازابیل کو لے کر بھاگا اور شیلا، فوجا سنگھ کے ساتھ چلی گئی۔ اس سالی شیلا کو کوئی عیسائی پسند ہی نہیں آتا۔ بلڈی شٹ! اور یہ لارا بھی گئی اس یہودی چھوکرے کے ساتھ، جس کا جانے کیا نام ہے۔ لیکن جو ہر روز پانچ بجے اپنی موٹر سائیکل یہیں کھڑی کرتا ہے۔ اب ساڑھے پانچ ہوں گئے۔ اب پونے چھ ہوں گئے۔ اب اگر روزی نہیں آئی تو وہ لوگ ''گن آف نو وارڈ'' دیکھ کر کیا کرے گا۔ سن آف ایگن، چھ بج گئے۔ روزی نہیں

آئی۔ وہ نہیں آئے گی۔ شاید وہ فرانسس کے ساتھ چلی گئی۔ جس کے ساتھ اس کی ماں، اس کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ بلڈی سوائین۔ وہ فرانسس کو گولی مار دے گا۔ روزی کو بھی گولی مار دے گا اور اس کی منحوس ماں کو جو ہر وقت سائے کی طرح روزی کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ وہ برگائین فیملی کے ہر فرد کو گولی سے مار دے گا اور پھر خود بھی گولی مار کر مر جائے گا۔ یکا یک وکٹر نے دور سے روزی کو ہلکے لیمن رنگ کے تافیتا فراک میں پھولوں کی ایک شاخ کی طرح جھولتے دیکھا اور اس کے دل سے گولی مارنے کا خیال ایک دم نکل گیا اور اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا اور وہ بے اختیار روزی کی طرف بھاگا اور بھاگتے بھاگتے ایک دوڑتی ہوئی لاری کے نیچے آنے سے بال بال بچ گیا۔ روزی کے منہ سے خوف کی ایک چیخ نکلی۔ مگر دوسرے لمحے میں وکٹر کا ہاتھ اس کی کمر میں تھا اور وہ اسے دوڑاتے ہوئے لاریوں، گاڑیوں، ٹیکسیوں کی بھیڑ سے نکالتے ہوئے ڈی بس اسٹاپ پر لے گیا۔ بس چل چکی تھی مگر دونوں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا۔ چند لمحوں کے لئے روزی کا لیمن رنگ فراک کا گول گھیرا تماشائیوں کی نگاہوں میں گھوما۔ پھر وہ دونوں پھولی ہوئی سانسوں میں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کو بازو سے پکڑے ہوئے ڈی بس کی اوپر کی منزل میں چلے گئے۔ جہاں سے آسمان نظر آتا ہے اور ہوا تازہ ہوتی ہے اور نیچے سڑک پر مرد، عورتیں، بچے سنگیت کے سروں کی طرح بکھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کون کہتا ہے محبت کرنے کے لئے پہلگام، نینی تال یا دارجلنگ جانا ضروری ہے۔ محبت کرنے والے تو کسی بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بھی اپنی جان پر کھیل کر محبت کر جاتے ہیں۔

مگر دانی کو عورتوں سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے جس رات اس نے ثریا کو غنڈوں کے ہاتھوں بچایا، اس کے دل میں ثریا سے یا کسی عورت سے بھی محبت کرنے کا کوئی خیال تک پیدا نہ ہوا تھا۔ پیچھے مڑ کر دور دور تک جب وہ نظر ڈالتا تو اسے اپنی زندگی میں کوئی عورت دکھائی نہ دیتی۔ بہت دور بچپن میں اسے ایک زرد رو مایوس چہرہ دکھائی دیا تھا۔ جس نے اسے ایک جھونپڑے سے باہر نکال کر اس کے چچا کے حوالے کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ اس کے دل میں اپنی ماں کی کوئی یاد نہ تھی۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خوفناک چچی کی صورت تھی، جو متواتر چار

برس تک اسے پیٹتی رہی تھی۔ ذرا بڑا ہونے پر وہ فوراً ہی اپنی چچی کے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا تھا اور جب سے وہ آزاد تھا۔ مگر ہمیشہ وہ اپنی بھوک کے ہاتھوں عاجز رہا، اسے بہت بھوک لگتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کی ماں نے اسے اس کے چچا کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ وہ فاقوں سے اپنے بیٹے کا پیٹ نہیں بھر سکتی تھی اور آج دانی کہہ سکتا تھا کہ اس کی چچی بھی کوئی نامہربان عورت نہ تھی۔ ہرگز کوئی ظالم عورت نہ تھی۔ مگر اس کے اپنے پانچ بچے تھے اور دانی کی بھوک اتنی وسیع و عریض، جید اور مضبوط، بلند اور دیوزاد تھی کہ چچی نے اس کے بار بار کھانا مانگنے پر مجبور ہو کر اسے پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دانی کو نہیں پیٹتی تھی۔ وہ اس کی بھوک کو پیٹتی تھی اور آج بھی کتنی ہی بیویاں اور شوہر، مائیں اور بیٹے اور بہوئیں اور نندیں اور بھاوجیں اور چچیرے بھائی اور خلیرے بھائی اور دوست اور یار اور دل کے پیارے اور جگر کے ٹکڑے ہیں جو اس بھوک کی خاطر ایک دوسرے کو پیٹتے ہیں، دھوکہ دیتے ہیں، بے وفائی کرتے ہیں، جان لیتے ہیں، پھانسی چڑھ جاتے ہیں مگر کوئی اس ظالم دیوزاد خوفناک بھوک کو پھانسی نہیں دیتا۔ جس کے منحوس وجود سے اس دنیا میں کوئی انسانی رشتہ اور کوئی تہذیب قائم نہیں ہے۔

دانی یہاں تک تو نہ سوچ سکتا تھا۔ وہ جب بھی سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک بہت بڑی خوفناک بھوک کا خیال آتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی ماں نے تنگ آ کے اسے اس کے چچا کے حوالے کر دیا۔ جس کی وجہ سے اس کی چچی اسے دن رات چار سال تک مارتی پیٹتی رہی اور جس کی وجہ سے وہ آگے جا کر اپنی زندگی میں بار بار مختلف ہاتھوں سے پٹا اور مختلف گھروں سے نکالا گیا۔ اس لئے اس کے ذہن میں عورت کی محبت، باپ کی شفقت، دوست کی رفاقت، کسی کا کوئی احساس نہ تھا۔ ایک مسلسل تشنہ، ترسی ہوئی ناآسودہ بھوک کا احساس تھا جو بچپن سے جوانی تک اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ چونکہ اس کا بدن دوسروں سے دگنا لمبا اور بڑا تھا۔ اس لئے وہ دوسروں کے مقابلے میں دگنی خوراک کا طالب تھا۔ دانی کو زندگی بھر ایک ہی ارمان رہا۔ کوئی اسے پیٹ بھر کر کھانا دے دے اور پھر چاہے اس سے چوبیس گھنٹے مشقت کرائے مگر دانی کا یہ خواب چارک روڈ کے ایرانی ریستوران ہی میں آ کے پورا ہوا۔

ایرانی ریستوران کا مالک اس سے چار آدمیوں کے برابر مشقت کراتا تھا۔ مگر پیٹ بھر کے کھانا دیتا تھا اور بیس روپے تنخواہ دیتا تھا جس سے ٹھرا پیتا تھا اور پیٹ بھر کے کھانا کھا کے اور ٹھرا پی کر وہ فٹ پاتھ پر سو جاتا تھا اور اسے دولت اور سیاست اور شہرت اور عورت وغیرہ کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ اب وہ دنیا کا خوش قسمت ترین زندہ انسان تھا۔

جس رات ثریا کو اس نے غنڈوں کے ہاتھوں سے بچایا تو اس روز بھی اس کے دوست علی اکبر نے اسے بہت منع کیا تھا۔ تین چار غنڈے مل کر ثریا کو ایک ٹیکسی میں بھگانے کی کوشش کر رہے تھے جو چرچ کے آہنی جنگلے سے باہر فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی تھی۔ چوک کا سپاہی ایسے موقع پر کہیں گشت لگانے چلا گیا تھا جیسا کہ ایسے موقع پر اکثر ہوتا ہے۔ ثریا خوف اور دہشت سے چلا رہی تھی اور مدد کے لئے پکار رہی تھی اور علی اکبر نے دانی کو بہت سمجھایا تھا۔ یہ بمبئی ہے۔ ایسے موقعوں پر یہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ ایسے موقع پر سب لوگ کان لپیٹ کر سو جاتے ہیں۔ حماقت مت کرو۔ مگر دانی اپنے کانوں میں انگلیاں دینے کے باوجود ثریا کی چیخوں کی تاب نہ لا سکا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیکسی کی جانب بھاگا۔ غنڈوں کے قریب جا کے اس نے ان سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ اس نے سر نیچا کر کے ایک غنڈے کے سر میں ٹکر ماری پھر دوسرے کے، پھر پلٹ کے تیسرے کے۔ اگلے چند لمحوں میں تینوں غنڈے فرش پر پڑے تھے اور ان کے سر پھٹ گئے تھے۔ پھر پلٹ کر دانی نے چوتھے غنڈے کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے ثریا کو فٹ پاتھ پر چھوڑ کر ٹیکسی کے اندر کود گیا اور ٹیکسی والا گاڑی اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا۔ دانی مینڈھے کی طرح سر نیچا کر کے ٹیکسی کے پیچھے بھاگا۔ مگر موٹر کا پہیہ بہت تیز رفتار ہوتا ہے۔ اس لئے دانی مایوس ہو کر پلٹ آیا اور واپس آ کر ثریا سے پوچھنے لگا۔

''یہ لوگ کون تھے؟''

''ایک تو میرا بھائی تھا۔'' ثریا نے سسکتے سسکتے کہا۔

''تمہارا بھائی تھا؟'' دانی نے پوچھا۔

''ہاں!'' ثریا نے سر ہلا کر کہا۔ ''وہ مجھے ان غنڈوں کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا۔''

''کتنے روپوں میں؟''

''تین سو روپوں میں۔'' ثریا نے جواب دیا۔

''پھر؟''

''پھر میں نہیں مانی۔''

''تم کیوں نہیں مانی؟''

''میں چھ سو مانگتی تھی۔''

''تم چھ سو مانگتی تھیں؟'' دانی نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

''میرا بھائی تین سو روپے لے جاتا تو مجھے کیا ملتا، میں جو بک رہی تھی تو مجھے بھی کچھ ملنا چاہئے تھا۔'' ثریا نے دانی کو سمجھایا۔

دانی خفا ہو کے بولا: ''واہ! جو چیز بیچی جاتی ہے، اسے کیا ملتا ہے؟'' ایسا دستور تو ہم نے زندگی میں کہیں نہیں دیکھا نہ سنا۔ ہماری دُکان سے جو گاہک چار آنے کا کھارا بسکٹ خریدتا ہے۔ اسے چار آنے کے عوض کھارا بسکٹ ملتا ہے۔ دُکاندار کو چار آنہ ملتا ہے۔ مگر کھارا بسکٹ کو کیا ملتا ہے؟ ایں؟''

''میں کھارا بسکٹ نہیں ہوں۔'' ثریا غصے سے بولی۔

دانی نے سر سے پاؤں تک ثریا کو دیکھا، تیز اور تیکھی اور نکیلی اور سانولی۔ بولا:

''مگر بالکل کھارا بسکٹ کی طرح لگتی ہو۔''

ثریا مسکرائی، کچھ شرمائی۔ اگر وہ ساڑھی پہنے ہوتی تو ضرور اس وقت اس کا پلو اپنے سینے پر لے لیتی کہ ایسے موقعوں پر عورتوں کی یہ ایک پیٹنٹ ادا ہوتی ہے۔ مگر اس بیچاری نے تو سیاہ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس لئے اس نے صرف گردن جھکانے پر اکتفا کیا۔

دانی پلٹ کر فٹ پاتھ پر اپنی جگہ پر آ گیا اور بولا: ''اچھا اب جاؤ، کہیں دفع ہو جاؤ۔''

ثریا اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولی: ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

ایرانی ریستوران تو بند ہو چکا تھا۔ اس لئے دانی اس کے لئے ڈورا گلی کے ایک

چائے خانے سے، چائے اور آملیٹ ادھار لایا اور جس طرح سے ثریا نے اسے کھایا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بھوک میں بھی دانی کا اسٹائل جھلکتا ہے۔ دو لقموں میں وہ چار سلائس کھا گئی۔ ایک لقمے میں آملیٹ۔ پھر اس نے ایک ہی گھونٹ میں ساری چائے اپنے حلق سے نیچے اتار دی۔ دانی اس کی اس حرکت پر بے حد خوش ہوا۔ یکا یک اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے اسے ایک جگری دوست مل گیا۔ بولا:

''تمہیں بہت بھوک لگتی ہے؟''

''بہت!''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' دانی نے اب پہلی بار اس سے نام پوچھا۔

''ثریا یعنی سوسنا!'' ثریا جھجکتے جھجکتے بولی۔

''میں دانی ہوں۔'' دانی اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''یعنی ڈینیل!''

پھر وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور یکا یک پہلی بار انہیں آسمان بہت صاف دکھائی دیا اور دور سمندر سے نغمے کی صدا آنے لگی اور میٹھی گداز رات گل مہر کے پھول پہنے ان کے ترسے ہوئے جسموں کے قریب سے گزرتی گئی۔

روز رات کو فٹ پاتھ پر دانی اور ثریا کا جھگڑا ہوتا تھا کیونکہ دانی نے ثریا کو ایرانی ریستوران کے کچن میں نوکر کرا دیا تھا۔ پہلے تو اس نے کئی دن تک ثریا کو فٹ پاتھ سے بھگانے کی کوشش کی۔ وہ مینڈھے کی طرح سر جھکا کر جب ثریا کی جانب رخ کرتا تو ثریا وہاں سے بھاگ جاتی اور دانی کے سو جانے کے بعد واپس اسی فٹ پاتھ پر چلی آتی اور ہولے ہولے اس کے پاؤں دابنے لگتی اور جب صبح سویرے دانی اٹھتا تو اسے اپنا بدن بہت ہلکا اور عمدہ اور مضبوط معلوم ہوتا اور وہ دیکھتا کہ کسی نے اس کی بنیان دھو دی ہے اور قمیض اور پتلون بھی۔ تو پہلی بار اسے زندگی میں ایسا معلوم ہوا، جیسے وہ اپنے گھر میں آ گیا ہو۔ پہلی بار اس نے ثریا کی انگلیوں کو عجیب انوکھے انداز میں دیکھا۔ وہ دیر تک اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر راتوں کو اسے فٹ پاتھ پر اپنا بستر اور تکیہ لگا ہوا ملنے لگا اور وہ جگہ بھی صاف ستھری اور مسلسل جھاڑ پونچھ سے

چمکتی ہوئی محسوس ہونے لگی جہاں وہ ہر روز سوتا تھا اور وہ ثریا کے وجود کا عادی ہوتا گیا مگر اب بھی ہر روز کھانے کے وقت رات کو فٹ پاتھ پر دونوں کی لڑائی ہوتی تھی کیونکہ ثریا بھی بہت کھاتی تھی اور دانی بھی۔ دونوں رات کا کھانا ریستوران سے لے آتے تھے اور مل کر کھاتے تھے اور دونوں کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کون کس سے زیادہ کھاتا ہے۔ اکثر اوقات دانی کامیاب رہتا تھا لیکن جس دن ثریا زیادہ کھانے میں کامیاب ہو جاتی تھی اس دن وہ دانی کے ہاتھوں ضرور پٹتی تھی۔

ایک دن ثریا نے دانی سے کہا۔

''اب تم مجھے مت پیٹا کرو۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ اب میرے بچہ ہونے والا ہے۔'' ثریا نے اسے سمجھایا۔

دانی نے یکا یک کھاتے کھاتے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ حیرت سے ثریا کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''بچہ!''

''ہاں!'' ثریا خوش ہو کر بولی۔

''وہ بھی کھائے گا؟'' دانی کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ خفیف سی مایوسی بھی تھی۔

''ہاں وہ بھی کھائے گا۔'' ثریا نے اسے سمجھایا۔ ''پہلے تو میں ایک تھی، اب دو ہوں۔ ایک میں، ایک میرا بچہ، تمہارا بچہ، پیٹ میں۔ اب ہم دو ہیں۔ ہم دونوں کو زیادہ روٹی ملنی چاہئے۔''

دانی نے اپنے سامنے فرش پر پڑے ہوئے کاغذات کے ٹکڑے پر کھانے کو دیکھا پھر اس نے ثریا کو دیکھا پھر اس نے اپنا منہ بڑی سختی سے بند کیا اور دونوں جبڑوں کو ہلا کر اس طرح جنبش کی، جیسے وہ مایوسی کا ایک بہت بڑا لقمہ نگلنے جا رہا ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے کاغذ کا

ٹکڑا ثریا کی جانب بڑھا کر کہا۔

''لو کھاؤ۔''

''نہیں، تم بھی کھاؤ، تم نے کچھ کھایا ہی نہیں۔'' ثریا نے کہا۔

''نہیں، پہلے تم کھا لو، بعد میں جو بچے گا وہ میں کھا لوں گا۔'' دانی نے ایک عجیب ملامت سے کہا۔

پہلے دن تو ثریا سب چٹ کر گئی۔ اس زور کی بھوک لگی تھی اسے۔ دوسرے دن اس نے کچھ تھوڑا سا چھوڑ ا دانی کے لئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ دانی کے لئے زیادہ کھانا چھوڑنے لگی۔ پھر بھی جو باقی بچتا تھا وہ دانی کے لئے اس قدر کم ہوتا تھا کہ اس کی آدھی بھوک تشنہ ہو کر رہ جاتی تھی لیکن اب اس نے خالی پیٹ یا آدھے پیٹ رات کو بھوکے سو جانا سیکھ لیا تھا۔ پرانی عادت کو واپس بلانا اس قدر مشکل نہیں ہوتا۔ جس قدر نئی عادت کو پالنا۔ ہولے ہولے اس نے شراب پینا چھوڑ دیا کیونکہ بچے کو خوراک چاہئے اور کپڑے بھی اور ثریا نے ابھی سے اپنے بچے کے لئے کپڑے سینے شروع کر دیئے تھے۔ چھوٹے سے منے سے گڈے کے کپڑے۔ رنگ دار اور ملائم اور ریشمی جن پر ہاتھ پھیرنے سے دانی کے جسم اور روح میں مسرت اور شادمانی کی پھریریاں سی گھومنے لگتی تھیں۔

''ہمیں زیادہ سے زیادہ بچانا چاہئے۔'' کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد دانی اس نتیجہ پر پہنچا۔

رات کے بارہ بجے تھے اور اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر ایک دوسرے کے قریب لیٹے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

''مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں کوئی دن ایسا یاد نہیں آتا، جس دن میں بھوکا نہیں رہا۔'' دانی بولا۔

''میں کوئی رات ایسی یاد نہیں کر سکتی، جب میں کھانے چرانے کے الزام میں نہ پٹی ہوں۔'' ثریا بولی۔

''مگر ہمارا بچہ بھوکا نہیں رہے گا۔'' دانی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اس کے پاس سب کچھ ہوگا۔'' ثریا نے پُر امید لہجے میں کہا۔

''پیٹ بھرنے کے لئے روٹی، تن ڈھکنے کے لئے کپڑا۔'' دانی خواب ناک لہجے میں بولا۔

''اور رہنے کے لئے گھر!'' ثریا بولی۔

''گھر!'' دانی نے چونک کر پوچھا۔

''کیا اپنے بچے کو گھر نہ دو گے؟'' ثریا نے شکایت کے لہجے میں پوچھا:

''کیا وہ اسی فٹ پاتھ پر رہے گا؟''

''مگر گھر کیسے مل سکتا ہے؟'' دانی نے پوچھا۔

''میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔'' ثریا نے سمجھایا۔ ''چرچ کے پیچھے نورا مینشن بن رہی ہے۔ اس میں پانچ کمرے والے فلیٹ ہوں گے اور چار کمرے والے اور تین کمرے والے اور دو کمرے والے اور دس فلیٹ ایک کمرے والے بھی ہوں گے جن کا کرایہ سترہ روپے ہوگا اور پگڑی سات سو روپے۔''

''مگر سات سو روپے ہم کہاں سے دیں گے؟'' دانی نے پوچھا۔

''اب تم کو سیٹھ تیس روپے دیتا ہے، مجھ کو پچیس روپے دیتا ہے۔ اگر ہم ہر مہینہ پچاس روپے نورا مینشن کے مالک کو دیں تو چودہ مہینے میں ایک کمرہ کا فلیٹ ہم کو مل سکتا ہے۔''

بہت دیر تک دانی سوچتا رہا۔ ثریا کا ہاتھ دانی کے ہاتھ میں تھا۔ یکا یک دانی کو ایسا محسوس ہوا، جیسے ایک ہاتھ میں ایک ننھے بچے کا ہاتھ بھی آ گیا ہے۔ اس کا دل عجیب طریقے سے پگھلنے لگا۔ گھلنے لگا، اس کی آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے اور اس نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں ثریا کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیں اور رندھے ہوئے گلے سے بولا:

''ہاں میرے بچے کا گھر ہوگا، ضرور ہوگا۔ میں سوچتا ہوں ثریا۔ میں تین گھنٹے کے لئے ڈورا گلی کے چائے خانے میں رات کے گیارہ بجے سے دو بجے تک کام کر لوں۔ جب تو اپنا

ریستوران بھی بند ہو جاتا ہے، گیارہ بجے۔ پھر گیارہ بجے سے دو بجے تک چائے خانے میں کام کرنے میں کیا ہرج ہے۔ چائے خانے کا سیٹھ دس روپے پگار دینے کو بولتا تھا۔ مگر میرے خیال میں وہ بارہ پندرہ روپے تک دے دے گا۔''

''جب تو ہم جلدی گھر لے سکیں گے۔'' ثریا نے خوش ہو کر کہا۔

''اور اگر ایرانی سیٹھ ادھار روپے دے تو شاید اپنے گھر پر ہی بچہ پیدا ہوگا۔'' دانی کا چہرہ خوش آئندہ امید کی روشنی سے چمکنے لگا۔ یکا یک اس نے ثریا کا ہاتھ زور سے دبا کر کہا۔''آؤ دعا کریں۔''

وہ دونوں اٹھ کر گرجا کے آہنی جنگلے کو پکڑ کو دوزانو ہو گئے۔ جالی دار آہنی سلاخوں کے درمیان گرجا کے وسیع صحن کے وسط میں یسوع مسیح کا بت صلیب پر آویزاں تھا اور ایک طرف نیلے پتھروں کے گراٹو میں مریم نے مقدس بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا اور گراٹو میں مومی شمعیں روشن تھیں اور گل مہر کی نازک پتیاں ہوا کے جھونکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چاروں طرف گر رہی تھیں اور مقدس مریم کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا، جیسا بچہ ہر ماں کے تصور میں ہوتا ہے اور یہ رات مریم کے لبادے کی طرح مہربان تھی اور کسی نیند میں ڈوبے ہوئے یسوع کے خواب کی طرح معصوم......

دُعا پڑھ کر دانی نے ثریا سے پوچھا۔

''یہ پادری آج بار بار اپنے وعظ میں آزادی، روٹی اور کلچر کی بات کر رہا تھا۔ آزادی اور روٹی تو خیر سمجھ میں آتی ہیں، مگر یہ کلچر کیا ہوتا ہے؟''

''میرے خیال میں کوئی میٹھا کیک ہوگا۔'' ثریا سوچ سوچ کر بولی۔

اور وہ دنیا میں امن کی بات بھی کرتا تھا...... دانی بولا: ''مگر ہمیشہ تو میرے پیٹ میں ایسی جنگ ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ پیٹ کی جنگ کیسے بند ہوگی۔ او خدا کیسی بھیانک جنگ ہوتی ہے میرے پیٹ میں......''

''میں جانتی ہوں، میری ماں بھی جانتی تھی۔ میری بہنیں بھی، میرے بھائی بھی اور

ہم سب کا باپ بھی۔'' ثریا تاسف انگیز لہجے میں بولی:

''اور میرے باپ کا باپ بھی...... بے چارہ بڈھا...... کوئی رشتہ ہم سے اس قدر قریب نہیں رہا، جس قدر بھوک کا۔''

''خدا کرے ہمارا بیٹا بھوکا نہ رہے۔''

پیٹ میں امن، اور دنیا میں امن، جیسا کہ وہ پادری کہتا تھا...... آمین!

ایک دن ثریا جس غیر متوقع طریقے سے آئی تھی، اسی طرح وہاں سے چلی گئی۔ خبر سنتے ہی دانی بھاگا بھاگا رات کے ڈیڑھ بجے ڈوراگلی کے چائے خانے سے فٹ پاتھ پر آیا تو اس نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک اژدھام ہے اور پولیس کے بہت سے سپاہی سڑک پر اور فٹ پاتھ کے آس پاس کھڑے ہیں اور ایک ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھا ہوا ہے اور اس کا انجن گرجا کے آہنی جنگلے کو موڑتا ہوا گل مہر کے پیٹ سے ٹکرا گیا۔ پچھلے پہیوں پر ثریا اور علی اکبر کی لاشیں رکھی ہیں کیونکہ یہی دو لوگ فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے ٹرک کی زد میں آ گئے تھے۔ اگر دانی بھی سویا ہوتا تو اس وقت اس کی لاش بھی یہیں پڑی ہوتی۔ کبھی کبھی رات کی تاریکی میں تیزی سے گزرتے ہوئے یا ایک دوسرے سے ریس کرتے ہوئے ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے ہیں۔ بڑے شہروں میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے۔

دانی ایک احمق کی طرح خون میں لت پت ثریا کی لاش پر جھکا رہا پھر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھنے لگا اور کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا:

مگر ابھی تو وہ زندہ تھی۔

دو گھنٹے پہلے اس نے اور میں نے اپنی جگہ پر کھانا کھایا تھا۔

وہ بالکل زندہ اور تندرست تھی۔

اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

اس کے پیٹ میں میرا بچہ تھا۔

چھ مہینے کا بچہ۔

میرا بچہ......

''کس نے مارا انہیں؟'' یکایک دانی دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کستے ہوئے زور سے چیخا۔

ایک تماشائی نے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ فوراً پولیس کے دو سنتریوں نے دانی کو پکڑا۔ مگر دانی نے گھونسے مار کر دونوں سنتریوں سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اس عرصہ میں دونوں سنتری اس سے کشمکش کرتے ہوئے اسے ٹرک سے دور گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ دانی ان سے آزاد ہو کر ٹرک کی جانب لپکا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ بدن جھک گیا، اور پھر ایک مینڈھے کی طرح تن گیا۔ اس کے ہونٹوں سے جانور نما ایک بھنچی ہوئی سی غراہٹ نکلی۔ وہ اپنے سر کو ایک خوفناک طریقے سے آگے بڑھائے اور جھکائے تیزی سے ٹرک پر حملہ آور ہو گیا......

پورے چھ ماہ وہ ہسپتال میں رہا کیوں کہ اس کا سر کھل گیا تھا۔ وہ بچ تو گیا تھا مگر اس کے دماغ کا حصہ تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا اور اب اس کا سر پینڈولم کی طرح ہولے ہولے آپ ہی ہلتا تھا اور اس کا وحشی مینڈھے کی طرح پلا ہوا مضبوط جسم سوکھے ہوئے بانس کی طرح دبلا ہو گیا تھا اور اسے سب کچھ یاد تھا اور بہت کچھ یاد بھی نہیں تھا اور اب وہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگر گاہک اس سے چائے مانگتا تو وہ اس کے سامنے پانی لا کر رکھ دیتا اور اگر کوئی آملیٹ مانگتا تو وہ اس کے سامنے ماچس کی ڈبیا رکھ دیتا۔ اس لئے ایرانی ریستوران کے مالک نے مجبور ہو کر اسے ملازمت سے الگ کر دیا تھا مگر وہ ابھی تک فٹ پاتھ پر اسی جگہ سوتا تھا جہاں ثریا سوتی تھی اور اس نے اپنے بچے کے کپڑے گرجا کے آہنی جنگلے کے کونے میں چھپا کر رکھ دیئے تھے اور رات کے سناٹے میں وہ اکثر انہیں نکال کر بجلی کے کھمبے کے نیچے بیٹھ کر تکا کرتا تھا اور فٹ پاتھ پر حجامت کرنے والا رامونائی اکثر اس سے پوچھتا۔

''یہ کس کے کپڑے ہیں؟''

''میرے بچے کے ہیں۔''

''تیرا بچہ کہاں ہے؟'' تھا گولین کے چائے خانے کا قاسم اس سے پوچھتا۔

''وہ میری ثریا کے پاس ہے۔''

''تیری ثریا کہاں ہے؟''

''وہ میکے گئی ہے۔''

''وہاں سے کب لوٹے گی؟'' گوپی جیب کترا اس سے پوچھتا۔

''جب میرا گھر بن جائے گا۔'' دانی انتہائی معصومیت سے جواب دیتا۔

یہ جون سن کر مذاق کرنے والوں کے چہرے فق ہو جاتے اور وہ وہیں بیٹھے بیٹھے خلاؤں میں تکنے لگتے۔ جیسے دور سے کسی ٹرک کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ رہے ہوں اور ہل نہ سکتے ہوں۔ فٹ پاتھ پر رہنے والے اپنی مجبوری سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ فٹ پاتھ سے اپنا بستر تو تہ کر سکتے ہیں لیکن فٹ پاتھ کو تہ نہیں کر سکتے۔ ابھی تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے، اس لئے دانی کے گھر کا تخیل ایک بہت بڑا مذاق معلوم ہوا۔

دوسرے دن دانی بڑے انہماک سے اپنا گھر بنانے میں مصروف نظر آیا۔ کہیں سے دو تین اینٹیں اٹھا لایا تھا اور اب وہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھ کر اس پر تیسری اینٹ لگانے میں مصروف تھا کہ قاسم نے اس سے پوچھا۔

''دانی! یہ کتنا بڑا گھر ہوگا؟''

دانی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''یہ ایک بہت بڑا گھر ہوگا۔'' وہ بولا: ''اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اسے چار کر روڈ کے عین بیچ میں تعمیر کروں گا۔ اس کے دس مالے ہوں گے، ہر مالے میں بتیس فلیٹ ہوں گے۔ ہر فلیٹ میں تین کمرے ہوں گے۔''

''تین کمرے کس کے لئے؟'' گوپی جیب کترے نے پوچھا۔

''ایک میاں کے لئے، ایک بیوی کے لئے، ایک بچے کے لئے۔''

''مجھے بھی اس گھر میں جگہ دو گے؟'' راموحجام نے پوچھا۔ ''میری بیوی، میرے دو بچے ہیں اور وہ تینوں میرے گاؤں میں ہیں، کیوں کہ یہاں میرے پاس کوئی گھر نہیں ہے اور

میری ماں بوڑھی ہے۔''

گوپی بولا: ''اور میرے پاس کوئی کام نہیں، سوائے جیب کاٹنے کے اور میں تین دفعہ جیل کاٹ چکا ہوں اور مجھے تم اپنے گھر کا چوکیدار رکھ لینا اور رہنے کے لئے صرف ایک کمرہ دے دینا۔''

''یہ ایک بہت بڑا گھر ہوگا۔'' دانی انتہائی خلوص سے بولا اور شدت جذبات سے اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں باہر نکل پڑتی تھیں۔ ''اور اس میں تم سب کے لئے جگہ ہوگی، قاسم کے لئے اور رامو کے لئے اور گوپی کے لئے اور دھیرج کے لئے اور واسنت کے لئے، اور پائل کے لئے اور رنگا چاری کے لئے اور تھا گولین اور ڈورا گلی کے فٹ پاتھ پر سونے والوں کے لئے بھی جگہ ہوگی۔ میرا خیال ہے، میں اسے بیس مالے کا بناؤں گا۔ ہر مالے میں تیس فلیٹ ہوں گے، ہر فلیٹ میں چار کمرے ہوں گے، ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم ہوگا...... فلش اور شاور۔''

''موزیک کا فرش۔'' قاسم بولا۔

''اور کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہوئیں۔'' گوپی نے لقمہ دیا۔

یکا یک ایک لمحہ کے لئے ان سب نے باور کر لیا۔ یقین کر لیا، ایک لمحہ کے لئے انہوں نے چارک روڈ کے چوک پر اس بڑے گھر کو تعمیر ہوتے ہوئے، بلند ہوتے ہوئے، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ دوسرے لمحے میں ایک بہت بڑا ٹرک گھوں گھوں کرتا ہوا ان کے قریب سے گزر گیا اور وہ سہم کر چپ ہو گئے۔

اس کے بعد کئی ماہ تک دانی وہ گھر بناتا رہا۔ اینٹیں تو اس کے پاس وہی تین تھیں۔ مگر گھر کا نقشہ ہر روز بدلتا تھا۔ وہ اب پچاس منزل کا ایک محل تھا، جس میں صرف فٹ پاتھ پر رہنے والے داخل ہو سکتے تھے۔ اس محل میں زندگی کی ہر سہولت اور آسائش مہیا تھی۔ بجلی کی لفٹ اور ٹیلیفون۔ ایک چھوٹا سا سینما اور نرسری اسکول اور چھت پر خوبصورت پھول والا گارڈن۔ دیوار گیر روشنیاں، اور مدھم مدھم رنگوں والے غالیچے اور خوبصورت تتلیوں کی طرح آہستہ خرام عورتیں اور بچے اور دھیمے دھیمے بجتے ہوئے ارغنوں اور مہذب مرد مسکراتے ہوئے

سگریٹ پیتے ہوئے، ایک دوسرے سے جام ٹکراتے ہوئے اور ان کے کپڑے بھی عمدہ اور خوشبودار اور جیبیں سکوں سے بھری ہوئی اور وہ سب کچھ جو غریب لوگ سینما میں دیکھتے ہیں اور امیر اپنے گھر پر رکھتے ہیں۔ وہ سب کچھ اس گھر میں موجود تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند، خوبصورت، درخشاں، عالیشان۔ وہ گھر اتنا ہی خوبصورت تھا جتنا کسی بے گھر کا تخیل ہوسکتا ہے۔

اور پھر جب کئی ماہ کی کاوش کے بعد وہ گھر مکمل ہو گیا تو رات کے گیارہ بجے سے ایک بجے تک دانی ٹین کا ایک ڈبہ پیٹتے ہوئے چارک روڈ کے دونوں فٹ پاتھ اور گھوگا لین کے فٹ پاتھ اور ڈورا گلی بلکہ کراس بازار اور چارک پارک کے فٹ پاتھیوں کو اس نئے گھر میں آنے کی دعوت دیتا پھرا۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس وہی تین اینٹیں تھیں مگر اب اس نے تین اینٹوں کو چارک چوک کے ٹریفک آئی لینڈ کے اندر رکھ دیا تھا اور اس طرح اپنا محل تعمیر کرلیا تھا اور اب وہ سارے فٹ پاتھیوں کو اپنے بیوی بچوں سمیت گھر میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

ڈورا گلی کے پائل نے روک کر کہا۔ ''لیکن میرے تو سات بچے ہیں اور ہم سب کے سب اس کھلے فٹ پاتھ پر بڑے آرام سے سوتے ہیں۔ تمہارے تین کمروں والے فلیٹ سے ہمارا کیا ہوگا؟''

''میں تمہیں سات کمروں والا فلیٹ دوں گا۔'' دانی نے ٹین پیٹتے ہوئے چلا کر کہا۔

''کب آئیں ہم لوگ۔'' پائل کی بیوی نے اپنی مسکراہٹ کو ساڑھی کے پلو میں چھپا کر اس سے پوچھا۔ اس کی ہنسی رکی نہیں پڑتی تھی۔

''کل صبح جب ثریا بچے کو لے کر میکے سے آجائے گی۔ میں اپنے گھر کے دروازے سب لوگوں کے لئے کھول دوں گا۔ دروازے پر بینڈ ہوگا۔ رنگا رنگ جھنڈیاں ہوں گی اور بندھن داریں اور میں پادری کو گھر کے مہورت کے لئے بلاؤں گا اور وہ بائبل سنائے گا اور گرجا کے گھنٹے بجیں گے اور اس وقت تم سب لوگ میرے گھر میں داخل ہوں گے۔''

دانی کی کانپتی ہوئی آواز میں انتہائی خلوص تھا۔ اس کا دبلا چہرہ زرد اور بخار زدہ

دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور بے چین تھیں اور متواتر چلانے سے اس کے ہونٹوں پر کف آ چلا تھا اور اس کے روکھے سوکھے بالوں کی لٹوں میں فٹ پاتھ کی خاک چمک رہی تھی۔

دوسرے دن دانی بلو گراٹو کے باہر مقدس مریم کے قدموں میں مردہ پایا گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور نیلے آسمان میں کسی نامکمل سپنے کو تک رہی تھیں۔ اس کے کپڑے پھٹے چیتھڑے اور تار تار تھے اور اس کے سینے پر وہی تین اینٹیں رکھی تھیں اور اس نے مقدس مریم کے قدموں کے فرش پر اپنا سر مار مار کر توڑ دیا تھا۔

گرجا کھول دو۔

اور گھنٹے بجاؤ۔

دیکھو یسوع مسیح جا رہا ہے۔

اپنے سینے پر اینٹوں کی صلیب لئے ہوئے۔

اب جنت کے دروازے غریبوں کے لئے کھل گئے ہیں۔

کیونکہ ایک اونٹ سوئی کے ناکے سے نہیں گزر سکتا۔ لیکن ایک امیر قانون کے ہر ناکے سے گزر سکتا ہے۔

اور اب اس دھرتی کے مالک غریب ہوں گے۔

اور غریبوں کے مالک امیر ہوں گے۔

دیکھو وہ یسوع مسیح جا رہا ہے۔

آؤ اسے سنگسار کریں۔

بھگت رام

ابھی ابھی میرے بچے نے میرے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو اپنے دانتوں تلے داب کر اس زور سے کاٹا کہ میں چلائے بغیر نہ رہ سکا اور غصے میں آ کر اس کے دو تین طمانچے بھی جڑ دیئے ہیں، بیچارہ اسی وقت سے ایک معصوم پلے کی طرح چلا رہا تھا، یہ بچے کم بخت دیکھنے سے کتنے نازک ہوتے ہیں، لیکن ان کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے، ان کے دانت یوں تو دودھ کے ہوتے ہیں، لیکن کاٹنے میں گلہریوں کو بھی مات کرتے ہیں، اس بچے کی معصوم شرارت سے معاً میرے دل میں بچپن کا ایک واقعہ ابھر آیا ہے، اب تک میں اسے بہت معمولی واقعہ سمجھتا تھا اور اپنی دانست میں اسے قطعاً بھلا چکا تھا، لیکن دیکھئے یہ لاشعور کا بھی کس قدر عجیب ہے، اس کے سہارے میں بھی کیسے کیسے عجائب مستور ہیں، بظاہر اتنی سی بات ہے کہ بچپن میں نے ایک دفعہ اپنے گاؤں کے ایک آدمی بھگت رام کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چبا ڈالا تھا، اور اس نے مجھے طمانچے مارنے کے بجائے سیب اور آلوچے کھلائے تھے اور بظاہر میں اس واقعہ کو اب تک نہیں بھول چکا ہوں، لیکن ذرا اس بھان متی کے بارے پٹارے کی بوالعجبیاں ملاحظہ فرمایئے، یہ معمولی سا واقعہ ایک خوابیدہ ناگن کی طرح ذہن کے پشتارے میں دبا ہے اور جونہی میرا بچہ میری چھنگلیا کو دانتوں تلے دباتا ہے اور میں اسے پیٹتا ہوں، یہ پچیس تیس سال کا سویا ہوا ناگ بیدار ہو جاتا ہے، اور پھن پھیلا کر میرے ذہن کی چار دیواری میں لہرانے لگا، اب کوئی

اسے کس طرح مار بھگائے، اب تو اسے دودھ پلانا ہوگا، خیر تو وہ واقعہ بھی سن لیجئے، جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے جب ہم لوگ رنگپور کے گاؤں میں رہتے تھے، رنگپور کا گاؤں تحصیل جوڑی کا صدر مقام ہے اس لئے اس کی حیثیت اب ایک چھوٹے موٹے قصبے کی ہے، لیکن جن دنوں ہم وہاں رہتے تھے، رنگپور کی آبادی بہت زیادہ نہ تھی، یہی کوئی ڈھائی تین سو گھر ہوں گے، جن میں بیشتر گھر برہمنوں اور کھتریوں کے تھے، دس بارہ گھر جلاہوں اور کمہاروں کے ہوں گے پانچ چھ بڑھئی اتنے ہی چمار اور دھوبی اور یہی سارے گاؤں میں لے دے کے آٹھ دس گھر مسلمانوں کے ہوں گے لیکن ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اس لئے یہاں تو ان کا ذکر کرنا بھی بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔ گاؤں کی برادری کے مکھیا لالہ کانشی رام تھے، یوں تو برہمنی سماج کے اصولوں کے مطابق برادری کا مکھیا کسی براہمن ہی کو ہونا چاہئے تھا اور پھر برہمنوں کی آبادی بھی گاؤں میں سب سے زیادہ تھی اس پر برادری نے لالہ کانشی رام کو جو ذات کے کھتری تھے، اپنا مکھیا چنا تھا، پھر وہ سب سے زیادہ لکھے پڑھے تھے، یعنی شہر تک پڑھے تھے، جو خط ڈاکیہ نہیں پڑھ سکتا تھا، اسے بھی وہ اچھی طرح پڑھ لیتے تھے، تمسک ہنڈی، نالش، سمن، گواہی، نشان دہی کے علاوہ نئے شہر کی بڑی عدالت کی ہر کارروائی سے وہ بخوبی واقف تھے، اس لئے گاؤں کا ہر فرد اپنی ہر مصیبت میں چاہے وہ خود لالہ کانشی رام ہی کی پیدا کردہ ہو، لالہ کانشی رام ہی کا سہارا ڈھونڈتے تھے، اور لالہ جی نے آج تک اپنے کسی مقروض کی مدد کرنے سے انکار نہ کیا، اسی لئے وہ گاؤں کے مکھیا تھے، گاؤں کے مالک تھے اور رنگ پور سے باہر بھی دور دور تک جہاں تک دھان کے کھیت دکھائی دیتے تھے، لوگ ان کے گن گاتے تھے۔ ایسے شریف لالہ کا منجھلا بھائی لالہ بانشی رام، جو اپنے بڑے بھائی کے ہر نیک کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا، لیکن گاؤں کے لوگ اسے اتنا اچھا نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ اس نے اپنے برہمن دہرم کو تیاگ دیا تھا، اور گورونانک جی کے چائے ہوئے پنتھ میں شامل ہوگیا تھا، اس نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا گوردوارہ بھی تعمیر کرایا تھا اور ان کے شہر سے ایک نیک صورت، نیک طینت، نیک سیرت، گرنتھی کو بلا کر اسے گاؤں میں سکھ کے پرچار کیلئے مامور کر دیا تھا — لالہ کانشی رام کے

سکہ بن جانے سے گاؤں میں جھٹکے اور حلال کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں اور سکھوں کے لئے تو گویا یہ ایک مذہبی سوال تھا، لیکن بھیڑ بکریوں اور مرغے مرغیوں کیلئے تو زندگی اور موت کا سوال تھا، لیکن انسانوں کے نقار خانے میں جانوروں کی کون سنتا ہے۔ لالہ بانشی رام کے چھوٹے بھائی کا نام تھا بھگت رام، یہ وہی شخص ہے جس کا انگوٹھا میں نے بچپن میں چبا ڈالا تھا، کس طرح یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا، ابھی تو اس کا کردار دیکھئے، یعنی کہ سخت لفنگا، آوارہ بدمعاش تھا یہ — شخص نام تھا بھگت رام لیکن دراصل یہ آدمی رام بھگت رام نہیں شیطان کا بھگت تھا، رنگ پور کے گاؤں میں آوارگی، بدمعاشی ہی نہیں، ڈھٹائی اور بے حیائی کا نام اگر زندہ تھا محض بھگت رام کے وجود سے ورنہ رنگپور تو ایسی شریف روحوں کا گاؤں تھا کہ غالباً فرشتوں کو بھی وہاں آتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہوگا، نیکی، پاکیزگی اور عبادت کا ہلکا سا نور گویا ہر ذی نفس کے چہرے سے چھنتا نظر آتا تھا، کبھی کوئی لڑائی نہ ہوتی تھی، فرقہ وقت پر وصول ہو جاتا تھا، ورنہ زمین قرق ہو جاتی تھی اور لالہ کانشی رام پھر روپیہ دے کر اپنے مقروض کو کام پر لگا دیتے تھے، مسلمان بچارے اتنے کمزور تھے اور تعداد میں اس قدر کم تھے کہ ان میں لڑنے کی ہمت نہ تھی، سب بیٹھے مسجدوں کے مناروں اور اسکے کنگروں کو خاموشی سے تکا کرتے کیونکہ گاؤں میں انہیں اذان دینے کی بھی ممانعت تھی، کیروں اور اچھوتوں کا سارا دھندا دوجہے لوگوں سے وابستہ تھا اور وہ چوں تک نہ کر سکتے تھے، اس کے علاوہ انہیں یہ احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ زندگی اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے بس جو ہے وہ ٹھیک ہے، یہی مسلمان سمجھتے تھے، یہی براہمن، یہی کھتری — یہی چمار اور سب مل کر بھگت رام کو گالیاں سناتے تھے کیونکہ اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ بھگت رام لٹھ گنوار تھا، بات کرنے میں اکھڑ، دیکھنے میں اکھڑ، کندنا تراش، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، بڑے بڑے دانت بتیسی ہر وقت کھلی لبوں سے رال ٹپکی ہوئی جب ہنستا تو بتیسی مسوڑھوں کی بھی پوری پوری نمائش ہوتی۔ گاؤں میں ہر شخص کا سر گھٹا ہوا تھا اور ہر ہندو کے سر پر چوٹی تھی، لیکن بھگت رام نے بلوچوں کی طرح لمبے لمبے بال بڑھا لئے تھے اور چوٹی غائب تھی، بالوں میں بڑی کثرت سے جوئیں ہوتیں، جنہیں وہ اکثر گھراٹ کے باہر بیٹھ کر چنا کرتا تھا،

سرسوں کا تیل سر میں دو تین بار رچایا جاتا، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے اور بیچ میں سے سیدھے مانگ نکال کر اور زلفیں سنوار کر وہ سرِ شام گاؤں کے چشموں کا طواف کیا کرتا، اپنی ان بُری حرکتوں سے کپ بار پٹ چکا تھا لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا، بڑی موٹی کھال تھی اس کی اور پھر اس میرا خیال ہے کہ اس کے شعور میں ضمیر کی آگ کبھی روشن نہ ہوئی تھی، وہ شرارہ بیدار تھا، جو حیوان کو انسان بنا دیتا ہے۔ بھگت رام سو فیصد حیوان تھا اور اسی لئے گاؤں والے برہمن اور کھتری، امیر اور غریب ہندو اور مسلمان اور سنار اور چمار سب اس سے نفرت کرتے تھے لیکن چونکہ لالہ کانشی رام کا چھوٹا بھائی تھا، اور بظاہر گاؤں کے سب سے بڑے گھر کا ایک معزز فرد، اس لئے اپنی ناپسندیدگی کے باوجود گاؤں کے لوگ اس کے وجود کو اور اس کے وجود کی بدحرکات کو برداشت کرتے تھے، اور آج کرتے چلے آئے تھے، لیکن جب رنگ پور میں آئے اس وقت بھگت رام کے بڑے بھائی نے پریشان ہو کر اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا، تو ی کا یاک گھراٹ اس کے سپرد کر دیا تھا، جہاں بھگت رام رہا کرتا تھا، اور وہ رات کو سوجاتا بھی وہیں تھا، کیونکہ گھراٹ تو دن رات چلتا تھا، نہ جانے کس وقت کسے آٹا پسانے کی ضرورت پیش ہو اور وہ چادر میں یا بھیڑ کی کھال میں مکئی یا گندم کے دانے گھراٹ پر چلا آئے اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ دن بھر میں جو گیہوں جمع ہوتا ہے یا اناج ابھی پسا نہیں جاتا وہیں گھراٹ پر دھرا رہتا ہے اور اس کی نگہبانی کیلئے بھی تو ایک آدمی کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے، یہی سوچ کر لالہ منشی رام کا گھراٹ گاؤں میں سے نامی گھراٹ تھا، یعنی تقریباً سارے گاؤں کا اناج وہیں پسوایا جاتا تھا، ایک اور گھراٹ بھی تھا، لیکن بالعموم مسلمانوں، اچھوتوں اور کمیروں کیلئے اناج جہاں پسایا جاتا تھا، جب کبھی بڑا گھراٹ چلتے چلتے رک جاتی اور اس کی مہیب چکی کام کرنے سے انکار کر دیتی یا جب پاٹوں کی سطح پر پتھریلے دندانے بنانے کیلئے انہیں الٹا دیا جاتا تو اس صورت میں دوسرے گھراٹ والوں کو چند روز کیلئے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی، بصورت دیگر بڑے گھراٹ پر گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی، جب بڑا گھراٹ چلتا تھا، اس وقت کسی مسلمان، کسی کمیرے، کسی اچھوت کی یہ جرات نہ تھی، جرات تو کیا کبھی ان کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا

کہ ان کا اناج کبھی بڑے گھراٹ پر پس سکتا ہے، شروع شروع میں جب بھگت رام نے کام سنبھالا تو اس نے چند روز تک یہی وطیرہ اختیار کیا، لیکن بعد میں اسے مزاج کے لا ابالی پن نے بلکہ یوں کہئے کہ شیطانی پن نے زور مارا اور اس نے سوچا جی کیا ہے اس میں جو آئے، آٹا پسا کر لے جائے، ان پتھروں کے دو پاٹوں میں دھرا ہی کیا ہے، اور یہ آخر اناج ہی تو ہے، جسے کتا بھی کھاتا ہے اس سے گھراٹ کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوگا، دوسرے گھراٹ بالکل ہی بند ہو جائے نہ جانے اس نے کیا سوچا، بہر حال اس نے کوئی ایسی ہی بات سوچی ہوگی جو اس نے گاؤں کے چماروں اور کمیروں کو بھی اپنے گھراٹ پر سے آٹا پسانے کی دعوت دی، پہلے تو لوگوں نے بڑی شدومد سے انکار کیا، بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے کیا کہتے ہو لالہ ہم رعیت ہیں تم راجہ ہو، یہ تمہارا گھراٹ ہے، ہمارا گھراٹ ہے، ہم بھلا یہاں آٹا پسانے کیوں آئیں گے نا بابا نہ یہ کام ہم سے نہ ہوگا، اور جو چاہے ہم سے کام لے لو یہ کام ہم سے نہ ہوگا، لیکن بھگت رام نے آخر اپنی چالاکیوں سے ان بیچاروں کو پھسلا ہی لیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اناج اسی کے گھراٹ پر لایا کریں گے وہیں پسایا کریں گے۔ بھلا ایسی بات بھی برادری میں چھپی رہ سکتی ہے، برادری میں اک کہرام مچ گیا، چہ می گوئیاں ہونے لگیں، ہر روز بھگت رام سے لڑائی ہونے لگی، تگڑا آدمی تھا، اس لئے گالیاں سہہ گیا، ہنس ہنس کر ٹالتا تھا، پھر اسے غصے میں آ کر دو چار کو پیٹ دیا، پھر ایک دن خود پٹ گیا، یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے لالہ کانشی رام کے پاس پہنچا، انہوں نے بھگت رام کو بلا کر ڈانٹا، سمجھایا ٹھنڈے دل نرمی سے پچکار کر باتیں کیں، اونچ نیچ سمجھائی لیکن جس دل میں کمینہ پن ہو وہ دھرم کرم کی بات کب سنے گا۔

ایرانی پلاؤ

آج رات اپنی تھی، کیونکہ جیب میں پیسے نہیں تھے، جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں رات مجھے اپنی نہیں معلوم ہوتی، اس وقت رات میرین ڈرائیو پر تھر کنے والی گاڑیوں کی معلوم ہوتی ہے، جگمگاتے ہوئے فلیٹوں کی معلوم ہوتی ہے، ایمبسڈر کی چھت پر ناچنے والوں کی معلوم ہوتی ہے، لیکن آج رات بالکل اپنی تھی، آج رات آسمان کے سارے ستارے اپنی تھے اور بمبئی کی ساری سڑکیں اپنی تھیں، جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو سارا شہر اپنے اوپر مسلط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، ہر شے گھورتی ہے، ڈانٹتی ہے، اپنے آپ سے دور بیٹھنے پر مجبور کرتی، اونی پتلون سے لے کر خوش نما ریڈیو پروگرام تک ہر چیز کہتی ہے، مجھ سے دور ہو، لیکن جب جیب میں ایک پائی نہ ہو تو سارا شہر اپنا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس کے ہر کھمبے پر گویا لکھا ہوتا تھا تعمیر کیا گیا برائے بشن ایک فاقہ مست صنف، اس دن نہ حوالات کا کارڈ ہوتا ہے نہ گاڑی کی لپیٹ میں آجانے کا، نہ ہوٹل میں کھانے کا، ایک ایسی وسیع بے فکری اور بے کنار فاقہ مستی کا نشہ آور موڈ ہوتا ہے، جو میلوں تک پھیلتا چلا جا رہا ہے، اس رات میں خود نہیں چلتا ہوں اس رات بمبئی کی سڑکیں مجھے اٹھائے اٹھائے چلتی ہیں اور گلیوں کے موڑ پر اور بازاروں کے ٹکڑ اور بڑی بڑی عمارتوں کے تاریک کونے مجھے خود دعوت دیتے ہیں ادھر آؤ، ہمیں بھی دیکھو ہم سے ملو، دوست تم آٹھ سال سے اس شہر میں رہتے ہوں، لیکن پھر بھی اجنبیوں کی طرح کیوں چل رہے

ہو، ادھر آؤ ہم سے ہاتھ ملاؤ یہاں بھی ایک امتحانی لمحے کی جھجک کے بعد وہ لوگ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، ایک لڑکے نے مجھ سے کہا، آؤ بھائی تم بھی یہاں بیٹھ جاؤ اور اگر گانا چاہتے ہو تو گاؤ۔ اتنا کہہ کر اس نے دبلے پتلے لڑکے نے اپنے سر کے بال جھٹک کے پیچھے کر لئے اور اپنا لکڑی کے بکس کا طبلہ بجانے لگا، ہم سب لوگ مل کر پھر گانے لگے۔ تیرا میرا میرا تیرا پیار ہو گیا یکا یک اس دبلے پتلے لڑکے نے طبلہ بجانا بند کر دیا اور اپنے ایک ساتھی کو جو اپنی گردن دونوں ٹانگوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا، ٹھوکا دے کے کہا، ابے مدھو بالا تو کیوں نہیں گاتے۔ مدھو بالا نے اپنا چہرہ ٹانگوں میں بڑی وقت سے نکالا، اس کا چہرہ مدھو بالا ایکٹرس کی طرح حسین نہیں تھا، ٹھوڑی سے لے کر دائیں ہاتھ کی کہنی تک آگ سے جلنے کا ایک بہت بڑا نشان یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا، اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے، اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جو اس کے گول چہرے پر دو کالی درزیں معلوم ہوتی تھیں انتہائی پریشانی جھلک رہی تھی، اس نے اپنے ہونٹ سکیڑ کر طبلے والے سے کہا:

سالے مجھے رہنے دے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔

کیوں درد ہوتا ہے، سالے تو نے آج پھر ایرانی پلاؤ کھایا ہوگا؟

مدھو بالا نے بڑے دکھ سے سر ہلایا، ہاں وہی کھایا تھا۔

کیوں کھایا تھا سالے۔

کیا کرتا، آج صرف تین جوتے بنائے تھے۔

جو عمر میں ان سب سے بڑا معلوم ہوتا ہے تھا، جس کی ٹھوڑی پر تھوڑی داڑھی اگی تھی اور کنپٹیوں کے بال رخساروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا، اے مدھو بالا، اٹھ میدان میں دوڑ لگا، چل میں تیرے ساتھ دوڑتا ہوں، دور چکر لگانے سے پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔

نہیں بے رہنے دے، نہیں بے سالے اٹھ، نہیں تو ایک جھانپڑ دوں گا۔

مدھو بالا نے ہاتھ جوڑ کر کہا، سکور رہنے دو، میں تیری منت کرتا ہوں، یہ پیٹ کا درد

ٹھیک ہو جائے گا۔

اٹھ بے، کیوں ہماری سنگت خراب کرتا ہے۔ ککو نے ہاتھ بڑھا کر مدہو بالا کو اٹھایا اور وہ دونوں یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں چکر لگانے لگے، پہلے تو تھوڑی دیر تک ان دوڑتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھتا رہا، پھر جب میرے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے نے سر کھجا کے کہا، سالی کیا مصیبت ہے ایرانی پلاؤ، کھاؤ تو مصیبت اور نہ کھاؤ تو مصیبت۔ میں نے کہا بھائی پلاؤ تو بڑے مزے کی چیز ہے، اسے کھانے سے پیٹ درد کیسے ہوسکتا ہے؟ میری بات سن کر وہ ہنسے، ایک لڑکے نے جس کا نام بعد میں مجھے کلد یپ کور معلوم ہوا اور جو اس وقت ایک پھٹی ہوئی پنڈی اور ایک پھٹی نیکر پہنے ہوئے ہے، مجھ سے ہنس کر کہا، معلوم ہوتا ہے تم نے ایرانی پلاؤ کبھی نہیں کھایا۔ کلد یپ کور نے اپنی بنڈی کے بٹن کھولتے ہوئے مجھے بتایا کہ ایرانی پلاؤ ان لوگوں کی خاص اصطلاح ہے، اسے ایسے لوگ روز روز نہیں کھا سکتے لیکن جس دن لڑکے نے جوتے بہت کم پالش کئے ہوتے ہیں یا جس دن اس کے پاس بہت کم پیسے ہوتے ہیں اس دن اسے ایرانی پلاؤ ہی کھانا پڑتا ہے اور یہ پلاؤ سامنے کے ایرانی ریستوران سے رات کے بارہ بجے کے بعد ملتا ہے، جس سب گاہک کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں، دن بھر میں لوگ ڈبل روٹی کے ٹکڑے اپنی پلیٹوں میں چھوڑ جاتے ہیں، ڈبل روٹی کے ٹکڑے گوشت اور ہڈیاں چچوڑی ہوئی، چاول کے دانے، آملیٹ کے ریزے، آلوؤں کے قتلے، یہ سارا جھوٹا کھانا ایک جگہ جمع کر کے ایک ملغوبہ تیار کرلیا جاتا ہے اور ملغوبہ دو آنے پلیٹ کے حساب سے بکتا ہے، پیچھے کچن کی دروازے پر اسے ایرانی پلاؤ کہا جاتا ہے، اسے عام طور پر اس علاقے کے غریب لوگ بھی نہیں کھاتے پھر بھی ہر روز دو تین سو پلیٹیں بک جاتی ہیں، خریداروں میں زیادہ تر جوتے پالش کرنے والے، فرنیچر ڈھونے والے، گاہکوں کیلئے ٹیکسی لانے والے ہوتے ہیں یا آس پاس کے بلڈنگوں میں کام کرنے والے مزدور بھی ہوتے ہیں۔ میں کلد یپ کور سے پوچھا تمہارا نام کلد یپ کور کیوں ہے؟ کلد یپ کور نے اپنی بنڈی بالکل اتار دی اور اب وہ بڑے مزے سے لیٹا ہوا ہے اپنا سیاہ پیٹ سہلا رہا تھا، وہ میرا سوال سن کر وہیں گھاس پر لوٹ پوٹ ہوگیا، پھر ہنس چکنے کے بعد اپنے

ایک ساتھی سے کہنے لگا ذرا میرا بکسا لانا۔ ساتھی نے کلدیپ کور کو بکسا دیا، کلدیپ کور نے بکسا کھولا، اس میں پالش کا سامان تھا، پالش کی ڈبیوں پر کلدیپ کور کی تصویر بنی ہوئی تھی، پھر اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا، تو بھی اپنا بکسا کھول۔ اس نے بھی اپنا بکسا کھولا، اس بکس میں پالش کی جتنی چھوٹی بڑی ڈبیاں تھیں ان پر نرگس کی تصویریں تھیں، جو رسالوں اور اخباروں کے صفحوں سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔ کلدیپ کور نے کہا یہ سالا نرگس پالش مارتا ہے، وہ نمی کا وہ ثریا کا، ہم میں جوتا پالش والا ہے، کسی نہ کسی فلم ایکٹریس کی تصویریں کاٹ کر اپنے ڈبوں پر لگاتا ہے اس کا پالش مارتا ہے۔ سالا گاہک ان باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے، ام اس سے بولتا ہے، صاحب کون سا پالش لگاؤں، نرگس کہ ثریا کہ مدھو بالا؟ پھر جب گاہک جس فلم کی ایکٹریس کو پسند کرتا ہے، اس کا پالش مانگتا ہے، ہم اس کو اس لڑکے کے حوالے کر دیتا ہے جو نرگس کا پالش یا نمی کا یا کسی دوسری فلم ایکٹرس کا پالش مارتا ہے، ہم آٹھ لڑکے ہیں، ادھر سامنے چرچ گیٹ پر سے بس اسٹینڈ کے پیچھے بیٹھتے ہیں، جس کے پاس جس ایکٹرس کا پالش ہے وہ ہی اس کا نام لے گا، اسی سے ہمارا دھندا بہت اچھا چلتا ہے اور کام میں مجا آتا ہے۔ میں نے کہا تم اور بس اسٹینڈ کے نیچے فٹ پاتھ پر ایرانی ریستوران کے سامنے بیٹھے ہو تو پولیس والا کچھ نہیں کہتا؟

کلدیپ کور اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا، اب سیدھا ہو گیا، اس نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو ایک انگلی سے دبا کر اسے یکا یک ایک جھٹکے سے یوں نچایا جیسے وہ فضا میں اکنی اچھال رہا ہوں، بولا وہ سالا کیا کہے گا؟ اسے پیسہ دیتا ہے اور یہاں اس میدان میں جو سوتا ہے اس کا بھی پیسہ دیتا ہے، پیسہ؟ اتنا کہہ کر کلدیپ کور نے پھر انگوٹھے سے ایک خیالی اکنی ہوا میں اچھالی اور فضا میں دیکھنے لگا، اور پھر دونوں ہاتھ کھول کر دیکھا، مگر دونوں خالی تھے کلدیپ کور بڑی مزے دار اور تلخی سے مسکرا دیا، اس نے کچھ نہیں کیا چپ چاپ اوندھا لیٹ گیا۔ نرگس نے مجھ سے پوچھا تم ادھر داور میں پالش مارتے ہوں؟ میں نے تم کو ویزاں ہوٹل کے سامنے دیکھا ہے۔ میں نے کہا، ہاں مجھ کو بھی ایک پالش والا ہی سمجھو۔ ایک طرح سے کیا؟

کلدیپ کور اٹھ کر بیٹھ گیا، اس نے میری طرف گھور کر دیکھا، سالہ سیدھے بات کرو

نا، تم کیا کام کرتا ہے؟ اس نے کہا میں بہت خوش ہوا، کوئی اور کہتا تو میں اسے ایک جڑ دیتا، مگر جب اس لڑکے نے مجھے سالا کہا تو میں بہت خوش ہوا کیونکہ سالا گالی کا لفظ نہیں تھا، برادری کا لفظ تھا، ان لوگوں نے مجھے اپنی برادری میں شامل کرلیا تھا، اس لئے میں نے کہا، بھائی ایک طرح سے میں بھی پالش والا ہوں، مگر میں لفظ پالش کرتا ہوں اور کبھی کبھی پرانے میلے چیڑوں کو کھرچ کے دیکھتا ہوں کہ ان کی بوسیدہ تہوں میں کیا ہے۔ نرگس اور نمی ایک دم بول اٹھے، تو سالہ پھر گڑ بڑ گھوٹالا کرتا ہے، صاف صاف کیوں نہیں بولتا کیا کام کرتا ہے۔ میں نے کہا۔

میرا نام بش ہے، میں کہانیاں لکھتا ہوں۔

اوہ تو بابو ہے نمی بولا، نمی ایک چھوٹا سا لڑکا تھا، یہاں دائرے میں جتنے لڑکے تھے ان سب میں سب سے چھوٹا، مگر اس کی آنکھوں میں ذہانت تیز چمک تھی اور چونکہ وہ اخبار بھی بیچتا تھا، اس لئے اسے مجھ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی، اس نے میرے قریب قریب آ کر کہا، کون سے اخباروں میں لکھتے ہو؟ پھری ریس، سنٹل ٹائم، بمبئے کرانیکل، میں اب اخباروں کو جانتا ہوں۔ وہ بڑھ کر میرے قریب آ گیا۔ میں نے کہا میں شاہراہ میں لکھتا ہوں۔ ساہرہ؟ کون نوز پیپر ہے؟ دہلی سے نکلتا ہے۔ دلی کے چھاپے خانے سے وہ؟ نمی کی آنکھیں میرے چہرے پر پھیل گئیں۔ اور اب ادب لطیف میں لکھتا ہوں، میں نے رعب ڈالنے کیلئے کہا۔ کلد یپ کور ہنسنے لگا۔ کیا کہا بدبے خلطیف میں لکھتا ہے، سالے یہ تو کسی انگلش فلم ایکٹریس کا نام معلوم ہوتا ہے، بدبے خلطیف آہا آہا آہا، ابے نمی تو اپنا نام بدل کر خلطیف رکھ لے، بڑا اچھا نام مالوم ہوگا، ہاہاہاہا جب سب لڑکے ہنس چکے تو میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا، بدبے خلطیف نہیں، ادب، ادب، لطیف، لاہور سے نکلتا ہے، بہت اچھا پیپر ہے۔ نرگس نے بے پرواہی سر ہلا کے کہا، ہاں سالے ہوگا ادب لطیف ہی ہوگا ہم کو کیا، ہم اس کو بیچ کے ادھیر پیسہ تھوڑی کماتے ہیں۔ تقریباً اتنا ہی جتنا تمہیں ملتا ہے، اکثر کچھ بھی نہیں ملتا جب میں لفظوں پر پالش کر چکتا ہوں تو اخبار والے شکریہ کہہ کر مفت لے جاتے ہیں اور اپنی رسالے یا اخبار کو چمکا لیتے ہیں۔ تو خالی مغزماری کیوں کرتا ہے۔ ہماری طرح پالش کیوں نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں تو بھی آ جا ہماری برادری میں،

بس تیری ہی کسر تھی، اور تیرا نام ہم بد بے خلطیف ہی رکھ دیں گے، لا ہاتھ میں نے کلد یپ کور سے ہاتھ ملایا۔ کلد یپ کور کہنے لگا، مگر چار آنے روز پولیس والے کو دینے پڑیں گے اور اگر کسی روز چار آنے نہ ہوئے تو؟

تو ہم کو مالوم نہیں، کسی سے مانگ، چوری کر ڈاکہ ڈال، مگر سنتری کو چار آنے دینے پڑیں گے اور مہینے میں دو دن حوالات میں رہنا پڑے گا۔ ارے وہ کیوں؟ یہ ہم نہیں جانتے، سنتری کو ہم ہر روز چار آنے دیتے ہیں ہر ایک پالش والے دیتا ہے، پھر بھی سنتری ہر مہینے میں دو دفعہ ہم کو پکڑ کے لے جاتا ہے، ایسا اس کا قاعدہ ہے، وہ بولتا ہے، ام کیا کریں۔ میں نے کہا، اچھا دو دن حوالات میں بھی گزار لیں گے اور کلد یپ کور نے کہا، تم کو مہینے میں ایک بار کورٹ بھی جانا پڑے گا، تمہارا چالان ہوگا، کمیٹی کے آدمی کی طرف سے، تم کو کورٹ میں بھی جانا پڑے گا دو روپے یا تین روپے وہ بھی تم کو دینا پڑے گا۔ وہ کیوں؟ جب میں چار آنے سنتری کو دیتا ہوں، پھر ایسا کیوں ہوگا؟ ارے یار سنتری کو بھی تو اپنی کارگزاری دکھانی ہے کہ نہیں، تو سمجھتا نہیں ہے سالے بد بے خلطیف؟ میں نے آنکھ مار کر کلد یپ کور سے کہا، سالے سمجھتا ہوں، ہم دونوں ہنسنے لگے، اتنے میں مدہو بالا اور ککو دونوں میدان کے چکر لگا کر پسینے میں ڈوبے ہوئے واپس آئے۔ میں نے مدہو بالا پوچھا، تمہارا پیٹ کا درد غائب ہو گیا۔

آدھے گھنٹے کا خدا

دو آدمی اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اتنی بلندی سے وہ دونوں نیچے سپاٹ کھیتوں میں چلتے ہوئے دو چھوٹے سے کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دونوں کے کندھوں پر تیلیوں کی طرح باریک رائفلیں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً ان کا ارادہ اسے جان سے مار دینے کا تھا۔ مگر وہ لوگ ابھی اس سے بہت دور تھے۔ نگاہ کی سیدھ سے اس نے نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اندازہ کیا۔ جہاں پر میں ہوں، وہاں تک ان دونوں کو پہنچنے میں چار گھنٹے لگیں گے تب تک......اس نے پر امید نگاہوں سے گھوم کر اپنے اوپر پہاڑ کی چوٹی کو دیکھا۔ ساردو پہاڑ کی بارہ ہزار فٹ اونچی چوٹی، اس سے اب صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے، پھر دونوں کے ہاتھ نہ آ سکے گا۔ ساردو پہاڑ کی دوسری طرف گڈیالی کا گھنا جنگل تھا جو اس کا دیکھا بھالا تھا۔ جس کے چپے چپے سے وہ اتنی ہی آگاہی رکھتا تھا جتنا اس جنگل کا کوئی جنگلی جانور رکھ سکتا ہے۔ اس جنگل کے خفیہ راستے، جانوروں کے بھٹ، پانی پینے کے مقام سب اسے معلوم تھے۔ اگر ایک دفعہ وہ ساردو پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا تو پھر اپنا پیچھا کرنے والوں کے ہاتھ نہ آ سکے گا۔

جب وہ چوٹی پر پہنچ جائے گا تو اسے دوسری طرف کی سرسبز ڈھلوانوں پر گڈیالی کا جنگل دکھائی دے گا اور جنگل سے پرے سرحد کا پل، جسے ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا گیا تھا۔ گرے

ہوئے پل کے اس پار اس کا اپنا دیس تھا۔ ایک بار وہ چوٹی پر پہنچ جائے پھر اسے نیچے ڈھلوان کے گھنے جنگل کو طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی اگر پل نہیں ہے تو کیا ہوا، وہ بہت عمدہ تیراک ہے۔ وہ گڈیالی ندی عبور کر کے اپنے دیس پہنچ جائے گا۔

اور چوٹی تک پہنچنے میں اسے صرف ایک گھنٹہ لگے گا اور وہ دونوں اس کے دشمن ابھی اس سے چار گھنٹے کی مسافت کے فاصلے پر تھے......نہیں، وہ اسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ جوان ہے، مضبوط ہے اور چار گھنٹے ان سے پہلے چلا ہے۔ وہ اسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ ابھی اس چٹان پر پندرہ بیس منٹ بیٹھ کر دم لے سکتا ہے اور دور نیچے کھیتوں سے گزرتے ہوئے گھاٹیوں کی طرف آنے والے ان دونوں آدمیوں کو بڑے اطمینان سے دیکھ سکتا ہے جو اس کی جان لینے کیلئے آ رہے ہیں۔ وہ مسکرا بھی سکتا ہے، کیونکہ وہ ان سے بہت دور ہے۔

یقیناً انہوں نے اسے دیکھ لیا ہے کیونکہ نیچے کے کھیتوں تک اس طرف کا پہاڑ جس کے اوپر وہ چل رہا ہے، بالکل ننگا ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ سنتے کی اور لال ٹینا کی۔ جن میں آدمی چھپ بھی نہیں سکتا اور زمین سے لگی ہوئی پتلی چھدری گھاس ہے اور نیچی نیچی سیاہ چٹانیں۔ رات کی بارش سے بھیگی ہوئی اور پرانی کائی پھسلواں۔ اس پرانی کائی سے بند پانی کی بو آ رہی ہے اور بھربھری مٹی پر قدم پھسلتے ہیں۔ اسے بڑی ہوشیاری سے آگے کا فاصلہ طے کرنے کیلئے، جو آدھے گھنٹے کا ہو سکتا ہے، ایک گھنٹہ رکھا ہے۔

بس اسے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ وہ نیچے کے گاؤں سے بھاگتے وقت کیوں اپنی رائفل ساتھ نہ لا سکا۔ بھاگتے وقت اس نے رائفل وہیں چھوڑ دی۔ یہ ایک ناقابل معافی حادثہ تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟......اگر اس کے پاس اس وقت اپنی رائفل ہوتی تو وہ دونوں نیچے سے آنے والے اس قدر بے خوفی سے اس کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے وہ آسانی سے کسی چٹان کی اوٹ میں دبک کر کسی مناسب جگہ پر ان کا انتظار کر سکتا تھا اور اپنی رائفل کی رینج میں آتے دیکھ کر ان لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا مگر وہ کیا کرے، اس وقت وہ بالکل نہتا تھا اور اب ہر لحظہ اس کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ ان کی بندوق کی مار سے آگے چلتا رہے......

اس نے تعاقب کرنے والوں کے پیچھے بھی دور تک کھیتوں کو دیکھا اور کھیتوں سے پرے سیب، آلوچے اور خوبانیوں کے درختوں سے گھرے مگری کے گاؤں کو دیکھا۔ ایک لمحہ کیلئے اس کے دل کے اندر اداسی کی ایک گہری سرخ لکیر کھینچتی چلی گئی۔ اس خنجر کی باریک اور تیز دھار کی طرح جس کا پھل اس وقت موگری کے دل میں پیوست تھا۔ موگری جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت تھی۔

کاشر کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ موگری کی جان لے لے۔ چمکتی ہوئی گہری سیاہ آنکھوں والی موگری۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹوں والی، انیس برس کی موگری، وہ جب ہنستی تھی تو ایسا لگتا تھا گویا سیب کی ڈالیوں سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ایسی مہکتی ہوئی سپید ہنسی، اس نے کسی دوسری لڑکی کے پاس نہ دیکھی تھی، ہنسی جو سیب کے پھولوں کی یاد دلائے یا اچانک پر کھول کر ہوا میں کبوتری کی طرح اڑ جائے اور وہ ذرا سے کھلے، ذرا سے بند انگاروں کی طرح دہلکتے ہوئے شریر ہونٹ۔ ان ہونٹوں پر جب وہ اپنے ہونٹ رکھ دیتا تھا تو اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے خون کے بہاؤ میں چنگاریاں سی اڑتی چلی جا رہی ہیں۔ جیسے جذبہ پگھل کر خون اور خون پگھل کر شعلہ اور شعلہ پگھل کر بوسہ بن گیا ہو اور وہ پوری طرح موگری کے چہرے پر جھک جاتا تھا۔ اتنے زور سے کہ موگری کی سانس اس کے سینے میں رکنے لگتی تھی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کے منہ پر طمانچے مار کر ہی اپنا چہرہ اس کے چہرے سے الگ کر سکتی تھی۔

''تم بالکل جانور ہو کاشر'' وہ ہانپتے ہوئے کہتی۔

''اور تم آگ ہو'' وہ خود اپنے جذبے کی شدت سے ڈر کر ذرا پیچھے ہٹتا ہوا کہتا۔

''میرے گاؤں میں کوئی نہیں جانتا کہ میں ایک دشمن کے بیٹے سے پیار کرتی ہوں''۔

''میرے سپاہیوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا کہ میں گڈیالی کے جنگل میں روز کس سے ملنے جاتا ہوں''۔

وہ دونوں گڈیالی کے جنگل میں جیپ کے کسی کچے راستے پر بیٹھ جاتے۔ دیودار کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے پر پیچھے جیپ کھڑی ہوتی۔ سامنے ایک چھوٹی سی ڈھلوان کی گہری اور دبیز گھاس۔ کوئی چشمہ تقریباً بے آواز ہو کر بہتا تھا۔ جنگلی پھولوں پر پانی کے قطرے گر گر سو جاتے اور چاروں طرف بڑے بڑے ستونوں کی طرح اونچے اونچے دیودار اور ان کے گھنے چھتناروں میں سے سبزی مائل روشنی دور اونچے لٹکے ہوئے فانوسوں کی طرح چھن چھن کر آتی...... کاشر کو ایسا محسوس ہوتا گویا وہ کسی مغل بادشاہ کے دیوان خاص میں بے اجازت آ نکلا ہے۔ یہاں آ کر وہ دونوں کئی منٹ تک جنگل کے گہرے سناٹے میں کھو جاتے اور آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل چپ ہے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل ان کے اردگرد سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے۔

موگری، علاقہ غیر کے گاؤں سے ایک ٹوکری میں پھل اٹھائے ہوئے گڈیالی کے پل تک آتی تھی جو کاشر اور اس کے سپاہیوں کی عملداری میں تھا۔ سیب، ناشپاتی، کیلے، آلوچے، بہی، کیمب، اودے انگوروں کے گچھے یا صرف اخروٹ اور مکی کے بھٹے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوش رنگ خوبانیاں جنہیں دیکھ کر سنہری اشرفیوں کا دھوکہ ہوتا ہے اور موگری اتنی خوبصورت تھی کہ پل کی حفاظت کرنے والے سپاہی چند منٹوں میں اس کی ٹوکری خالی کر دیتے تھے۔ سب سے آخر میں کاشر آتا تھا اور جب کاشر موگری کے نزدیک آتا تو سب سپاہی ہٹ جاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے......

لیکن جس دن موگری کی مخبری پر علاقہ غیر کے گاؤں والوں نے گڈیالی کا پل جو اس کی تحویل میں تھا، ڈائنا میٹ سے اڑا دیا، اسی دن اسے شدید دھچکا سا لگا جیسے اس کے دل کے اندر بھی کوئی پل تھا جو ڈائنا میٹ سے پرزے پرزے ہو گیا تھا اور وہ باہر کا پل تو کبھی نہ کبھی پھر بن جائے گا لیکن اندر کا پل کون بنا سکے گا پھر سے؟ اس لئے وہ وحشت زدہ سا ہو کر پل کے ٹکڑوں کو ان گہرے پانیوں میں گرتا ہوا دیکھتا رہا۔ جہاں لطیف سے لطیف جذبے بھی بھاری پتھر بن کر ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں ابھر سکتے۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر اس کی آنکھوں

میں آنسو نہ آ سکے اور وہ موگری کو گالی دینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی زبان پر الفاظ نہ آ سکے وہ جانتا تھا کہ ہر سپاہی کی نگاہ اس پر ہے۔ وہ نگاہ جو بظاہر کچھ نہیں کہتی لیکن خاموش لہجے میں شکایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جب وہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا تو اپنی رائفل لے کر گڈیالی ندی میں کود پڑا اور اس کے سپاہی بھونچکے ہو کر اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

وہ ندی پار کر کے گڈیالی کے جنگل میں گھس گیا۔ کئی دن تک وہ اکیلا بھوکا پیاسا اس جنگل میں گھومتا رہا اور وہ ان تمام جگہوں پر گیا جہاں پر وہ موگری کے ساتھ گیا تھا اور ان جگہوں پر جا کر اس نے ان تمام جذبوں کو بھلانا چاہا، جنہوں نے موگری کی موجودگی میں اس کے لئے دھندلے دھندلے شفق زار تعمیر کئے تھے۔ کئی بار وہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی یہاں آیا تھا تو بھی اسے ہر جگہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ پیڑ کا تنا جہاں موگری بیٹھتی تھی۔ اس کے گرد اک ہالہ سا کھنچا معلوم ہوتا تھا۔ موگری نہ تھی پھر بھی گویا جھرنے کے پانیوں میں اس کی آواز کی روانی گھل گئی تھی۔ ہر پھول میں اس کے بالوں کی مہک تھی اور وہ زمین جہاں پر وہ بیٹھتے تھے، وہاں پر موگری کے جسم کی سوندھی سوندھی مہک آتی تھی......مگر آج وہاں کچھ نہ تھا۔ جذبوں کے شفق زار چھٹ گئے تھے۔ پیڑ کا تنا محض پیڑ کا تنا تھا اور پانی کا جھرنا، پانی کے جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا۔ ہر چیز انجانی اور اجنبی اور اس سے الگ الگ کھڑی تھی۔ وہ چیخ مار کر سارے جنگل کو جگا دینا چاہتا تھا مگر اس کا حلق بار بار گھٹ رہا تھا۔ اس کے سارے احساسات پر اک دھند سی چھائی ہوئی تھی، جنگل میں بے سمت گھومتے گھومتے کئی بار اسے خیال آیا کہ اگر وہ اس دھند کو اپنے ناخنوں سے چیر دے تو شاید اندر سے موگری کا زندہ اور اصلی چہرہ صحیح وسلامتی نکل آئے گا۔ وہ موگری جسے وہ اپنے دل سے پہچانتا تھا مگر دھند کسی طرح نہ چھٹی اور گہری ہوتی گئی۔ جنگل میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ پیڑوں کا گھیرا اس کیلئے تنگ ہونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے چاروں طرف سے جنگل کے پیڑ جھک کر اس پر گرنے والے ہیں۔

پھر وہ گھبرا کر جنگل سے باہر بھاگ نکلا اور گڈیالی کا جنگل طے کر کے وہ سار دو پہاڑ

کی برفیلی چوٹی کے دوسری طرف اتر گیا۔ جہاں موگری کا گاؤں تھا۔

کئی دنوں تک وہ بھیس بدلے ہوئے ٹوہ لیتا رہا کسی کو اس پر شبہ نہ ہوا کیونکہ اس کی شکل وصورت ایسی تھی جیسے علاقہ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اس کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے اور وہ ان کی زبان بخوبی بول سکتا تھا اس لئے کسی کو اس پر شبہ نہ ہوا اور وہ ایک دن موقعہ دیکھ کر آدھی رات کو موگری کے گھر کے اس کمرے میں گھس گیا جہاں موگری سو رہی تھی۔ موگری کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ اس نے آہٹ کئے بغیر کنڈی اندر سے چڑھا دی۔ رائفل کندھے سے اتار کر ایک کونے میں رکھ دی اور آہستہ آہستہ دبک کر وہ موگری کے بستر کے قریب چلا گیا۔ قریب جا کر اس نے اپنا خنجر نکال لیا۔

وہ خنجر ہاتھ میں لئے دیر تک کھڑا رہا اور موگری کی سانسوں کی پرسکون آواز سنتا تھا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا وہ موگری کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بار ماچس جلا کر موگری کا چہرہ دیکھ لے۔ مگر بڑی جانکاہ کاوش سے اس نے ایک اذیت ناک خواہش کو اپنے دل میں روک دیا۔ دیر تک وہ خنجر لئے یونہی کھڑا رہا اور موگری کے سانسوں کے اس بے آواز جھرنے کو سنتا رہا جو اب اس کے دل کی طرف بہہ رہا تھا وہ ہولے ہولے موگری کے چہرے پر جھک گیا۔ بس ایک الوداعی بوسہ اور پھر خنجر......مگر جھکتے جھکتے اس کے سانس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اس کے دماغ میں سنسناتی ہوئی گونجیں سی چاروں طرف پھیلنے لگیں اور اس نے اپنے جلتے ہوئے، کانپتے ہوئے ہونٹ موگری کے ہونٹوں پر رکھ دیئے......موگری کے سارے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے موگری چیخ مارنے کو ہے مگر اس نے ایسی مضبوطی سے اپنے ہونٹوں کو موگری کے ہونٹوں سے ملا رکھا تھا کہ چیخ مارنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پہلے تو موگری کا سارا جسم برف کی طرح سرد ہونے لگا اور ہمیشہ یونہی ہوتا تھا۔ اسے اس سے پیشتر کے بہت سے رنگین اور خوبصورت لمحے یاد آئے۔ جب موگری پیار کرتے یک لخت اس کے بازوؤں میں سرد پڑ جاتی تھی اور کئی لمحوں تک اس کی یہی کیفیت رہتی تھی جیسے وہ دل و جان سے اس کی مزاحمت کر رہی ہو پھر ہولے ہولے اس کے

بوسوں کی آنچ سے اس کا سارا جسم گرم ہونے لگتا ہولے ہولے گویا برف پگھلنے لگتی اور بدن میں انگڑائیاں اور پھر پھریاں جاگنے لگتیں اور گرم گرم سانس آنچ کی طرح پگھلنے لگتا اور وہ بے اختیار ہو کر کاشر سے لپٹ جاتی اور اپنے بازو اس کے گردن میں حمائل کر دیتی۔ موگری کے دل کے اندر غالباً محبت اور نفرت کا ہر آن بدلتا ہوا میزانیہ سا چلتا رہتا تھا۔ اپنا دشمن سمجھ کر وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ اپنا محبوب سمجھ کر اس سے محبت کرتی تھی اور کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ موگری کا سرد پڑتا ہوا خوفزدہ اور اپنے آپ میں اکیلا جسم دھیرے دھیرے لو دینے لگا جیسے انگ انگ سے روشنی پھوٹ نکلے۔ ایسی روشنی جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں صرف ہاتھ محسوس کر سکتے ہیں۔ موگری نے یقیناً اس بوسے کو پہچان لیا تھا۔ خوبصورت اور پر خطر زندگی بسر کرنے والی عورت کی زندگی میں بہت سے بوسے آتے ہیں۔ دیمک کی طرح چاٹ جانے والے بوسے اور جونک کی طرح چمٹ جانے والے بوسے۔ روکھے سوکھے پاپڑ نما بوسے اور ایسے لجلجے اور گندے بوسے، گویا ہونٹوں پر کیڑے چل رہے ہوں۔ شرمائے ہوئے سہمے ہوئے بوسے اور خوفزدہ کمزور اور بیمار بوسے اور صحت مند اور شریر بوسے۔ موگری ایسی خوبصورت عورتوں کو ہر قسم کے بوسوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مگر وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان میں سے کونسا بوسا ایسا ہوتا ہے جو دل پر دستک دیتا ہے۔ صرف اسی دستک کے جواب میں وہ بوسے کے جواب میں بوسے دیتی ہیں ورنہ صرف ہونٹ پیش کرتی ہیں۔

مگر اس بار موگری صرف چند لمحوں کیلئے برف کی طرح ٹھٹھری رہی پھر اس نے اپنے اوپر جھکے ہوئے ہونٹوں کے لمس کو پہچان لیا اور پہچان کر بھی گو وہ چند لمحوں کیلئے دہشت زدہ اور ٹھٹھری سی رہی مگر ہولے ہولے اس کی مغائرت دور ہوتی گئی۔ آدھی رات کے نیم گرم اندھیرے میں کسی غیر متوقع خوشی سے اس کی ساری روح کانپ اٹھی اور وہ خود سے کاشر کی بانہوں میں آ گئی اور اس طرح آئی، جیسے اب تک کبھی نہ آئی تھی۔ کاشر نے محسوس کیا جیسے آسمان زمین پر اتر آیا ہو اور زمین لمبے لمبے سانس لے کر ہانپنے لگی۔ ایک شعلہ سا تھا جو برف کی پہنائی میں ڈوب رہا تھا۔ برف کی ٹوٹتی ہوئی ٹکڑیاں گلاب کی بکھری ہوئی پتیاں سسک سسک کر سلگتا

ہواسنگیت......جسم کے حصار کو توڑنے کی کاوش میں افتاں وخیزاں۔یکا یک حصار ٹوٹ گیا...... مچھلیاں طوفان میں بہہ گئیں۔ بہت سارے چراغ اک دم گل ہو گئے پھر سارے احساس نیم غنودگی کی سبز جھیل میں کھو گئے......

جب وہ جاگا تو اسی طرح گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور موگری اس کی بانہوں میں سو رہی تھی۔ جانے اس بے خبری میں کب کاشر نے خود اپنے ہاتھ کا خنجر اپنے پہلو میں رکھ لیا تھا......

اس نے پہلو بدل کر آہستہ سے خنجر نکالا۔آہستہ سے موگری نیند میں کسمسائی۔ جھکے ہوئے کاشر کو موگری کا ہاتھ اپنی پیٹھ پر محسوس ہوا۔تھپکتا ہوا۔نیند کی ترغیب دیتا ہوا۔پیشتر اس کے کہ وہ پھر اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جائے، اس نے ایک ہی جھٹکے سے پورا خنجر ہتھی تک موگری کے دل میں اتار دیا۔

موگری چیخ بھی نہ سکی۔ ہولے ہولے اس کا کانپتا ہوا جسم ٹھنڈا ہوتا گیا مگر کاشر نے موگری کو بہت دیر تک اپنے جسم سے الگ نہیں کیا۔ ہولے ہولے کاشر کے جسم نے موگری کے مرتے ہوئے جسم کے ہر ارتعاش کو اپنے اندر جذب کر لیا اور جب موگری کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے موگری کے جسم کو اپنے جسم سے الگ کر دیا۔اس کے ٹھنڈے ہونٹوں کو پھر اس طرح بوسہ دیا، جیسے وہ کسی قبر کو بوسہ دے رہا ہو پھر کنڈی کھول کر باہر آنگن میں آیا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ آنگن کی دیوار پھلانگ کر ایک احمق کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا کیونکہ اب اس کے دماغ کی ہر رگ اور نس تانبے کے تاروں کی طرح جھنجنا رہی تھی اور جسم کے روئیں روئیں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سارا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا سو رہا تھا۔کسی نے اس کے جسم میں بجتی ہوئی خطرے کی گھنٹیوں کی پر شور صدا کو نہیں سنا اور وہ کھیتوں سے نکل کر ساردو پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔صبح جب موگری کے بھائیوں نے موگری کی لاش دیکھی اور دیوار سے لگی ہوئی رائفل کو پہچانا تو اس کا تعاقب کیا مگر اب تک اسے چار گھنٹے کا اسٹارٹ مل چکا تھا۔

اتنی دور سے وہ انہیں دیکھ سکتا تھا۔موگری کے دونوں بھائی برابر قدم سے قدم ملائے

تیز تیز چل رہے تھے۔ وہ موگری کے بھائیوں کو جانتا تھا۔ وہ دونوں بہادر اور جری، دلیر اور جفاکش تھے۔ اس کی طرح پرخطر زندگی کے عادی تھی، مستقل مزاج، غیور اور انتقام پسند تھے۔ وہ ان سے کسی رحم کی توقع نہ کرسکتا تھا، درخواست بھی نہ کرسکتا تھا۔ پہلی بات ان کے کردار خلاف ہوتی۔ دوسری اس کے اپنے مزاج کو ناپسند ہوتی۔ اگر رائفل اس کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ ان دونوں کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ وہ اتنا فاصلہ ضرور رکھے گا کہ کسی طرح ان کی رائفل کی زد میں نہ آسکے۔ وہ دونوں بہت تیزی سے منجھے ہوئے مشاق پہاڑی خچروں کی طرح چل رہے تھے۔ وہ بھی برابر یکساں لے میں چھوٹے چھوٹے سانس لیتا ہوا ساردو کے اوپر چڑھ رہا تھا۔ مگر فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا کیونکہ وہ دونوں کھیتوں میں تھے۔ سیدھے اور سپاٹ راستے پر، اور وہ پھسلوان چڑھائی پر۔ جہاں کائی لگی چٹانیں تھیں اور بھربھری مٹی اور کل رات کو وہ موگری کی آغوش میں تھا، کسی وقت ساردو پہاڑ کی اونچائی پر بارش ہوچکی تھی اور سارا پہاڑ گیلا تھا اور بھری بھری مٹی میں دھنسی ہوئی چٹانیں اپنی جگہ سے ہلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اسے ہر قدم نہایت احتیاط سے اور پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا اور جگہ جگہ رک کر ایک لمحہ کیلئے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا پڑتا تھا کہ وہ دونوں کہاں ہیں اور کتنے فاصلے پر ہیں۔ پہاڑ اس قدر ننگا تھا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور لمحہ بہ لمحہ اس کا تعاقب کا اندازہ کرسکتے تھے۔ بھاگنے والا بھی اور پیچھے کرنے والا بھی۔ دونوں اس تعاقب میں برابر ایک دوسرے کو نگاہ میں رکھنے پر مجبور تھے۔

دھیرے دھیرے صبح کے سپید، سنہرے اور گلابی پردے آسمان سے سرکا دیئے گئے اور سورج فلک کی نیلگوں کھڑکیوں سے نیچے جھانکنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کی روشنی تیز، سخت گیر اور بے رحمی ہوتی گئی اور کاشر کو احساس ہونے لگا گویا سورج بھی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس کی گردن چہرے اور پیٹھ سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ روشنی اسے اپنی پلکوں پر بیٹھی ہوئی محسوس ہونے لگی اور کرنوں کے کوڑے متواتر اس کے جسم پر پڑنے لگے اور پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تو بھی وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ ساری صبح چلتا رہا۔ ساری دوپہر چلتا رہا، کبھی تیز، کبھی مدھم، کبھی مضبوط قدموں سے کبھی تھکے بھاری قدموں سے، ایک لمحہ رکے بغیر

چلتا رہا۔ پیاس نے اس کا حلق بالکل خشک کر دیا تھا گال، زبان، تالو کاگ اور نرخرے میں ایسا لگتا تھا، گویا کہیں سے خاردار جھاڑیاں اگ آئی ہیں اور ہوا کی نالی سے ہوائیں اندر باہر جاتی تھی جیسے لوہار کی خشک اور سخت کھر درے چمڑے والی دھونکی سے نکلتی ہے۔ اب ہوا کی دھار تک کانٹے کی طرح تیز اور نکیلی تھی، تو بھی وہ چلتا رہا کیونکہ وہ رک نہ سکتا تھا، کیونکہ اس کا تعاقب کرنے والے بھی کہیں ایک لمحے کیلئے نہیں رکے تھے۔ چلتے چلتے جب وہ ساردو پہاڑ کا تین چوتھائی سے زیادہ فاصلہ طے کر گیا اور جب اسے ساردو پہاڑ کی برفیلی چوٹی اونچی اونچی لمبی چٹانوں سے گھری ہوئی اپنے سر کے اوپر نظر آنے لگی اور وہ سپید سپید بادل جو اس کے بالکل نزدیک منڈلا رہے تھے، اس کے کندھوں کو چھوتے ہوئے محسوس ہوئے تو اس نے چند لمحوں کیلئے آرام کرنا برحق جانا اور خطرے سے خالی بھی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بالکل مجبور ہو کر چٹانوں میں دبے ہوئے ایک چھوٹے سے چشمے پر جھک گیا اور جانوروں کی طرح ڈیک لگا کر پانی پینے لگا۔ پانی پیتے پیتے اس نے بڑی کوشش سے اپنے آپ کو بیچ ہی میں رکھ کر نگاہ گھما کر نیچے کی طرف دیکھا۔ اس کے تعاقب کرنے والے پہاڑ کا راستہ آدھے سے زیادہ طے کر چکے تھے۔ پھر بھی وہ کافی عرصہ کیلئے خطرے سے باہر تھا اور اب چوٹی دو ہزار فٹ کے فاصلہ پر گویا اس کے سر کے اوپر اطمینان کا سایہ کئے کھڑی تھی۔ ایک جست اور......اور پھر وہ خطرے سے باہر تھا۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے، پھر گڈیالی کے جنگل میں اسے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنا چہرہ سارے کا سارا چشمے میں ڈبو دیا۔ پانی پی کر اس کا تنا ہوا گرم جسم ایک دم گویا سیراب سا ہو گیا۔ ڈھیلا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بڑے اطمینان سے بند کر لیں۔ وہ وہیں چشمے کے کنارے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کے ٹانگیں پسار کے پڑ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ کیلئے ستانے کیلئے ایک نیم غنودگی کے عالم میں کھو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد وہ تازہ دم ہو کر اٹھے گا اور پہاڑ کا آخری حصے طے کر کے چوٹی پر ہو گا اور خطرے سے باہر پہنچ جائے گا۔

وہ یونہی چند منٹ کیلئے اسی نیم غنودگی کے عالم میں ستاتا رہا۔ چند منٹ کیلئے اس

کے جسم کو جو آرام ملا تو اس کے دل سے وقت کا احساس زائل ہو گیا۔ آرام کا ایک گنگنا تھکنے والا نشہ تھا جو اس کے جسم و جان میں اتر اجا رہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے پہلے دو ایک منٹ میں چوٹی کی بھربھری مٹی سے پھسل کر گرنے والی چٹانوں کی ایوالانش کی آواز نہیں سنی۔ پھر جب یکا یک بھڑتی ہوئی گڑگڑاہٹ کی وہ آواز اس کے کانوں میں آنے لگی تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا پھر وہ خوف اور دہشت کی ایک چیخ مار کر چشمے سے ہٹا اور چوٹی سے گرنے والے ہزاروں ٹن مٹی اور چٹانوں کے خوفناک تیزی سے نیچے کو بھاگتے ہوئے ملبے سے اپنی جان بچانے کیلئے ایک طرف کو بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے بھی وہ اپنے آپ کو اس خوفناک ایوالانش کی زد سے نہ بچا سکا۔ ہزاروں توپوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک طوفان خیز زلزلہ سا گویا اس کے سر کے قریب سے گزرا اور وہ زمین پر بچھ گیا۔ اسے اپنے حلق میں نتھنوں میں اور سانس کی نالی میں مٹی کے ذرے گھستے ہوئے محسوس ہوئے اور خوفناک کڑک سے ساری زمین کانپتی ہوئی محسوس ہوئی پھر کوئی انتہائی سخت سی چیز اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی جیسے کسی نے بڑے زور سے کوئی آہنی ہتھوڑا اسکے دھڑ پر گرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو چند لمحوں تک اسے یہ احساس رہا جیسے وہ مر چکا ہے اور کسی گہری قبر میں دفن ہے۔ اس کے چاروں طرف دائیں بائیں اوپر نیچے مٹی، کنکر، روڑے اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں پڑی تھیں اور وہ ان میں اوندھا لیٹا تھا پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تو اسے اپنے دونوں ہاتھ نظر آئے جو مٹی میں دھنسے تھے۔ اس نے پہلے تو بڑی حیرت سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا پھر آہستہ سے انہیں ہلایا۔ جب وہ ہلنے لگے تو اس کا اچنبھا دور ہو گیا۔ اسے یقین آ گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اس نے بڑی کوشش سے لیٹے لیٹے پہلے اپنے دائیں ہاتھ کو مٹی اور کنکر کے ڈھیر سے آزاد کیا پھر دوسرے ہاتھ کو۔ پھر مٹی کھود کر اس نے اپنے دھڑ کو آزاد کرایا پھر اپنی بائیں ٹانگ کو پھر جب وہ کسمسا کر اور کروٹ لینے کے انداز میں اپنی دائیں ٹانگ کو آزاد کرانے کیلئے زور لگانے لگا جو ایک بڑی چٹان کے نیچے دبی تھی تو شدید درد اور اذیت کی ایک زور کی چیخ اس کے حلق سے نکل گئی اور وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہیں زمین پر

پڑے پڑے ہانپنے لگا۔

جہاں پر وہ لیٹا تھا، اور جس زاویئے سے وہ لیٹا تھا، وہاں سے اسے پہاڑ کے نچلے حصے کا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ ایوالانش کا بھاری ملبہ اس کے جسم سے بس چند فٹ کے فاصلے سے ہو کے گزر رہا ہے۔ چند لمحوں کی دیر ہو جاتی تو اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جاتے یا چند لمحے پہلے اگر وہ خبردار ہو جاتا تو اس ایوالانش کی زد سے وہ صاف بچ جاتا......اس نے دور تک پہنچے ایوالانش کے راستے کو دیکھا۔ ایوالانش جہاں جہاں سے گزری تھی جھاڑیوں کو اکھاڑتی ہوئی ٹیلوں کو مسمار کرتی، چٹانوں کو بہاتی اک گہری کھائی بناتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ایک لمحہ کیلئے اس کے دل میں یہ اطمینان بخش خیال آیا کہ وہ دونوں مر گئے ہوں گے۔ اس ایوالانش کی زد میں آ کر لاکھوں ٹن مٹی کے نیچے ان کے جسم دب گئے ہوں گے۔ دوسرے لمحہ میں اس نے دیکھا کہ نیچے ایک چٹان کی اوٹ سے وہ دونوں بھائی صحیح وسلامت نکل رہے ہیں۔ رائفلیں اٹھائے ہوئے اور بڑی احتیاط سے پگ دھرتے ہوئے اپنی آنکھوں پر بار بار ہاتھ رکھ کر اوپر کا راستہ دیکھتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔

اپنے جسم وجان کا پورا زور لگا کر اس نے اپنی دائیں ٹانگ کو بھی اس بھاری چٹان سے آزاد کرا لیا۔، چٹان جو لڑھکی تو دیر تک نیچے کو گڑگڑاتی ہوئی اتر گئی۔ اس کی آواز سے نیچے تعاقب کرنے والے چونکے اور انہوں نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر ابھی تک وہ بہت نیچے تھے اور وہ ان کی رائفل کی زد سے باہر تھا۔

اپنے بائیں گھٹنے پر پورا زور دے کر وہ ہمت سے اٹھ کھڑا ہوا مگر پہلا قدم لیتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ بالکل شکستہ ہو چکی تھی اور اس کے دھڑ کے اندر خطرناک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اب وہ چل نہ سکتا تھا تو بھی وہ کوشش کر کے پھر اٹھا اور اپنی دائیں ٹانگ کو اٹھائے ہوئے ایک ہی ٹانگ سے راستے پر پھلانگ پھلانگ کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً نیچے تعاقب کرنے والوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب تیز تیز قدموں سے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ دانت پیس پیس کر پھلانگ پھلانگ کر آگے بڑھتا رہا مگر درد

لمحہ لمحہ بڑھ رہا تھا اور وہ بیچ بیچ میں مجبور ہو جاتا کہ کسی چٹان پر بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپ لے۔ درد کی ٹیسیں بڑھ رہی تھیں۔ اس کا سارا جسم اک کربناک اذیت سے کانپ رہا تھا اور فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آ رہے تھے۔ نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ وہ پھلا نگتے پھلانگتے تقریباً دوڑنے لگا۔ بڑی نابرابر دوڑ تھی۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایک لحظہ کیلئے بھی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو زمین پر رکھتا تو آگ سے تیزاب کی ملی جلی جلتی ہوئی کیفیت سے دوچار ہوتا اور فوراً اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اوپر اٹھا لیتا۔ پھلانگتے پھلانگتے دو ہزار بار سو فٹ اور اوپر بڑھ آیا۔ چوٹی اب اس سے صرف پانچ سات سو فٹ کے فاصلے پر تھی مگر اب وہ بالکل بے دم ہو چکا تھا۔ اس کے جسم میں چھریاں سی چل رہی تھیں۔ بار بار اس پر نیم غشی کے دورے سے پڑتے اور آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگتے۔ اب اس نے محسوس کیا کہ اس کا دھڑ بالکل بے کار ہو چکا ہے۔ اب وہ بالکل نہیں چل سکتا۔ کسی نہ کسی طرح زور لگا کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر جب اس میں ناکام ہوا تو اس نے سر نیچا کر کے لیٹے لیٹے ہی گھسٹنا شروع کر دیا اوپر کی طرف۔ اپنے بازوؤں کی قوت سے وہ ہر فٹ اوپر ہی اوپر گھسٹتا رہا۔ لیکن اس گھسٹنے میں اس کے گھٹنے چھل گئے۔ اس کی کہنیوں سے خون بہنے لگا۔ ہاتھوں کی انگلیاں چھلنی ہوتی گئیں۔ اس کے شانے چھل گئے پھر بھی وہ لمحہ بہ لمحہ آگے ہی کو اوپر ہی کو گھسٹا رہا۔ ساری زندگی کی کاوش اور امید اور محنت اور اس کا درد انتظار اس کی آنکھوں میں کھینچ آیا تھا اور وہ اپنے جسم سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آخری سو فٹ...... اب اس نے پیچھے کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آخری پچاس فٹ......آخری تیس فٹ......وہ اوپر ہی اوپر گھسٹتا گیا۔ پھر دانت پیس کر اور اپنے جسم سے زیادہ اپنی روح کا پورا زور لگا کر اور اپنی حیات کی مخفی قوتوں کو آواز دے کر اس نے آخری تیس فٹ بھی انچ انچ گھسٹ کے طے کر لئے اور پہاڑ کی سب سے اونچی چٹان پر پہنچ گیا۔ جو تعاقب کرنے والوں کی طرف سیدھی بلم کی طرح کھڑی تھی۔ لیکن گڈیالی کے جنگل کی طرف ایک آرام دو کرسی کی طرح ڈھلوان شکل اختیار کئے ہوئے تھی۔

چوٹی پر پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو اس چٹان کی اونچی آرام کرسی پر گرا دیا اور ہانپتے

ہانپتے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو گڈیالی کا سرسبز اور گھنا جنگل دور نیچے تک اس کے قدموں میں پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ندی کے...... پار اس کے اپنے دیس میں آفتاب غروب ہو رہا تھا اور دور دور تک افق تا افق اس کے دیس کی گھاٹیاں اور وادیاں، دھان کے کھیت اور لہراتی ہوئی ندیاں ایک نارنجی غبار میں کھو گئی تھیں اور جہاں پر کبھی پل تھا وہاں پر دھنک کی محراب پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دیر تک حیرت سے خوبصورت رنگوں کی اس نازک سی محراب کو دیکھتا رہا جو اس کے دل کے سپنوں کی طرح حسین تھی اور یکا یک اسے احساس ہوا جیسے اس کے سفر کی آخری منزل آ گئی۔ اب جس جگہ پر وہ پڑا ہے، وہاں سے وہ ایک انچ ادھر ادھر حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ چوٹی پر پہنچ گیا تھا اور اس کے جسم نے اسے آخری جواب دے دیا تھا۔

اس نے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے ٹوٹے ہوئے پل کے کنارے اپنے وطن کے سپاہیوں کو سلام کیا اور پھر آنکھ کے کنارے سے نیچے دوسری طرف پہاڑ پر چڑھنے والے موگری کے دو بھائیوں کو آتے دیکھا۔ اب وہ ان کی رائفل کی زد میں تھا۔ مگر وہ اسے مار نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کی پیٹھ پر ایک مضبوط دبیز چٹان تھی۔ انہیں اسے مارنے کیلئے چوٹی تک آنا ہوگا اور چوٹی تک آنے میں انہیں ابھی آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔

ان کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے......

چند لمحوں میں وہ بہت دور اپنے بچپن کو لوٹ گیا اور ان پہلے چند لمحوں میں اسے اپنے بچپن کے اپنے گاؤں کے پہاڑ یاد آئے۔ اونچے ٹیڑھے میڑھے راستے۔ موڑ پر کھڑے ہوئے اچانک اجنبیوں کی طرح نظر آ جانے والے دیودار اور ندیاں، شریر چرواہوں کی طرح گھاٹی پر دوڑتی ہوئی اور دھوپ کا آنچل دھیرے دھیرے کسی وادی کے رخ پر سرکتا ہوا اور خوشبو تاریک شاموں کی، جن میں ننھے ننھے چراغ رات کے دھیمے سروں کی طرح جگمگاتے ہیں اور محبت کی سرگوشی کی طرح مہکتے ہیں۔ چند لمحوں کیلئے وہ بہت دور وہاں لوٹ گیا، جو اس کی ابتداء تھی۔ پھر ابتداء سے وہ جو پلٹا تو اگلے چند لمحوں میں اپنی پوری زندگی پھلانگ گیا اور یکا یک اسے محسوس

ہوا کہ اب تک اس نے جتنی زندگی گزاری وہ دوسروں کے لئے تھی۔موگری کی پہلی وفا کیلئے اور اس کی آخری بے وفائی کیلئے۔اپنے ملک کی محبت کیلئے اور اس کے آخری انتقام کیلئے،اور آخر میں اس خندق کیلئے جو دلوں کو دلوں سے جدا کرتی ہے۔قطرہ قطرہ کر کے جب اس نے اپنی زندگی کا سارا حساب چکا دیا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس صرف یہی آدھ گھنٹہ بچا ہے جو مکمل طور پر اس کا اپنا تھا۔

مگر آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔وہ تو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔اس عرصے میں وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان سے گلے مل سکتا ہے۔زمین پر کھلے ہوئے بسنتی پھولوں کو سونگھ سکتا ہے۔ہوا میں اڑتی ہوئی نازک بدن ابابیل اور زمین پر چلتی ہوئی کنواری ندی کو دیکھ سکتا ہے۔اس آدھے گھنٹے میں وہ ایک پوری زندگی گزار سکتا ہے۔آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔

اور جب اس نے یوں محسوس کیا تو ایسا لگا جیسے وہ ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔

یکا یک اس کے سارے جسم سے درد نکل گیا۔اس نے اپنے آپ کو بالکل ایک نوزائیدہ بچے کی طرح ہلکا پھلکا اور معصوم محسوس کیا۔یکا یک اس کا جی چاہا کہ وہ بانہیں پھیلا کر زور سے قہقہہ لگائے۔ایسا خوش نصیب آدھ گھنٹہ کس کی زندگی میں آیا تھا۔شروع سے آخر تک اس کا اپنا،اس کے آغاز سے انجام تک مکمل باخبر۔اس آدھ گھنٹہ میں وہ اپنی تقدیر پر پوری طرح قادر تھا۔وہ اس آدھے گھنٹے کا خدا تھا۔

مسرت کی ایک لہر اس کے دل میں دوڑ گئی۔اس نے بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں پسار دیں۔اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور دونوں آنکھیں بند کر کے موگری کے بھائیوں کا انتظار کرنے لگا۔

◆◆◆

کالو بھنگی

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رک گیا کہ کالو بھنگی کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے، سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو درکنار، کوئی سیدھا سادا افسانہ، بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں لکھا جا سکتا، کالو بھنگی کے متعلق پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں کالو بھنگی آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے مسکرا کے پوچھتا ہے ''چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟...... کتنے سال ہو گئے تمہیں لکھتے ہوئے؟''

''کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟''

''ساٹھ اور دو باسٹھ''

''مجھ میں کیا برائی ہے چھوٹے صاحب۔ تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ذہن کے ایک کونے میں مدت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب، میں تو تمہارا پرانا حلال خور ہوں۔ کالو بھنگی، آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟''

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے کالو بھنگی کی کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا اس کے متعلق۔ یہ نہیں کہ میں اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل میں کالو بھنگی کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اس لئے آج تک کالو بھنگی اپنی پرانی جھاڑو لئے، اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لئے اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدہیبت پاؤں لئے، اپنی سوکھی ٹانگوں میں ابھری وریدیں لئے، اپنے کولہوں کی ابھری ابھری ہڈیاں لئے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لئے اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گرد آلود بالوں کی جھاڑیاں لئے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پھیلے پھیلے نتھنوں، جھریوں والے گال اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اوپر ننگی چندیا ابھرے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر، اپنی اہمیت جتا کر اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کر کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے اس ذہن کے رنگ و روغن سے آشنا ہوئے اس کی چار دیواری میں اپنے دیئے جلا کر چلے گئے لیکن کالو بھنگی بدستور اپنی جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔ اس نے اس گھر کے اندر آنے والے ہر کردار کو دیکھا ہے، اسے روتے ہوئے، گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے، جاگتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے، زندگی کے ہر رنگ میں، ہر نہج سے، ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک، اس نے ہر اجنبی کو اس کے گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کیلئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح ہٹ کر کھڑا ہو گیا ہے حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے، حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن کالو بھنگی اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے آگے بڑھا لیا ہے اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے تاکہ میں اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں گا

اس کے بارے میں، لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں، اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے، آج اسے بھی الوداع کہہ دیں۔

میں سات برس کا تھا جب میں نے کالو بھنگی کو پہلی بار دیکھا، اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اسی حالت میں دیکھا۔ کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑوں جو ایسا معلوم ہوتا تھا، ماں کے پیٹ سے اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ کالو بھنگی کی جھاڑو اس کے جسم کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز مریضوں کا بول و براز صاف کرتا تھا، ڈسپنسری میں فنائل چھڑکتا تھا پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں کی صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کیلئے جنگل لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی اپنے واپس ہسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کر اپنا کھانا تیار کرتا اور اسے کھا کر سو جاتا۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا...... ہر روز، بلا ناغہ...... اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کیلئے بھی بیمار نہیں ہوا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کیلئے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لئے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لئے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ درحالیکہ اس میں کوئی ایسی بات ہی نہیں جس کیلئے اس کے متعلق اتنی سر دردی مول لی جائے۔ مگر کیا کیا جائے کالو بھنگی کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ خواہش ہے، ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے، ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں جو دلچسپ ہو، کوئی کونہ ایسا نہیں جو تاریک ہو، کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو، ہاں آٹھ سال سے متواتر میرے ذہن میں کھڑا ہے نہ جانے کیوں۔ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا اور حسن اور حیوان کی

بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں تھا جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غربت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ صم بکم مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ لہٰذا اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی، میٹھی کہانی بھی سن لیجئے تاکہ یہ یہاں سے دور دفان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے اور اگر آج بھی میں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔ کالو بھنگی کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آتے تھے۔ اسی طرح، اسی حالت میں۔ پھر کالو بھنگی نے شادی نہ کی تھی، اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا، اس نے کبھی دور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں کالو بھنگی میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر کھلی دھوپ میں وہ ہسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈ پر اکڑوں بیٹھا ہے اور ایک گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار، اور وہ وہیں اپنا سر چٹوا تا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز حسن کا گمان ہونے لگتا تھا، میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ

جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور کالو بھنگی کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی، اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی، اسے گویا سہلاتی ہوئی کسر کسر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنے سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد صاحب نے مجھے وہ پیٹا، وہ پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب کالو بھنگی کو وہ پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ کالو بھنگی کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن کالو بھنگی کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز وہ بدستور جھاڑو دینے کیلئے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر ان چھڑکتی تھی اور کمپونڈر صاحب کی بکری بھی، حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے، عورت سے بھی بڑھ کے لیکن کالو بھنگی کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارہ کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو کالو بھنگی......اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی۔ وہ اس کے ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں۔ جنگل میں، راستے میں وہ انہیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے۔ گویا تین دوست سیر کرنے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کر منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ......توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کئے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی، کبھی غرا کر کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے، پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے

چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا منا چشمہ، تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے کیونکہ بے چارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کر دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور چہرے کے ہر اتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لئے سوزن کاری میں مصروف ہے اور یا کالو بھنگی کا سویٹر بن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا، جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اسلئے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا اور کبھی تو صابن سے اسے نہلاتا، کبھی اس کی چچڑیاں دور کرتا۔ اس کے زخموں پر مرہم لگاتا، اسے مکی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے ملتا۔ دوپہر کو اور شام کو اور کھانا کھا کے اور زخموں پر مرہم لگوا کر پھر گھومنے کیلئے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی، اور بڑی دلچسپ، مجھے تو کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اسے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔

اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا آ جاتا تو وہ اسے اٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا کہیں کوئی نیولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، رسنگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ محی، ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکرا تائن سے بھی بڑا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے

جیسے سات برس کے بچے کی نظروں میں تو وہ مجھے اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکی کا بھٹا ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اسے اس طرح مدھم آنچ پر بھونتا تھا کہ مکی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزا دیتا اور خوشبو بھی ایسی سوندھی، میٹھی میٹھی، جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر اسے بھونتا تھا جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا تھا۔ ایک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا، اتنی نرمی اور مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا گویا وہ بھٹا اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا اور لوگ بھی بھٹا بھونتے تھے، مگر وہ بات کہاں۔ اس قدر کچے، بے ذائقہ اور معمولی سے بھٹے ہوتے تھے وہ کہ انہیں بس مکی کا بھٹا ہی کہا جا سکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کر وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا اور جب وہ آگ پر سینک کے بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل اک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو بھنگی اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انہیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کے کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ بری طرح۔ بچارا کالو بھنگی بھی پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے میں جھاڑو لئے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آ رہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لئے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعہ کیلئے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کیلئے فاؤنٹین پن اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

''کالو بھنگی تمہاری زندگی میں کوئی خاص بات؟''

''کوئی خاص بات، عجیب انوکھی، نئی''

''نہیں چھوٹے صاحب'' (یہاں تک تو مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلئے، ممکن ہے......)

''اچھا تم یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟'' ہم نے دوسرا سوال کیا۔

''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں'' ...... وہ سوچنے لگا۔ آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے، پھر وہ انگلیاں پر گننے لگتا ہے...... ''چار روپے کا آٹا لاتا ہوں......ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ کتنے روپے ہو گئے، چھوٹے صاحب؟''

''سات روپے''

''ہاں سات روپے۔ ہر مہینے ایک روپیہ بنئے کو دیتا ہوں، اس سے کپڑے سلوانے کیلئے روپے کرج لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑیں تو چاہئیں اور چھوٹے صاحب، کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ میں بڑھا دیں تو مجا آ جائے''

''وہ کیسے؟''

''گھی لاؤں گا ایک روپے کا، مکی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے''

اب بولئے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی، جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے اس وقت بھی کہیں کہیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کر اس کے پاس جاتا۔

''کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟''

''نہیں چھوٹے صاحب''۔

''کیوں؟''

''اس علاقے میں میں ہی ایک بھنگی ہوں اور دور دور تک کوئی بھنگی نہیں ہے چھوٹے صاحب۔ پھر ہماری شادی کیسے ہوسکتی ہے'' (لیجئے یہ راستہ بھی بند ہوا)

''تمہارا جی نہیں چاہتا کالو بھنگی؟'' میں نے دوبارہ کوشش کرکے کچھ کریدنا چاہا۔

''کیا صاحب؟''

''عشق کرنے کیلئے جی چاہتا ہے تمہارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہوگی تم نے جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی''۔

''عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟''

''عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ''

''عشق کیسے ہوتے ہیں صاحب شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ۔ بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب، مگر ہم نے نہیں سنا وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات، وہ میں نے آپ کو بتادی۔ شادی کیوں نہیں کی میں نے، کیسے ہوتی شادی میری، آپ بتایئے؟''......(ہم کیا بتائیں خاک)

''تمہیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟''

''کس بات کا افسوس؟ چھوٹے صاحب''

میں نے ہار کر، اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اٹھا۔ اسے ہسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا۔ کمپونڈر دور سے اس کے حلق میں دوا انڈیل دیتا اور ایک چپڑاسی اس کیلئے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا، اپنا بستر خود ٹھیک کرتا، اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اس کی لاش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ وہ ہمارے ہاں

بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتہ دار تھوڑی تھے، اس لئے اس کی آخری تنخواہ بھی بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ کیونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی ہسپتال کھلا، ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے، کمپونڈر نے تیار کئے، مریضوں نے دوالی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح ہسپتال بھی بند ہوا اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا، ریڈیو سنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے از راہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کی گائے نے اور کمپونڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے باہر چلاتی رہیں۔ جانوروں کی ذات ہے نا آخر۔

''ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا دے''

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی، اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا، وہ سب کچھ جو میں تمہاری بابت جانتا ہوں اب بھی یہیں کھڑے ہو، پریشان کر رہے ہو، للہ چلے جاؤ، کیا مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے؟ کوئی بھول ہوگئی ہے۔ تمہارا نام۔ کالو بھنگی، کام، بھنگی۔ اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے، شادی نہیں کی، عشق نہیں لڑایا، زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی۔ کوئی اچنبھا معجزہ نہیں ہوا جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا، اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے، غالب کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمہاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں اور کیا لکھوں؟ تمہاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، ایک روپیہ بنئے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے، مگر آٹھ روپے میں کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس پچاس سو میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہوسکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمہارے بارے میں اب خلجی ہی کو لو۔ ہسپتال میں کمپونڈر ہے بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے جنہوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپونڈری کا امتحان پاس کیا۔ وہ جوان ہے۔

اس کے چہرے پر رنگت ہے، یہ جوانی یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے، قمیض پر کلف لگا سکتا ہے۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کیلئے ایک چھوٹا سا بنگلہ نما کواٹر بھی دے رکھا ہے، ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضاؤں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمہیں یاد ہوگا۔ نوراں نھیا سے آئی تھی، سولہ سترہ برس کی الہڑ جوانی، چار کوس سے سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آجاتی تھی۔ بڑی بیوقوف تھی۔ وہ اپنے گاؤں کے دو جوانوں کا عشق قبول کئے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آجاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ بالکل واضح قاطع، یقینی امر سمجھتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ عشق بڑا متذبذب، غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اس سے بھی ہے، اس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گرگٹی، ہنگامی کہ ادھر نظر چوکی ادھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے اسی لئے نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔

اس کا دل نمبردار کے بیٹے کیلئے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کیلئے بھی، اس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کیلئے بیتاب ہو اٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو، چاروں طرف لہریں ہوں اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو، اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے چپّی چلتی تھم جائے اور سانس رُکتے رُکتے رُک سی جائے اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زُلفیں بکھرتی بکھرتی بکھر سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم دیں، اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے...... پٹواری کے بیٹے کو دیکھنے سے ایسی حالت ہوتی تھی نوراں کی، اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی...... نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا،

پٹواری کا بیٹا، نمبر دار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی، دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر مرمٹی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انہیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبر دار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور چھری سے اسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آ گئے، اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی، اور نوراں کے پاؤں پر زخم آ گئے مگر وہ بچ گئی کیونکہ وہ بروقت ہسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر ہسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں......خوبصورتی دلوں پر اثر کرتی ہے انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا۔ کمپونڈر پر زیادہ تھا۔ نوراں کی تیمارداری میں خلجی دل و جان سے لگا رہا۔ نوراں سے پہلے بیگماں، بیگماں سے پہلے ریشماں اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیونکہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھے اور خاندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کی خواہش کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق کیا، ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا تھا، ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بہت محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کر منہ اندھیرے جنگل کی طرف چلا جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لئے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمارداری، لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کر چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو اس نے چلتے وقت خلجی کے دیئے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگائے، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کے رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے

وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا لیکن خلجی کیلئے نہ ریشماں رکی، نہ بیگماں، نہ جانکی اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی چلی جاتی تھی۔ شروع شروع میں نوراں کی حالت غیر تھی۔ اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی، سڑاند دور ہوتی گئی، سوجن غائب ہوتی گئی، نوراں کی آنکھوں اور اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آ گئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اتاری تو نوراں بے اختیار ایک اظہار تشکر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اتری تو اس نے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر، اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور بالوں کی زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔ نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کیلئے اس سے معافی مانگنے کیلئے، اس سے شادی کا پیمان کرنے کیلئے ہسپتال آئے تھے، اور نوراں انہیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی، کانپنے لگتی، مڑ مڑ کے دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تلک وہ لوگ چلے نہ جاتے، اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا، اور جب وہ بالکل اچھی ہو گئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کیلئے امڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کی مہربانی سے، اور نوراں کے ماں باپ بچھے جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی اور دونوں خردماغ لڑکے بھی جواب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کئے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی...... سارا گاؤں اسے لینے کیلئے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے پیچھے نمبردار کے بیٹے اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم، اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے، خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی گرد و غبار سے اٹی رہ گذر چھوڑ گئے۔

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت رومانی زندگی تھی خلجی کی، خلجی جو مڈل پاس تھا، بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا، پندرہ بیس اوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا، جو محبت کرتا تھا، جو اک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا، جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پر کیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ

1۔ کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

2۔ کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

3۔ کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

4۔ کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو مکی کے بھٹے کھلاتا تھا۔

5۔ کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا اور آتش دان میں لکڑیاں جلاتا رہا تا کہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

6۔ کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اٹھاتا رہا، تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا، اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کیلئے حیران ہو جاتا پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ ہسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمہارے بارے میں کالو بھنگی، سب کچھ تو کہہ دیا، جو کچھ کہنا تھا، جو کچھ تم کہہ رہے ہو، تمہاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی، تم مڈل پاس یا فیل ہوتے، تمہیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانی مسرت اور اس مسرت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمہارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمہارے آٹھ روپے میں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ

روپوں کو الٹ پھیر کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، سات روپے، اور ایک روپیہ بنئے کا۔ آٹھ روپے ہو گئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمہاری کالو بھنگی، تمہارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ، دیکھوں میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنس ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید اب تیرے لئے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اترنا پڑے گا اور بخت یار چپڑاسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بخت یار چپڑاسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیڑ کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے، جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کرم کلہ ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور بڑی الین اور کدو جو گرمیوں کی دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مر جاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بخت یار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔ بخت یار کے تین بچے ہیں، اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے، ایک دفعہ بخت یار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی، اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا، اور پالے کے مارے دانت بج رہے تھے، اور گھر سے بخت یار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بخت یار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کیلئے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں سے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بخت یار کی بیوی جو اب اپنے کئے پر پشیمان تھی اپنی ساس کو اونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں تلے چیل کے خشک

جھومر پھسلے جاتے تھے، پھر بارش شروع ہوگئی پھر کریٹری پڑنے لگی اور پھر چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی، اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو، برف کے گالے زمین پر گرتے گئے، ساکن، خاموش، بے آواز، سپید، مخمل، گھاٹیوں، وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

''اماں......'' بخت یار کی بیوی زور سے چلائی۔

''اماں......'' بخت یار چلایا۔

''اماں......'' کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج کے خاموش ہوگیا۔

پھر کالو بھنگی نے کہا......''میرا خیال ہے وہ نکر گئی ہوگی، تمہارے ماموں کے پاس''۔

نکر کے دو کوس ادھر انہیں بخت یار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی، پڑتی، لڑھکتی، تھمتی، ہانپتی، کانپتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بخت یار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کیلئے مزاحت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہو گئی اور بخت یار کی بیوی نے اسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری اٹھاتے چلے آئے۔ بخت یار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ واپس گھر پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اور انہیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے اور کالو بھنگی ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور اپنا سر کھجانے لگا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بخت یار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں، چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے، مگر کالو بھنگی میں تمہارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں ہسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں لیکن تمہارے متعلق اتنا کچھ کر دینے کے بعد بھی سمجھ نہیں آتا کہ تمہارا کیا کیا جائے۔ خدا کیلئے اب تو چلے جاؤ، بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لئے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی

سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں لیکن ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں، سن، تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے ان سے غلاظت دور کرے، ان کی بیائیوں پر مرہم لگائے، تو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے، تیرے پیٹ کی مرجھائی ہوئی سلوٹیں غائب ہو جائیں، تیرے کمزور سینے کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے بال غائب ہو جائیں، تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رس ڈال دے انہیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک ڈال دے، تیرے گالوں میں لہو بھر دے، تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زلفیں عطا کرے، تجھے ایک مصفا لباس دے دے، تیرے اردگرد ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کر دے، حسین، مصفا، پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے، تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں، جو کچھ تو چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لئے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے جس محبت و شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے تو اپنے ذہن کی پہنائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے، جو ابھی نہیں آیا، جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے ایک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گودیوں میں کھلایا ہے، اس کا منہ چوما ہے، اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر جہان بھر میں گھمایا ہے۔ دیکھ لو یہ ہے میرا بیٹا...... یہ ہے میرا بیٹا، اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں، ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ...... آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی لیکن ہو نہ سکی کیونکہ میں افسانہ نگار ہوں، میں اک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ اس کیلئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کیلئے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا اور ڈاکٹر اور کمپونڈر اور بخت یار اور گاؤں کے

پٹواری اور نمبر دار اور دوکاندار اور حاکم اور سیاستدان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی لاکھوں، کروڑوں، اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں، کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہو گا، اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا جس میں انسانی روح کی مکمل مسرت جھلک اٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی بلندیاں چھو لے، اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت جھلک جائے۔

یہ بھرپور زندگی ممکن ہے جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے۔

اچھا ہے کھڑا رہ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا دے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس قزح کے اس پار لے جائے۔

◆◆◆

تائی ایسری

میں گرانٹ میڈیکل کالج کلکتہ میں ڈاکٹری کا فائنل کورس کر رہا تھا۔ اور اپنے بڑے بھائی کی شادی پر چند روز کیلئے لاہور آ گیا تھا۔ یہیں شاہی محلے کے قریب کوچہ ٹھاکر داس میں جہاں ہمارا آبائی گھر تھا۔ میری ملاقات پہلی بار تائی ایسری سے ہوئی۔

تائی ایسری ہماری سگی تائی تو نہ تھی۔ لیکن ایسی تھیں کہ انہیں دیکھ کر ہر ایک کا جی انہیں تائی کہنے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا۔ محلے کے باہر جب ان کا تانگہ آ کے رکا اور کسی نے۔ ''لو تائی ایسری آ گئی''، تو بہت سے بڑھے جوان مرد اور عورتیں انہیں لینے کیلئے دوڑے۔ دو تین نے سہارا دے کر تائی ایسری کو تانگے سے نیچے اتارا۔ کیونکہ تائی ایسری فربہ اندام تھی۔ اور چلنے سے یا باتیں کرنے سے یا محض کسی کو دیکھنے ہی سے ان کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ دو تین رشتے داروں نے یکبارگی اپنی جیب سے تانگے کے کرائے کے پیسے نکالے۔ مگر تائی ایسری نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں میں ہنس کر سب سے کہہ دیا کہ وہ تو پہلے ہی تانگے والے کو کرایے کے پیسے دے چکی ہیں اور جب وہ یوں اپنی پھولی سانسوں کے درمیان باتیں کرتے کرتے ہنسیں تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئیں۔ دو تین رشتے داروں کا چہرہ اتر گیا اور انہوں نے اپنے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم نے کیا کیا تائی؟ ہمیں اتنی سی خدمت کا موقعہ بھی نہیں دیتی ہو'' اس پر تائی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ انہوں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت سے پکھی

لے لی اور اسے جھلتے ہوئے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

تائی ایسری کی عمر ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی۔ ان کے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ ان کے بھرے بھرے گول مٹول گندمی چہرے پر بہت اچھے لگتے تھے۔ ان کا پھولی پھولی سانسوں میں معصوم باتیں کرنا تو سب کو اچھا لگتا ہی تھا لیکن مجھے ان کے چہرے میں ان کی آنکھیں بڑی غیر معمولی نظر آئیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ دھرتی کا خیال آیا ہے۔ میلوں دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا خیال آیا ہے۔ کسی بڑی اور گہری دریائی بسیط چادر آب کا خیال آیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ ان آنکھوں کے اندر جو محبت ہے اس کا کوئی کنارہ نہیں، جو معصومیت ہے، اس کی کوئی تھاہ نہیں۔ جو درد ہے اس کا کوئی درماں نہیں۔

میں نے آج تک ایسی آنکھیں کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھیں۔ جو اس قدر وسیع اور بے کنار ہوں، کہ زندگی کا بڑے سے بڑا اور تلخ سے تلخ تجربہ بھی ان کیلئے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ رکھے۔ ایسی آنکھیں جو اپنی پہنائیوں میں سب کچھ بہا لے جائیں۔ ایسی انوکھی، معاف کردینے والی، درگزر کردینے والی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں۔

تائی ایسری نے کاسنی شاہی کا گھاگھرا پہن رکھا تھا جس پر سنہری گوٹے کا لہریہ چمک رہا تھا۔ ان کی قمیض بسنتی ریشم کی تھی۔ جس پر زری کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر دوہری ململ کا قرمزی دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں میں سونے کے گوکھرو تھے۔ جب وہ گھر کے دالان میں داخل ہوئیں تو چاروں طرف شور مچ گیا۔ بہوئیں اور خالائیں اور نندیں اور بھاوجیں، موسیاں اور چچیاں سب تائی ایسری کے پاؤں چھونے کو دوڑیں۔ ایک عورت نے جلدی سے ایک رنگین پیڑھی کھینچ کر تائی ایسری کیلئے رکھ دی اور تائی ایسری ہنستے ہوئے اس پر بیٹھ گئیں۔ اور باری باری سے سب کو گلے لگا کر سب کے سر پر ہاتھ پھیر کر سب کو دعا دینے لگیں۔

اور ان کے قریب ہیرو مہری کی بیٹی سوتری خوشی سے اپنی باچھیں کھلائے زور زور سے پنکھا جھل رہی تھی۔ تائی ایسری گھر سے رنگین پچھی کی ایک ٹوکری لے کر آئی تھی۔ جو ان کے

قدموں میں ان کی پڑھی کے پاس ہی پڑی تھی۔ وہ باری باری سے سب کو دعائیں دیتی جاتیں اور پچھی والی ٹوکری کھول کر اس میں سے ایک چونی نکال کر دیتی جاتی۔ کوئی ایک سو چونیاں انہوں نے اگلے بیس منٹ میں بانٹ دی ہوں گی۔ جب سب عورتیں اور مرد، لڑکے اور بچے بالے انکے پاؤں چھوکر اپنی اپنی چونی لے چکے۔ تو انہوں نے اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے پنکھا جھلنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اور اس سے پوچھا۔

''تو کون ہے؟''

''میں سوتری ہوں'' بچی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

''آئے ہائے تو جے کشن کی لڑکی ہے؟ میں تو بھول ہی گئی تھی تجھے۔ آجا گلے سے لگ جا......''

تائی ایسری نے اسے گلے سے لگا لیا۔ بلکہ اس کا منہ بھی چوم لیا۔ اور جب انہوں نے اسے اپنی پچھی والی ٹوکری سے نکال کر چونی دی۔ تو گھر کی ساری عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اور موسی کرتارو اپنی نیلم کی انگوٹھی والی انگلی نچا کر بولی۔ ''تائی یہ تو جے کشن کی بیٹی سوتری نہیں ہے۔ یہ تو ہیرو مہری کی بیٹی سوتری ہے''۔

''ہائے میں مرگئی'' تائی ایسری ایکدم گھبرا کر بولیں۔ اور ان کی سانس پھول گئی۔

''ہائے اب تو مجھے نہانا پڑے گا میں نے تو اس کا منہ بھی چوم لیا۔ اب کیا کروں؟''

تائی ایسری نے اپنی بڑی بڑی حیران نگاہوں سے مہری کی بیٹی سوتری کی طرف دیکھا۔ جواب اس طرح دھتکارے جانے پر سسکنے لگی تھی۔ یکا یک تائی کو اس پر رحم آ گیا۔ انہوں نے پھر اسے بانہہ سے پکڑ کر چمٹا لیا...... ''ناں! ناں! تو کیوں روتی ہے۔ تو تو انجان ہے۔ تو تو دیوی ہے۔ تو تو کنواری ہے۔ تیرے من میں تو پرمیشر بستے ہیں۔ تو کیوں روتی ہے۔ مجھے تو اپنے دھرم کے کارن نہانا پڑے گا۔ پر تو کیوں روتی ہے۔ لے ایک چونی اور لے......''

تائی ایسری نے دوسری چونی دی۔ دوسری چونی پا کر مہری کی بیٹی سوتری اپنے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔ تائی ایسری نے ایک بازو اٹھا کر پرے دالان میں گزرتی ہوئی ہیرو مہری کو

دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

''نی ہیرو۔ میرے اشنان کیلئے پانی رکھ دے۔ تجھے بھی ایک چونی دوں گی''

اس پر ساری محفل پھر لوٹ پوٹ ہوگئی۔

تائی ایسری کو کئی لوگ چونی والی تائی کہتے تھے۔ کئی لوگ کنواری تائی کہتے تھے۔ کیونکہ یہ بھی مشہور تھا کہ جس دن سے تایا یودھ راج نے تائی ایسری سے شادی کی تھی۔ اس دن سے آج تک وہ کنواری کی کنواری چلی آ رہی تھیں۔ کیونکہ سنانے والے تو یہ بھی سناتے ہیں کہ تایا یودھ راج نے اپنی شادی سے پہلے جوانی میں اتنی خوبصورت عورت دیکھ ڈالی تھیں کہ جب ان کی شادی گاؤں کی اس سیدھی سادی لڑکی سے ہوئی تو شادی کے پہلے روز ہی وہ انہیں بالکل پسند نہ آئیں۔ جب سے انہوں نے شادی کر کے انہیں بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا مگر کسی طرح کی سختی نہیں کرتے تھے۔ تایا یودھ راج ہر ماہ پچھتر روپے اسے بھیج دیتے تھے۔ وہ گاؤں میں رہتی تھی۔ اپنے سسرال کے ہاں......اور سب کی خدمت کرتی تھیں۔ اور تایا یودھ راج جالندھر میں لوہے کا بیوپار کرتے تھے۔ اور کئی کئی سال اپنے گاؤں میں نہیں جاتے تھے۔ میکے والے نے کئی بار آ کر تائی کو لے جانا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ میکے والوں نے یہ بھی چاہا کہ ان کی شادی پھر سے کر دی جائے۔ مگر تائی اس کیلئے بھی راضی نہ ہوئیں۔ وہ ایسے انہماک سے اپنے سسرال کے لوگوں کی خدمت کرتی رہیں۔ کہ سسرال والے خود انہیں اپنی بیٹی اور بہو سے زیادہ چاہنے لگے۔ تایا یودھ راج کے باپ مالک چند نے تو اپنے گھر کی ساری چابیاں تائی ایسری کے سپرد کر دی تھیں۔ اور ساس بھی اس حد تک چاہنے لگی تھی کہ انہوں نے اپنے سارے گہنے پاتے نکال کر تائی ایسری کی تحویل میں دے دیئے تھے۔ ویسے بہت سی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی آتا ہے کہ جوانی میں یہ کیسی رہی ہوں گی؟ مگر تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی یہ خیال نہ آیا۔ ہمیشہ یہی خیال آتا کہ تائی ایسری شاید بچپن سے، بلکہ جنم ہی سے ایسی پیدا ہوئی ہوں گی۔ پیدا ہوتے ہی انہوں نے اپنی ماں کو ہاتھ پھیلا کر آشیرواد دی ہوگی اور شاید بڑے میٹھے مہربان لہجے میں یہ بھی کہا ہو...... تجھے میرے لئے بہت دکھ اٹھانے پڑے اس لئے یہ لو ایک چونی۔

شاید اس لئے اپنے شوہر سے بھی ان کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ تایا یودھ راج ہمارے رشتے داروں کی نظر میں شرابی کبابی اور رنڈی باز تھے۔ وہ لوہے کے بڑے بیوپاری تھے تو کیا ہوا۔ انہیں اس طرح سے تائی ایسری کی زندگی برباد کرنا نہ چاہیے۔ مگر جانے کیا بات تھی تائی ایسری کو قطعاً اپنی زندگی برباد ہونے کا کوئی غم نہ تھا۔ ان کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے انہیں اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ کسی نے ان کی زندگی برباد کی ہے...... ہر وقت ہنستی کھیلتی، باتیں کرتی، ہر ایک کے سکھ اور دکھ میں شامل ہونے اور خدمت کرنے کیلئے تیار نظر آتیں۔ یہ تو بالکل ناممکن تھا کہ پڑوس میں کسی کے ہاں خوشی ہو اور وہ اس میں شریک نہ ہوں۔ کسی کے ہاں کوئی غم ہو اور وہ اس میں حصہ نہ بٹائیں۔ تائی ایسری کے شوہر امیر تھے مگر وہ خود تو امیر نہ تھیں۔ پچھتر روپے جو انہیں ماہوار ملتے تھے وہ انہیں ہمیشہ دوسروں پر خرچ کر دیتی تھیں۔ مگر وہ سستے زمانے کے پچھتر روپے تھے اسی لئے بہت سے لوگوں کے دکھ درد دور ہو جاتے تھے۔ مگر لوگ ان سے ان کی وقت بے وقت کی مدد کی وجہ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی بہت سے موقعے آتے تھے جب تائی ایسری کی جیب میں ایک چھدام تک نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی لوگ بے مزہ نہ ہوئے۔ بلکہ یہی کہتے سنے گئے کہ تائی ایسری کے تو چرن چھو لینے ہی سے دل کو شانتی مل جاتی ہے۔

مگر جتنی اچھی تائی ایسری تھیں، تایا یودھ راج اتنے ہی برے تھے۔ تیس برس تک تو انہوں نے تائی ایسری کو اپنے ماں باپ کے گھر گاؤں ہی میں رکھا۔ اور جب ان کے ماں اور باپ دونوں ہی مر گئے اور گھر خالی ہو گیا، گھر کے دوسرے افراد بڑے ہو گئے، اور شادیاں کر کے اور اپنے گھر بسا کے دوسری جگہوں پر چلے گئے تو انہیں بادل نخواستہ تائی ایسری کو بھی جالندھر بلوانا پڑا۔ مگر یہاں تائی ایسری چند دنوں سے زیادہ نہ رہ سکیں کیونکہ پکا باغ کے معزز پٹھانوں کی ایک لڑکی سے تایا یودھ راج نے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجے میں انہیں جالندھر سے بھاگ کر لاہور آنا پڑا۔ کیونکہ پکا باغ کے پٹھانوں نے آ کر تائی ایسری سے کہہ دیا تھا کہ صرف تمہاری وجہ سے ہم نے اسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر

والے کو لے کر کہیں چلی جاؤ۔ ورنہ ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ اور تائی ایسری اس واقعہ کے چند روز بعد ہی تایا کو لے کر لاہور آ گئیں۔ محلّہ ونجاراں میں انہوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے یہاں بھی تایا یودھ راج کا بیوپار چند مہینوں ہی میں چمک گیا۔ اسی اثنا میں انہوں نے شاہی محلے کی ایک طوائف چھمی سے دوستی کر لی اور ہوتے ہوتے یہ قصہ یہاں تک بڑھا کہ اب انہوں نے مستقل طور پر اسی چھمی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا۔ اور محلّہ ونجاراں میں قدم تک نہ دھرتے تھے۔ لیکن تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں اس امر کا اتنا سا بھی ملال ہوا ہوگا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب تایا یودھ راج اور اسی طوائف کا قصہ زوروں پر تھا۔ انہی دنوں ہمارے بڑے بھائی صاحب کی شادی ہوئی۔ شادی میں تایا یودھ راج تو شریک نہ ہوئے۔ لیکن تائی نے رشتے داروں، مہمانوں اور برات کی خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیا۔ ان کی خوش مزاجی سے پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سلجھ گئیں۔ چہرے پر چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں۔ اور جبینیں شکنوں سے صاف اور منور ہو گئیں۔ اس میں تائی کی کاوش کو کوئی دخل نہ تھا۔ سکون کی شعاعیں گویا خود بخود ان کے جسم سے پھوٹتی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی ہر ایک کا غصہ اتر جاتا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ الجھنیں خود بخود سلجھ جاتیں۔ گھر بھر میں بشاشت بکھر جاتی۔ ایسی تھیں تائی ایسری۔

میں نے تائی ایسری کو کبھی کسی کی برائی کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی قسمت کا گلہ کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی رنجور یا اداس نہیں دیکھا۔ ہاں ایک بار ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی اور وہ واقعہ بھی اسی شادی سے متعلق ہے۔

بڑے بھائی صاحب تو رات بھر شادی کی بیدی پر بیٹھے رہے۔ صبح کے پانچ بجے شادی کے بعد لڑکی والوں نے اپنے گھر کے ہال کو جہیز کا سامان دکھانے کیلئے سجا دیا۔ پرانے زمانے تھے وہ۔ اس زمانوں میں صوفوں کے بجائے رنگین پیڑھیاں دی جاتی تھیں۔ اور منقش پایوں والے پلنگ دیئے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ڈرائینگ روم کو بیٹھک یا دیوان خانہ کہا

جاتا تھا۔ میرے بڑے بھائی کے سسر ملٹری میں ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ چونکہ وہ پہلے ہندوستانی ایگزیکٹو آفیسر تھے۔ اس لئے انہوں نے جہیز میں بہت کچھ دیا تھا۔ اور ساری ہی نئے فیشن کی چیزیں دی تھیں۔ ہماری برادری میں پہلی بار جہیز میں صوفہ سیٹ دیا گیا۔ ساری برادری میں اس صوفہ سیٹ کی دھوم مچ گئی۔ دور دور سے محلوں سے بھی عورتیں ''انگریجی پیڑھیوں'' کو دیکھنے کیلئے آنے لگیں۔ تائی ایسری کیلئے بھی صوفہ سیٹ دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ پہلے تو بڑی حیرانی سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس پر ہاتھ پھیر کر بار بار من ہی من میں کچھ بڑبڑاتی رہیں۔ آخر ان سے رہا نہ گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

''وے کاکا۔ اسکو صوفہ سیٹ کیوں بولتے ہیں؟''

اب میں اس کا جواب کیا دیتا۔ سر ہلا کر کہنے لگا۔

''مجھے نہیں معلوم تائی''

''اچھا تو اس کی دو کرسیاں چھوٹی کیوں ہیں۔ اور وہ تیسری کرسی لمبی کیوں ہے؟''

میں پھر لاجواب ہوگیا۔ خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

تائی دیر تک سوچتی رہیں۔ پھر یکایک جیسے ان کی سمجھ میں آ گیا۔ ان کا چہرہ ان کی معصوم سی مسکراہٹ سے روشن ہو اٹھا۔ بولیں۔ ''میں بتاؤں؟''

میں نے کہا ''بتاؤ تائی''

وہ ہم سب کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولیں...... ''دیکھو۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ لمبا صوفہ تو اس لئے بنا ہے کہ جب دونوں میاں بیوی میں صلح ہو تو وہ دونوں اس لمبے صوفے پر بیٹھیں۔ اور جب ان دونوں میں لڑائی ہو تو الگ الگ ان دو چھوٹے چھوٹے صوفوں پر بیٹھیں۔ سچ مچ یہ انگریج بڑے عقلمند ہوتے ہیں۔ جبھی تو ہم پر حکومت کرتے ہیں''۔

تائی کی دلیل سن کر محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ مگر میں نے دیکھا۔ کہ تائی یہ سوچ کر اور بات کہہ کر کچھ چپ سی رہ گئیں۔ کیا اس وقت انہیں اپنا اور اپنے خاوند کا جھگڑا یاد آیا تھا؟ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

میں نے جب غور سے ان کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک پل کیلئے مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا ہو۔

(2)

کلکتے سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں نے وہیں ایک بنگالی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور دھرم تلے میں پریکٹس کرنے لگا۔ کئی سال کوشش کرتا رہا مگر پریکٹس نہ چلی۔ چنانچہ اپنے بڑے بھائی صاحب کے اصرار پر لاہور چلا آیا۔ بھائی صاحب نے کوچہ ٹھاکر داس کے نکڑ پر مجھے دکان کھول دی اور میں اپنے گھر میں یعنی اپنے محلے میں، اپنی برادری ہی کے سہارے پریکٹس چلانے لگا۔ کلکتے میں میں بالکل اناڑی تھا، نوجوان تھا اور زندگی کا تجربہ بھی نہ تھا۔ یہاں آ کر جب آٹھ دس برسوں میں گاہک کو پھانسنے کی ترکیب سمجھ میں آئی تو پریکٹس خود بخود چل نکلی۔ اب دن رات مصروف رہتا تھا۔ بچے بھی ہو گئے تھے۔ اس لئے زندگی سوت کی انٹی کی طرح ایک ہی مدار پر چکر کھانے لگی۔ ادھر ادھر جانے کا موقعہ کم ملتا تھا۔ اب تو کئی برس سے تائی ایسری کا منہ نہ دیکھا تھا۔ مگر اتنا سن رکھا تھا کہ تائی ایسری اسی مکان میں محلّہ ونجاراں میں رہتی ہیں اور تایا یودھ راج شاہی محلے میں اسی چھجی کے مکان میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی دوسرے تیسرے مہینے تائی ایسری کی خبر لینے آ جاتے ہیں۔

ایک روز میں صبح کے وقت مریضوں کی بھیڑ میں بیٹھا نسخے تجویز کر رہا تھا کہ محلّہ و نجاراں کے ایک آدمی نے آ کر کہا ''جلدی چلئے۔ ڈاکٹر صاحب، تائی ایسری مر رہی ہیں''۔

میں اسی وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس آدمی کے ساتھ ہو لیا۔ محلّہ ونجاراں کے بالکل اس آخری سرے پر تائی کا مکان تھا۔ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر جب میں آہنی سلاخوں والے موکھے سے گزر کر ان کے نیم تاریک کمرے میں داخل ہوا تو وہ بڑے بڑے تکیوں کا سہارا لئے پلنگ سے لگی بیٹھی تھیں۔ ان کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور انہوں نے بڑے زور سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف گویا اپنے دل کو پکڑ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہی وہ پھولے پھولے سانسوں میں مسکرانے لگیں۔ بولی ''تو آ گیا پتر! اب میں بچ جاؤں گی''

''کیا تکلیف ہوگئی ہے تائی؟''

''ہوتا کیا۔ موت کا بلاوا آ گیا تھا۔ دو دن مجھے سخت کس رہی (بخار) پھر ایکا ایکی جسم ٹھنڈا ہونے لگا''۔ (بیان کرتے کرتے تائی کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے لگیں) پہلے ٹانگوں سے جان گئی۔ ٹانگوں کو ہاتھ لگاؤں تو ٹھنڈی یخ۔ چٹکی بھروں تو کچھ محسوس نہ ہو۔ پھر دھیرے دھیرے میری جان کمر سے بھی نکل گئی۔ اور جب میری جان اوپر سے بھی نکلنے لگی تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا''۔ تائی اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف اپنے دل والے حصے کو اور زور سے پکڑ کر بولیں)۔ ''تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا اور چلائی۔ ارے کوئی ہے۔ کوئی ہے جو جائے اور جے کشن کے بیٹے رادھا کشن کو بلا کر لائے۔ وہی مجھے ٹھیک کر سکتا ہے......اب تم آ گئے ہو اب......اب میں بچ جاؤں گی''......تائی ایسری نے مکمل طمانیت سے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ تائی کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تائی ذرا اپنا یہ ہاتھ ادھر کرو۔ تمہاری نبض تو دیکھوں؟''

ایکدم تائی دوسرے سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ ''ہائے وے! تم کیسے ڈاکٹر ہو؟ تجھے اتنا معلوم نہیں کہ اس ہاتھ سے تو میں نے اپنی جان پکڑ رکھی ہے۔ اس ہاتھ کی نبض تجھ کو کیسے دکھا سکتی ہوں''۔

تائی چند ہفتوں میں اچھی ہوگئیں۔ انہیں تو بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ جاتی رہی تو پھر اٹھ کر گھومنے لگیں۔ اور اپنے پرائے سب کے سکھ دکھ میں بدستور شریک ہونے لگیں۔ لیکن جب وہ اچھی ہوئیں تو اس کے چند ماہ بعد ہمارے تایا یودھ راج کا انتقال ہوا۔ وہیں پچھی کے گھر شاہی محلے میں ان کا ہارٹ فیل ہوا۔ وہیں سے ان کی ارتھی اٹھی۔ کیونکہ تائی نے ان کی لاش کو گھر لانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ تائی نہ ارتھی کے ساتھ گئیں نہ انہوں نے شمشان گھاٹ کا رخ کیا۔ نہ ان کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک نکلا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے اپنے سہاگ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ رنگین کپڑے اتار کر سپید دھوتی پہن لی۔ اور اپنے ماتھے کا

سیندور پونچھ کر چولھے کی راکھ اپنے ماتھے پر لگالی۔مگران کے دھرم کرم میں اور کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ بلکہ اپنے سفید بالوں سے وہ اب اس سفید دھوتی میں اور بھی اچھی لگ رہی تھیں۔تائی کی اس حرکت پر برادری میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔سب کو اچنبھا ہوا۔کچھ لوگوں نے برا بھی مانا۔مگر تائی کی عزت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کے سامنے زبان کھولنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔

چند برس اور گزر گئے۔ اب میری پریکٹس اس قدر چمک اٹھی تھی کہ میں محلّہ ٹھا کر داس میں دن کو بیٹھتا تھا اور شام کو وچھووالی میں۔زندگی کچھ اس نہج سے گزر رہی تھی کہ تائی ایسری کو دیکھے ہوئے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو برس گزر جاتے تھے۔مگر گھر کی عورتوں سے تائی ایسری کی خبر ملتی رہتی تھی۔تایا یودھ راج نے اپنے بینک کا سارا روپیہ لوچھمی کو سونپ دیا تھا مگر جالندھر کی دکان اور مکان تائی ایسری کے نام لکھ گئے تھے۔ان سے ہر ماہ تائی ایسری کو ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ کا آجاتا تھا۔وہ بدستور اسی محلّہ ونجاراں میں رہتی تھیں۔اور دن رات اپنے دھرم کرم میں ڈوبی رہتی تھیں۔

ایک روز اتفاق سے جب میں شاہی محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو مجھے تایا یودھ راج کی یاد آگئی۔اوران کی یاد سے لچھمی کی یاد آگئی۔کیونکہ لچھمی بھی تو اسی شاہی محلے میں کہیں رہتی تھی اور جب لچھمی کی یاد آئی تو میرا ذہن فوراً تائی ایسری کی طرف منتقل ہو گیا۔اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔غالباً بارہ پندرہ مہینوں سے میں تائی ایسری کی دیکھنے نہ گیا تھا۔ میں نے سوچا میں کل یا پرسوں پہلی فرصت ہی میں تائی ایسری کو دیکھنے جاؤں گا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاہی محلے کی ایک گلی سے میں نے تائی ایسری کو نکلتے دیکھا۔قرمزی شامی کی بجائے اب وہ سیاہ شامی کا گھاگھرا پہنے تھے۔جس پر نہ گوٹا تھا نہ لچکا۔ قمیض بھی سفید رنگ تھی اور سر پر انہوں نے سفید ململ کا دوہرا دوپٹہ لے رکھا تھا۔جس میں ان کا گول مٹول چہرہ بالکل میڈونا کی طرح معصوم اور پراسرار نظر آرہا تھا۔

جس لمحے میں نے انہیں دیکھا۔اسی لمحے انہوں نے بھی مجھے دیکھا۔اور مجھے دیکھتے ہی وہ شرما سی گئیں۔اور فوراً مجھ سے کترا کر واپس گلی میں جانے لگیں۔کہ میں نے انہیں فوراً

آواز دے دی۔ میری آواز میں ایک ایسی حیرت تھی جو ایک چیخ سے مشابہ تھی۔ یہ تائی ایسری یہاں طوائفوں کے محلے میں کیا کر رہی تھیں؟

''تائی ایسری'' میں نے چلا کر کہا۔ ''تائی ایسری! میں نے پھر آواز دی۔

میری آواز سن کر وہ پلٹ آئیں۔ سامنے آ کر ایک گناہ گار مجرم کی طرح کھڑی ہو گئیں، ان کی نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں۔

''تائی ایسری تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟'' میں نے کچھ حیرت سے کچھ غصے سے ان سے کہا۔

وہ اسی طرح سر نیچا کئے آہستہ آہستہ جھجکتے جھجکتے بولیں۔ ''وے پتر! کیا بتاؤں وہ......وہ...... میں نے......سنا تھا کہ بچھی بیمار ہے۔ بہت سخت بیمار ہے۔ میں نے سوچا۔ اسے دیکھ آؤں......''۔

''تم یہاں بچھی کو دیکھنے آئی تھیں؟'' میں نے غم اور غصے سے تقریباً چیخ کر کہا۔ ''بچھی کو......بچھی کو......اس بدذات چھنال کو؟......جس نے......جس نے......''۔

تائی ایسری نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور میں کہتے کہتے رک گیا......''ناں کاکا! اس کو کچھ نہ کہو...... کچھ نہ کہو......'' تائی ایسری نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ ''مرنے والے کی یہی ایک نشانی رہ گئی تھی۔ آج وہ بھی چل بسی۔

(3)

سن 47ء کے فسادات میں ہم لوگ لاہور چھوڑ کر جالندھر میں پناہ گزیں ہوئے کیونکہ یہاں پر تائی ایسری کا گھر تھا۔ خاصہ کھلا دو منزلہ گھر تھا۔ اوپر کی منزل انہوں نے اپنے رشتے دار پناہ گزینوں کو دے ڈالی تھی۔ نچلی منزل میں وہ خود رہتی تھیں۔ ہر روز وہ ریفیوجی کیمپوں میں سیوا کرنے جاتیں، اور کبھی کبھار دو ایک یتیم بچے اٹھا لاتیں۔ چار پانچ ماہ ہی میں انہوں نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ کیونکہ ان کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں

چلتا تھا۔ پچھواڑے کے آنگن اور سامنے کے دالان میں بھی انہوں نے مختلف پناہ گزینوں کو سونے اور کھانا پکانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہوتے ہوئے ایک اچھا خاصا گھر ایک سرائے میں تبدیل ہو گیا۔ مگر میں نے تائی ایسری کے ماتھے پر کبھی ایک شکن نہیں دیکھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی باہر سے اس طرح آتی تھی جیسے وہ گھر ان کا نہ ہو۔ ان پناہ گزینوں کا ہو جنہیں انہوں نے اپنے گھر میں رہنے کی خود اجازت دی تھی۔ عورتوں میں شخصی جائیداد کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ مگر میں نے عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی ایسا کوئی فرد مشکل ہی سے دیکھا ہو گا جسے تائی ایسری کی طرح شخصی جائیداد کا اس قدر کم احساس ہو۔ قدرت نے ان کے دماغ میں شاید یہ خانہ ہی خالی رکھا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے وقف تھا۔ جالندھر آ کر وہ صرف ایک وقت کھانا کھانے لگی تھیں۔ میں ان کی ان حرکتوں سے بہت چڑتا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنی قیمتی پریکٹس لاہور میں کھو دی تھی۔ میری ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بھی وہیں رہ گئی تھی۔ اور اب میرے پاس سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ میرے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے، نہ روپیہ پیسہ تھا، نہ کھانا پینا تک کا ہو سکتا تھا۔ جو ملا کھا لیا، جب ملا کھا لیا، نہ ملا تو بھوکے ہی رہ گئے۔ انہی دنوں مجھے خونی بواسیر لاحق ہو گئی۔ دوائیں تو میں نے طرح طرح کی استعمال کیں کیونکہ میں خود ڈاکٹر تھا۔ مگر اس بے سروسامانی میں علاج کے ساتھ پرہیز ضروری ہے وہ کہاں سے ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں دن بہ دن کمزور ہوتا چلا گیا۔ کچھ روز تک تو میں نے تائی سے اپنی حالت کو چھپائے رکھا۔ مگر ایک دن انہیں پتہ چل ہی گیا۔ فوراً گھبرائی گھبرائی میرے پاس پہنچیں اور مجھ سے کہنے لگیں...... کاکا۔ میں تم سے کہتی ہوں۔ یہ خونی بواسیر ہے۔ یہ ڈاکٹری علاج سے ٹھیک نہ ہو گی۔ تم ایسا کرو۔ کرایہ مجھ سے لے لو اور سیدھے گوجرانوالہ چلے جاؤ۔ وہاں محلّہ سنیاراں میں چاچا کریم بخش جراح رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی دوائی ہے جس سے خونی بواسیر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تیرے تایا کو بھی آج سے بیس سال پہلے یہ تکلیف ہو گئی تھی اور اسے چاچا کریم بخش ہی نے ٹھیک کر دیا تھا۔ دس دن میں وہ ٹھیک ہو کر گوجرانوالہ سے واپس جالندھر آ گئے تھے''۔

یہ سن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے کہا ''تائی تجھے معلوم ہے اب میں گوجرانوالہ نہیں جا سکتا''۔

''کیوں نہیں جا سکتا، ٹکٹ کے پیسے میں دیتی ہوں''

''ٹکٹ کا سوال نہیں ہے۔ گوجرانوالہ اب پاکستان میں ہے''

''پاکستان میں ہے تو کیا ہوا۔ کیا ہم دوا دارو کیلئے بھی وہاں نہیں جا سکتے! وہاں اپنا چاچا کریم بخش......''

میں نے تائی کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تائی تجھے کچھ معلوم تو ہے نہیں۔ خواہ مخواہ الٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔ مسلمانوں نے اب اپنا دیس الگ کر لیا ہے۔ اس کا نام پاکستان ہے۔ ہمارے دیس کا نام ہندوستان ہے۔ اب نہ ہندوستان والے پاکستان جا سکتے ہیں۔ نہ پاکستان والے یہاں آ سکتے ہیں۔ اس کیلئے پاسپورٹ کی ضرورت ہو گی''۔

تائی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ بولیں ''پاسپورٹ؟......کیا اس کیلئے کچہری جانا پڑتا ہے؟''

''ہاں ہاں اس کیلئے کچہری ہی جانا پڑتا ہے'' میں نے جلدی سے ٹالنے کیلئے کہہ دیا۔ اب اس بڑھی کو کون سمجھائے۔

نہ بیٹا۔ کورٹ جانا تو اچھا نہیں ہے۔ شریفوں کے بیٹے کبھی کچہری نہیں جاتے مگر وہ چچا کریم بخش......''

''بھاڑ میں جائے چاچا کریم بخش'' میں نے چلا کر کہا۔

''بیس سال پہلے کی بات کرتی ہو۔ جانے وہ تمہارا چاچا کریم بخش آج زندہ بھی ہے کہ مر گیا ہے۔ مگر تم وہی اپنا چاچا کریم بخش رٹے جا رہی ہو''۔

تائی روتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مجھے اپنی تنک مزاجی پر بے حد افسوس ہوا۔ کیوں میں نے اس معصوم عورت کا دل دکھایا۔ اگر تائی آج کی زندگی کی بہت سی دشواریوں کو نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟

دراصل میں ان دنوں بہت ہی تلخ مزاج ہو چلا تھا۔ کالج کے دنوں میں میں اکثر انقلاب کی باتیں کیا کرتا تھا۔ پھر جب زندگی نے مجھے کامرانی بخشی اور میری پریکٹس چل نکلی۔ تو انقلاب کا جوش سرد پڑ گیا۔ اور ہوتے ہوتے یہ لفظ ہی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ اب جالندھر آ کر جو یہ افتاد پڑی تو میرے دل میں پھر سے انقلاب کے خیال نے کروٹ لی۔ اور میں اپنی طرح کے چند جوشیلے اور لٹے پٹے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر پھر سے اسی تلخی تیزی سے تندی سے انقلاب کی باتیں کرنے لگا۔

یہ سب لوگ اکثر تائی ایسری کی دوسری منزل میں میرے کمرے میں ملتے، چائے کا دور چلتا۔ اور دنیا جہان کی باتیں ہوتیں۔ اور میں جوش سے اپنا مکا ہوا میں لہرا کر کہتا۔ ''ہم سے انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ اور ان لوگوں سے انصاف کی توقع بھی نہیں ہے۔ یقیناً اس ملک میں پھر ایک انقلاب آئے گا۔ اور ضرور آ کے رہے گا وہ انقلاب''۔

ایک دن تائی ایسری نے ہماری باتیں سن لیں۔ تو گھبرائی گھبرائی اندر آئیں۔ بولیں۔

''بیٹا، کیا مسلمان یہاں پھر آئیں گے؟''

''نہیں تائی۔ تم سے کس نے کہا؟''

''تو تم یہاں کس ''انقلاب'' کا ذکر کر رہے تھے جو یہاں آئے گا؟

تائی نے انقلاب کو مسلمان سمجھا تھا۔ جب یہ بات ہماری سمجھ میں آئی۔ تو ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''کتنی بھولی ہے ہماری تائی۔ اری تائی۔ ہم تو اس انقلاب کا ذکر کر رہے ہیں۔ جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان ہے۔ جو سب کا انقلاب ہے۔ ہم تو اس انقلاب کو لانا چاہتے ہیں''۔

مگر تائی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر بولیں۔

''اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔

تائی نے میری مدد کرنے کیلئے اپنا سولہ تولے کا ایک گوکھر و بیچ دیا۔اس رقم کو لے کر میں اپنی فیملی کے ساتھ دہلی آ گیا کیونکہ جالندھر میں بے حد افراتفری تھی۔اور غیر یقینی سی حالت ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ دہلی آ کر میں نے پھر سے پریکٹس شروع کر دی۔ چند سالوں ہی میں میری پریکٹس پھر چمک اٹھی۔ میں قرول باغ میں پریکٹس کرتا تھا۔اور قرول باغ لاہور کے بہت سے ریفیوجیوں سے بھرا پڑا تھا۔ جو مجھے جانتے تھے۔ ہولے ہولے میں نے اپنا اڈہ ٹھیک سے جمالیا۔ پریکٹس چمک اٹھی۔ دس سال میں میں نے قرول باغ میں اپنی کوٹھی کھڑی کر لی۔گاڑی بھی خرید لی۔اب قرول باغ کے سرکردہ افراد میں میرا شمار ہوتا تھا۔اب میں پھر انقلاب کی باتیں بھول گیا۔میری خونی بواسیر بھی ٹھیک ہوگئی اور تلخی کے بجائے مزاج میں شگفتگی عود کر آئی۔ جوایک ڈاکٹر کے مزاج کیلئے بے حد ضروری ہے۔

تیرہ سال کے بعد گذشتہ مارچ میں مجھے ایک عزیز کی شادی میں جالندھر جانا پڑا۔ اس تیرہ سال کے عرصے میں میں تائی ایسری کو بالکل بھول بھال گیا تھا۔رشتے دار تو اس وقت یاد آتے ہیں جب مریض نہ ہوں۔لیکن جالندھر پہنچتے ہی مجھے تائی ایسری کی یاد آئی۔ان کے احسانات یاد آئے وہ سونے کا گوکھر و یاد آیا۔ جسے بیچ کر میری پریکٹس چلانے کی رقم بہم پہنچائی گئی تھی اور وہ رقم میں نے آج تک تائی ایسری کو ادا نہیں کی تھی۔جالندھر سٹیشن پر اترتے ہی میں سیدھا تائی ایسری کے گھر چلا گیا......

شام کا جھٹپٹا تھا۔ہوا ایندھن کے دھوئیں،تیل کی بو اور گھر واپس آتے ہوئے بچوں کی آوازوں سے معمور تھی۔ جب میں تائی ایسری کے مکان کی نچلی منزل میں داخل ہوا۔

گھر میں اس وقت تائی کے سوا کوئی نہیں تھا۔وہ اپنے کمرے میں بھگوان کی مورتی کے سامنے گھی کا دیا جلائے، پھول چڑھا کر ہاتھ جوڑ کر واپس گھوم رہی تھیں۔ جب ک انہوں نے میری آہٹ پا کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں''میں نے کمرے میں دو قدم آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

تائی دو قدم آگے بڑھیں۔ مگر مجھے پہچان نہ سکیں۔ تیرہ برس کا عرصہ بھی ایک عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ بے حد نحیف و نزار ہو گئی تھیں۔ ان کا چہرہ بھی دبلا ہو گیا تھا۔ اور وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی تھی۔

''میں رادھا کشن ہوں''

''جے کشن کا کا کا؟ تائی کی آواز بھرا گئی، ممکن تھا وہ جلدی سے آگے بڑھنے کی کوشش میں گر پڑتیں۔ مگر میں نے انہیں جلدی سے تھام لیا۔ اور وہ میرے بازو سے لگ کر رونے لگیں۔ انہوں نے میری بلائیں لیں۔ میرا منہ چوما، میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور بولیں۔

''اتنے دن کہاں رہے بیٹا؟ اپنی تائی کو بھی بھول گئے؟''

انتہائی شرمندگی سے میرا سر جھک گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ تائی نے میری پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ جلدی سے پھولے پھولے سانسوں میں اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں ''سروج راضی خوشی ہے نا''

''ہاں تائی''

''اور وڈا کا کا؟''

''ڈاکٹری پڑھتا ہے''

''اور نکا؟''

''کالج میں پڑھتا ہے''۔

''اور شانو اور بٹو؟''

''وہ دونوں بھی کالج میں پڑھتی ہیں۔ کملا کی میں نے شادی کر دی ہے''۔

''میں نے بھی سوتری کی شادی کر دی ہے۔ پورن اب رڑکی میں پڑھتا ہے۔ نمی اور بنی کے ماں باپ مل گئے تھے۔ وہ آ کر ان کو چھ سال کے بعد لے گئے تھے۔ کبھی کبھی ان کی چٹھی پتری آ جاتی ہے۔ میرے پاس اب صرف گوپی رہ گیا ہے۔ اگلے سال وہ بھی ریلوے ورکشاپ میں کام سیکھنے کیلئے چلا جائے گا۔

یہ تائی کے ان یتیم بچوں کی داستان تھی جو انہوں نے فساد میں لے کر پالے تھے۔

میں نے ناخن سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے کھجاتے کہا۔''تائی۔وہ تیرا قرضہ مجھ پر باقی ہے۔کیسے بتاؤں۔کتنا شرمندہ ہوں۔اب تک نہ بھیج سکا۔اب دلی جاتے ہی بھیج دوں گا۔

''کیسا قرضہ بیٹا؟''تائی نے حیران ہوکر پوچھا۔

''وہی گوکھرو والا''

''اچھا وہ؟''...... یکا یک تائی کو یاد آیا اور وہ بڑے میٹھے انداز میں مسکرانے لگیں۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

''وہ تو تیرا قرضہ تھا بیٹا۔جو میں نے چکا دیا۔

''میرا قرضہ کیسا تھا تائی؟''میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''یہ زندگی دوسروں کا قرضہ ہے بیٹا''تائی سنجیدہ رو ہوکر بولیں۔''اسے چکاتے رہنا چاہیے۔تو کیا اس سنسار میں خود پیدا ہوا تھا؟نہیں۔تجھے تیرے ماں باپ نے زندگی دی تھی۔تو پھر تیری زندگی کسی دوسرے کا قرضہ ہوئی کہ نہیں؟پھر یہ قرضہ ہم نہیں چکائیں گے تو یہ دنیا آگے کیسے چلے گی۔ایک دن پر سے آجائے گی...... بیٹا۔اسی لئے تو کہتی ہوں۔میں نے تیرا قرضہ چکایا ہے۔تو کسی دوسرے کا قرضہ چکا دے...... ہر دم چکاتے رہنا۔جیون کا دھرم ہے''۔تائی اتنی لمبی بات کر کے ہانپنے لگیں۔

میں کیا کہتا۔روشنی سے سایہ کہہ بھی کیا سکتا ہے؟اسی لئے میں سب کچھ سن کر چپ ہوگیا۔وہ بھی چپ ہوگئیں۔پھر آہستہ سے بولیں۔اب میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے۔ورنہ تیرے لئے کھانا پکاتی۔اب گوپی آئے گا۔تو کھانا بنائے گا تیرے لئے۔کھانا کھا کر جانا......میں؟

''نہیں تائی۔اس کی کیا ضرورت ہے۔وہاں بھی تیرا ہی دیا کھاتے ہیں۔''میں نے آہستہ سے کہا۔''میں یہاں تیج پال کی شادی پر آیا تھا۔سٹیشن سے سیدھا تمہارے گھر آرہا ہوں۔اب شادی والے گھر جاؤں گا''۔

''بلاوا تو مجھے بھی آیا ہے۔مگر دو دن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔اس لئے میں

نہیں جاسکتی۔شگن میں نے بھیج دیا تھا۔تم میری طرف سے تیج پال کے سر پر پیار دینا''۔

بہت اچھا تائی...... کہہ کر میں تائی کے چرنوں میں جھکا۔انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے گلے لگالیا۔میرے سر پر ہاتھ پھیر کر سو سو دعائیں دے کر بولیں۔''بیٹا۔میرا ایک کام کرو گے؟''

''حکم کرو تائی؟''

''کیا تم کل صبح یہاں آ سکتے ہو''

کیا بات ہے تائی۔اب میں تمہیں مل کے تو جا رہا ہوں۔

تائی جھجکتے جھجکتے بولیں۔''میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں۔رات میں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ایسا جنم جلا اندھیرا چھایا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔اگر تم صبح کسی وقت دن میں آ جاؤ تو میں تمہیں اچھی طرح دیکھ لوں گی۔تیرہ سال سے تجھے نہیں دیکھا ہے کا کا''۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔میں نے گلو گیر لہجے میں کہا۔

''آ جاؤں گا تائی''۔

(5)

دوسرے دن بارات کے کچھ لوگ آنے والے تھے۔صبح ہی ہم لوگوں کو پیشوائی کیلئے اسٹیشن پر جانا پڑا۔وہاں سے لوٹتے وقت مجھے یاد آیا تو میں ان لوگوں سے معذرت کر کے تائی ایسری کے گھر کی طرف ہو لیا۔گلی کے موڑ پر مجھے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں لوگ سر جھکائے ملے۔میں جلدی جلدی سے قدم بڑھاتا ہوا آگے چلا گیا۔مکان کی نچلی منزل پر مجھے اور بہت سے لوگ روتے ہوئے ملے۔معلوم ہوا آج صبح تائی ایسری کی موت واقع ہو گئی۔اور جب ہم لوگ سٹیشن گئے ہوئے تھے وہ چل بسیں۔

اندر کمرے میں ان کی لاش پڑی تھی۔ایک سفید چادر میں ملبوس، چہرہ کھلا رہنے دیا گیا تھا۔کمرے میں کافور اور لوبان کی خوشبو تھی ور ایک پنڈت ہولے ہولے وید منتر پڑھ رہا تھا۔

تائی ایسری کی آنکھیں بند تھیں۔اور ان کا معصوم بھورا بھورا چہرہ پر سکون، خاموش

اور گہرے خوابوں میں کھویا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تائی ایسری کا چہرہ نہ ہو۔ دھرتی کا پھیلا ہوا لامتناہی چہرہ ہو۔ جس کی آنکھوں سے ندیاں بہتی ہیں۔ جس کی ہر شکن میں لاکھوں وادیاں انسانی بستیوں کو اپنی آغوش میں لئے مسکراتی ہیں۔ جس کے انگ انگ سے بے غرض پیار کی مہک پھوٹتی ہے۔ جس کی معصومیت میں تخلیق کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ جس کے دل میں دوسروں کیلئے وہ بے پناہ مامتا جاگتی ہے جس کا مزہ کوئی کوکھ رکھنے والی ہستی ہی پہچان سکتی ہے۔

میں ان کے پاؤں کے قریب کھڑا ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکا یک کسی نے آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو میرے سامنے بائیس تیس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی رویا ہے اور ابھی پھر رو دے گا۔

اس نے آہستہ سے کہا ''میں گوپی ناتھ ہوں''

میں سمجھ تو گیا، مگر خاموش رہا۔ کچھ سمجھ بھی نہیں آتا تھا کیا کہوں۔ کیا نہ کہوں۔

''میں تیج پال کے گھر آپ کو ڈھونڈنے گیا تھا۔ مگر آپ سٹیشن پر گئے ہوئے تھے''۔ وہ پھر بولا۔

میں پھر بھی خاموش رہا۔

گوپی ناتھ دھیرے سے بولا۔ ''صبح تائی نے آپ کو بہت یاد کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔ اس لیے وہ مرتے مرتے بھی آپ کا انتظار کرتی رہیں۔ آخر جب انہیں یقین ہو گیا کہ مرنے کا وقت آ پہنچا ہے اور آپ نہیں آئیں گے۔ تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

''جب میرا بیٹا رادھا کشن آئے تو اسے یہ دے دینا۔

یہ کہہ کر گوپی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور میری ہتھیلی پر ایک چونی رکھ دی۔

چونی دیکھ کر میں رونے لگا۔

مجھے معلوم نہیں ہے آج تائی ایسری کہاں ہیں؟ لیکن اگر وہ سورگ میں ہیں۔ تو وہ اس وقت بھی یقیناً ایک رنگین پیڑھی پر بیٹھی، اپنی چھچھی سامنے کھول کر، بڑے اطمینان سے دیوتاؤں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں چونیاں ہی بانٹ رہی ہوں گی۔

◆◆◆

پرتیو

جب وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈبے کے اندر آیا تو اسکے چلنے کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ فوج میں ملازم رہ چکا ہے۔اس کی شخصیت بڑی پروقار، قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا، رنگ سرخ وسپید، براق نورانی ڈاڑھی اس نے کالی سرج کے رنگ کا اونی سوٹ پہن رکھا تھا اور ڈبے کے درمیان روشنی میں اس کی پگڑی کی تہوں میں سے ابرق کے ٹکڑے جواہر ریزوں کی طرح چمک اٹھتے تھے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا متوازن قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ کر رُکا۔ جھک کر اس نے قریب کی سیٹ کا نمبر پڑھا اور اطمینان کی سانس لے کر سیٹ پر دراز ہو گیا۔ سیٹ اسکے وزن سے پیچھے کو ہو گئی اس نے مزید اطمینان کی سانس لی اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ پیچھے کو ہٹنے والی کلد ارنشستیں بہت عمدہ ہیں'' میں نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ جسے میں نے ابھی ابھی سلگایا تھا جلدی سے خاک دان میں بجا دیا۔ بوڑھا سکھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور اس نے کہا'' شکریہ! مجھے تمباکو کا دھواں واقعی بہت برا معلوم ہوتا ہے''۔

مجھے اس کے دانت، جب وہ مسکرایا تو بہت اچھے معلوم ہوئے۔ بے حد سپید اور مضبوط دانت جڑے ہوئے اور ہم سطح، اس بوڑھے فوجی سکھ کی عمر ستر برس سے کم نہیں تھی لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اب بھی جوانی کی چمک اور اس کا تجسس پایا جاتا تھا۔اس عمر

میں وہ غیر معمولی طور پر صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوانی میں تو بے حد حسین اور دلاویز شخصیت کا مالک رہا ہوگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر جو چیز کھل رہی تھی وہ متعدد زخموں کے نشان تھے۔ دائیں بائیں اس کے رخساروں پر تین چار لانبے لانبے زخموں کے نشان رہ گئے تھے۔ دائیں رخسار پر تو زخموں نے ایک صلیب سی بنا ڈالی تھی اور بائیں رخسار پر زخم انگریزی میں "V" کا سا نشان بنائے ہوئے تھا اور جب اس نے اپنی ٹائی ٹھیک کرنے کیلئے ہاتھ اوپر کئے تو میں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلیوں کی پشت پر بھی کئی ایسے چھوٹے چھوٹے بیسیوں نشان ہیں جیسے کسی نے تیز دھار کے چاقو سے ان کے ہاتھوں کا قیمہ بنانے کی کوشش کی ہو۔

جنگ! میں نے اپنے دل میں سوچا۔ جانے پہلی جنگ عظیم کے محاذ پر اس کو یہ حادثہ پیش آیا ہوگا۔ وہ تو خیریت رہی کہ خوبصورت اور وجیہہ انسان کی بانہہ یا ٹانگ نہیں کٹی۔ ورنہ کتنا برا معلوم ہوتا یہ آدمی۔

مجھے اس معاملہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ریستوران کار کے بیرے نے آ کر کہا اب آپ لوگ آ کے کھانا کھا لیں ہم لوگ دس بجے ریستوران بند کر دیتے ہیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بوڑھا سکھ میرے ساتھ اٹھ گیا۔

''حالانکہ میں آٹھ بجے گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا۔ مگر اس وقت پھر بھوک محسوس کر رہا تھا۔'' بوڑھا سکھ ہنس کر مجھ سے مخاطب ہوا اور میں اس لئے دیر سے کھانا کھا رہا ہوں کہ مجھے بھوک نہ تھی! میں نے جواب دیا۔

ہم دونوں ڈائننگ کار میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیروں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ صرف ایک کونے کی میز پر ایک نوجوان جوڑا کافی پی رہا تھا اور کھڑکی سے باہر رک رک کر پورن ماشی کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا ہاتھ مرد کے ہاتھ میں تھا۔ جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد دبا دیتا تھا۔ ہاتھ کے دبانے میں لڑکی کے چہرے پر ایک گلنار مسکراہٹ کھل اٹھی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے لڑکی کے ہاتھ میں کوئی سوئچ (Switch) ہے کہ جسے بار بار دبانے سے یہ

مسکراہٹ بجلی کے قمقمے کی طرح روشن ہو اٹھتی۔ لڑکی کے بال خوشنما طریق سے کٹے ہوئے تھے اور وہ بڑی دلربا صورت والی، موہنی اداؤں والی لڑکی تھی اور شکل وصورت سے ایک ایسی ہندوستانی کرسچن معلوم ہوتی تھی جس میں یورپی خون کا بھی دخل رہا تھا۔ لڑکا خالص ہندوستانی تھا۔ سانولے رنگ کا تھا۔ چھوٹا قد لیکن مضبوط اور گھٹا ہوا گھنے چمکیلے بال اور چوڑے چوڑے جبڑوں پر گھٹے ہوئے شیو کی نیلاہٹ تھی۔ اس کے سر کی حجامت بھی بالکل تازہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج ہی بال کٹوا کر آیا ہے۔ اس کے کپڑے بے حد صاف ستھرے تھے اور اس کے روئیں سے زندگی کی صحت مند آرزوئیں پھوٹ رہی تھیں۔

لڑکی کا ایک ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور بار بار وہ اسے اس طرح دباتا تھا جس طرح گویا وہ برقی رو بھرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کی نیلی ساڑھی کا پلو برابر مسلے جا رہا تھا اور اس کی بے حد سیاہ چھوٹی اور چمکیلی آنکھیں لڑکی کو اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے وہ لڑکی لڑکی نہ ہو حسن کی ایک پلیٹ ہو، محبت میں صحبت کو کس قدر دخل ہے۔ میں نے اپنے زرد رخساروں کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جواب میں بوڑھے سکھ نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اب کھانا ہم دونوں کے سامنے تھا اور وہ مکمل انہماک سے کھانے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ ہمارے کھانے کے دوران میں ہی وہ جوڑا کافی پی کر اور بل ادا کر کے چلا گیا۔ چلتے ہوئے وہ گلنار مسکراہٹ پھر لڑکی کے لبوں تک آئی اور مجھے اس لڑکی کی وہ گلنار مسکراہٹ اس کے تبسم کی ادا بے حد پسند آئی۔ جب وہ لڑکے طرف دیکھتی تھی کتنی چاہت اور سپردگی تھی، اس کی نگاہ میں کبھی کبھی تو عورت ایک نگاہ میں سب کچھ دے ڈالتی ہے اور پھر ایک خالی برتن کی طرح معصوم کھڑی کی کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ بس اسی وقت وہ سب سے پیاری بھی معلوم ہوتی ہے۔ مسکرانے کے بعد کچھ اس طرح کی نگاہ سے اس لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا تھا اور پھر ٹھٹھک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور نوجوان اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ویسٹی بیول میں لے گیا اور ان کے جانے کے بعد ریستوران کار اور بھی سونی سونی سی دکھائی دینے لگی اور کھڑکی میں لٹکا ہوا چاند مجھے ایسا محسوس ہوا گویا صرف

انہیں کیلئے لٹکایا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی پر پردہ ڈال دیا۔

بوڑھا سکھ میری حرکت پر مسکرایا مگر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا کھانا کھانے کے بعد بوڑھے سکھ نے کافی منگائی اور میں سگریٹ پینے کیلئے باہر ویسٹی بیول میں آ گیا۔ ویسٹی بیول کے ایک کونے میں نوجوان اس لڑکی کو چوم رہا تھا۔اور چانداس کے چہرے پر تھااس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

لڑکے نے حیران ہوکر پوچھا یہ آنسو کیسے!

کچھ نہیں یونہی۔لڑکی اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اوراس کے چہرے پر وہی دلاویز تبسم من موہنا محبت میں ڈوبا ہوا۔گلنار تبسم۔

لڑکے کے شانے کانپے۔اس نے ٹھٹھر کے کہا چلو ڈارلنگ اندر چلیں یہاں سردی ہے......اس نے خاموشی سے اپنی نگاہوں سے میری طرف اشارہ کیا۔ میں جو دوسری کھڑکی میں کھڑا بظاہر باہر پورنیما کے چاند کو دیکھ رہا تھا۔لڑکے نے میری طرف اس طرح دیکھا گویا مجھے ابھی چھرا بھوک دے گا۔ پھراس نے آہستہ سے گھوم کرلڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اورا سے ویسٹی بیول سے نکال کراندر ڈبے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد گارڈ ڈبے میں آیا۔اس نے سب بتیاں بجھا دیں لیکن ڈبے کے باہر چاندی مکمل طور پر کھل اٹھی تھی اوراس کی سپید مدہم روشنی میں گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے خاموش اور ستے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا۔ مجھے اس چاندنی میں نیند نہیں آتی۔کھڑکی کا پردہ سرکا دوں؟

ذرا ٹھہرو۔بوڑھے سکھ نے بہت ہی دھیمے لہجہ میں بے حد پرسوز آواز میں کہا۔ یہ پونم کی رات بہت بھیانک ہے۔ بہت خوبصورت بھی ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے مگر میں اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ کچھ دیراوراس چاند کو دیکھ لوں؟''

چاند کوتو نوجوان لوگ دیکھتے ہیں۔ ہمارے تمہارے دیکھنے کی یہ چیز نہیں۔ میں نے افسردہ تبسم کے ساتھ کہا۔ بوڑھا سکھ مسکرایا۔ اس کا دایاں رخسار چاندنی میں تھا اورصلیب کا

نشان بہت گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں رخسار کی (V) تاریکی میں گم تھی۔

میں نے کہا تمہارے رخساروں کے یہ زخم کیا تم نے جنگ میں حاصل کئے ہیں۔

جنگ؟ جنگ؟ بوڑھے سردار نے میری طرف دیکھ کر اپنے آپ میں گم ہوتے ہوئے کہا۔

ہاں! جنگ ہی تو تھی، وہ رک کر آہستہ سے بولا۔

کون سی جنگ! پہلی جنگ عظیم یا اس سے پہلے کی کوئی جنگ! میں نے پوچھا۔

میں تو کبھی فوج میں نہیں رہا۔ بوڑھے سکھ نے آہستہ سے کہا میرا قیاس بے بنیاد ثابت ہوا۔ اس لئے میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا، پھر یہ زخم کیسے؟

بوڑھے سکھ نے ادھر ادھر دیکھا۔ چاند اپنی جگہ تھا کھڑکی اپنی جگہ تھی مسافر ڈبے میں خال خال ہی تھے مگر جہاں تھے وہیں کے وہیں اپنی آرام دہ کرسیوں پر دراز سو رہے تھے۔ ہمارے آگے پانچ چھ سیٹیں چھوڑ کر آخیر تاریک کونے میں وہ لڑکا اور لڑکی اپنی اپنی کرسیوں پر دبکے ہوئے تھے۔ لڑکی کا سر لڑکے کے شانے پر تھا اور لڑکے کا بازو لڑکی کے شانے پر آنکھیں دونوں کی بند تھیں۔

بوڑھے سکھ نے مجھ سے پوچھا۔ یہ قصہ تم سنو گے؟ اگر نہیں نیند آ رہی ہو تو سنا دوں۔

نیند تو مجھے اس چاندنی میں کبھی نہیں آئے گی۔ بوڑھے سردار نے بڑے گداز لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اس طرح سے کہا جیسے وہ قصہ سنانے کیلئے تیار ہو چکا ہو۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا اچھا تو سن لو۔ تم میرے لئے مکمل اجنبی ہو اس لئے تمہیں سنا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ گاری کی کھڑیوں میں دوہرے شیشے لگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے گاری کی چھک چھک بڑے میٹھے مدھم غنودگی سے لبریز لہجے میں اندر آتی معلوم ہوتی تھی اور گاڑی کے دو رویہ پھیلی ہوئی سفید چاندی میں سیاہ درخت اپنی شاخوں کو سمیٹتے ہوئے، سر جھکائے ہوئے گناہگار مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

سردار نے کونے میں سوئے ہوئے سرا ٹھے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا جوانی میں بھی اسی طرح تھا بے فکر اور لاپروا اور خودسر میرا باپ گجند رسنگھ موضع حاصلاں کا نمبردار تھا اور

اس کے علاوہ چک نمبر 37 بھی پورے کا پورا ہماری ملکیت میں تھا، گھر میں کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی گو باپ نے مجھے بی اے پاس کرایا تھا لیکن مجھے شروع ہی سے کھیتوں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ قلم کے بجائے میرے ہاتھ درانتی چلانے میں مشتاق تھے۔ جانے میں نے بی اے کیسے کرلیا۔ میرے باپ کی آرزو تھی کہ میں فوج میں بھرتی ہو جاؤں کرنل بنوں۔ مگر مجھے کھیتوں کی زندگی ہی پسند تھی۔ بھوری بھوری مٹی کی سوندھی مہک شبنم میں ڈوبے ہوئے ہرے ہرے چنوں کا بوٹ، دور دھراں کے ٹیلے پر پانی بھرتی ہوئی ناریوں کی قطار اور میری سنہری گھوڑی کی دلکی چال، کچے راستوں پر ہلکی ہلکہ دھول جگاتی ہوئی......آہ۔

میں نے کہا تم اپنے شباب میں بے حد حسین رہے ہو گے۔ عورتیں تو تم پر بہت مرتی ہوں گی۔

بوڑھے سکھ نے حزیں مسکراہٹ سے کہا ایسا تو مجھے کچھ یاد نہیں کہ کسی نے مجھ سے محبت کی ہو ہاں میں نے ضرور ایک لڑکی سے محبت کی تھی۔

کون تھی وہ؟

میری بیوی تھی۔

بیوی؟

جب میں بی اے پاس کرکے گاؤں واپس آیا تو میرے باپ نے چک جھمرہ کے نمبردار کی بیٹی پریتو سے میرا بیاہ کر دیا۔ پریتو بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ لانبی اور بانکی گوری اور سنہری لچکیلی اور نرم جیسے کوار گندل مگر میں تو اس کی آنکھوں پر مرتا تھا۔

کیوں ان کی آنکھوں میں کیا بات تھی؟ میں نے پوچھا

بظاہر تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی تھیں اور کالی سیاہ! مگر ایسی تو بہت سی عورتوں کی آنکھیں ہوتی ہیں، پھر بات کیا تھی؟

کہہ نہیں سکتا۔ ان آنکھوں کا رنگ، نہیں نہیں رنگ نہیں، ان آنکھوں کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

وہ آنکھیں بولتی تھیں؟

بولتی تو نہیں تھیں۔لیکن بولنا چاہتی تھیں۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہیں گی۔مگر وہ مجھ سے کچھ نہ کہتیں۔ ہر وقت سپنے دیکھتی رہتیں۔کبھی ایسی آنکھیں تم نے دیکھیں ہیں جو ہمیشہ سپنا دیکھا کریں۔

جوانی میں ہر آنکھیں سپنے دیکھتی ہیں۔میں نے کہا۔

ہاں!لیکن سپنے ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں۔

بڈھے نے آہستہ سے کہا۔میں تو اپنی پریتو پر مرمٹا تھا۔تم کہہ سکتے ہو کہ یہ اس لیے ہوا کہ میری زندگی میں اس سے پہلے کوئی لڑکی نہ آئی تھی،نہ اس کے بعد......

پریتو تم نے نہیں دیکھی۔ورنہ یوں نہ کہتے۔وہ تو ایسی عورت تھی جس سے اس کے بیوی ہونے کے بعد بھی عشق کیا جاسکتا تھا اور پھر یوں ہی ہوا۔جب میں گاؤں پہنچا اور میں نے فوج میں بھرتی ہونے سے کسان بننے کو ترجیح دی تو میرے باپ نے فورا میرا بیاہ کر دیا اور مجھے کھیتوں میں کام کرنے کو لگا دیا۔حالانکہ اسے اس بات میں بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔مگر میں تو بہت خوش تھا۔تم جانتو ہوا گر میں فوج میں ہوتا تو کیسے اپنی پریتو سے محبت کر سکتا تھا۔اب تک تو فرنگیوں کی کسی نہ کسی لڑائی میں اٹلی میں فرانس میں یا میسو پوٹیمیا یا درہ خیبر میں کہیں نہ کہیں ان لوگوں نے میری جان لے لی ہوتی۔حالانکہ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا برا ہوا۔

یکا یک وہ چپ ہوگیا۔

میں بھی چپ رہا۔

بہت دیر کے بعد وہ بولا قصہ مختصر یہ کہ میں اپنی پریتو کو بہت چاہتا تھا اور وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی اور ہم کبھی ایک دن کیلئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے تھے لیکن ہماری شادی کے چھ ماہ بعد کیا ہوا کہ میرا سسر اپنے گاؤں میں سخت بیمار پڑا اور پریتو کو اپنے میکے جانا پڑا اس کا باپ بیمار تھا۔اس لئے میں بھی ایسے کیسے روک سکتا تھا۔چنانچہ پریتو چلی گئی۔لیکن اس کے جانے کے بعد میرا دل اپنے گھر میں،کھیتوں میں،اپنی گھوڑسواری میں،کسی کام میں نہ لگتا

تھا۔ تین دن تو میں نے جیسے تیسے کر کے کاٹے۔ لیکن چوتھے دن میں نے اپنی گھوڑی پر زین کسی اور سرپٹ ہو گیا اپنے سسرال کے گھر۔ چک جھمرہ، ہمارے گاؤں سے تیس کوس پر واقع ہے۔ لیکن میری گھوڑی بڑی تیز رفتار ہے۔ میں شام ہوتے ہوتے چک جھمرہ پہنچ گیا۔ وہاں جا کے معلوم ہوا کہ میرے سسر کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے بلکہ میں نے اسے خاصا ہشاش بشاش پایا۔ ساس اور سسر دونوں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ داماد اپنے سسر کی صحت پوچھنے چلا آیا ہے تو وہ سعادت مندی پر بہت خوش ہوئے۔ دن بھر تیس کوس کا سفر کرنے سے میں بہت تھک گیا تھا اس لئے جلدی کھانا کھانے کے بعد میں سو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جو سوؤں تو پھر صبح ہی اٹھوں گا۔ میں نے پریتو سے کہا مجھے ضرور اٹھا دینا۔ میں گھوڑی پر سوار ہو کر صبح سیر کو جاؤں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دن چڑھے تک سوتا ہی رہوں۔

لیکن ہوا یہ کہ اس رات تیسرے پہر ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ میری بیوی میرے بستر پر نہیں ہے۔ دور کمرے کے آخری سرے پر دروازے کے ہلکے سے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ اور ایک سایہ سا دروازے کے باہر گزرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا۔ واہگورو یہ کیا معاملہ ہے؟ سوچ کر میں آہستہ سے اپنے بستر سے اٹھا۔ کرپان کو تکیے کے نیچے سے اٹھا کر پہنا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ہو لیا۔

باہر ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ بڑی خوبصورت خوشبوؤں والی چاندنی رات تھی۔ سرس اور شیشم کی شاخوں میں چھپے ہوئے گھونسلوں میں کبھی کبھی چڑیاں غنودگی میں چوں چوں کرتیں۔ مگر ان کے چڑے فوراً اپنی مضبوط چونچ سے ٹھونگ کر انہیں اپنی گود میں دبا لیتے۔ میرے پاؤں شبنم میں بھیگ چکے تھے اور میرے چاروں طرف سرسوں کی ہری ہری کونپلیں لہرا رہی تھیں اور کھیتوں میں گزرتا ہوا اپنی پریتوں کے تعاقب میں جا رہا تھا۔

پہلے میں نے سوچا وہ کھیتوں میں ضروری حوائج سے فارغ ہونے سے جا رہی ہے لیکن جب اس نے ایک کھیت کو پار کر لیا۔ دوسرے کھیت کو پار کر لیا۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے گھوم کر نیچے کے خشک نالے کو پار کر کے نیچے غائب ہونے لگی۔ دل کو دھچکا سا لگا۔ اور اب

میں ہولے ہولے بہت احتیاط سے اس کے تعاقب میں چلنے لگا تا کہ اسے پتہ ہی نہ چلے کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔ تیسرے کھیت کی ڈھلوان سے اتر کر نالے کو پار کیا پھر احتیاط سے ٹیلوں کے پیچھے سے گھوم کر میں نے آگے کو نظر دوڑائی۔

سامنے پھر سرسوں کے کھیت تھے۔ کھیتوں کے بیچ میں ایک کنواں تھا۔ کنوئیں کے قریب بیریوں کا ایک سائے دار جھاڑ تھا۔ جھاڑ کے نزدیک ایک پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے قریب ایک ناپختہ گھر تھا جس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔

اور میری بیوی اس پلنگ پر ایک جاٹ کے ساتھ سو رہی تھی۔ میری پریتو۔ میری بیوی اس سے بہت پیار کر رہی تھی۔ وہ بار بار اس کی آنکھیں چومتی اور اس کے رخسار، اور کتنی شدت تھی اس پیار میں۔ میری آنکھوں میں خون اترنے لگا میں چپکا بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے کھڑا ان لوگوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہاں ہاں، اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔

کچھ عرصہ کے بعد جاٹ نے میری بیوی سے کہا۔ پریتو! مجھے پیاس لگی ہے اندر سے پانی لادے۔

پریتو نے اپنا سر اس کے سینے سے ہٹا لیا اور بولی! بچنے! تیری پیاس کیا ابھی تک نہیں بجھی؟

بچنا جواب میں صرف مسکرا دیا۔ اس نے میری بیوی کے ہونٹ چوم لئے۔ پریتو آہستہ سے پلنگ سے اٹھی اور آدھ کھلے دروازے سے ناپختہ مکان کے اندر گئی۔ بچنا اوندھے منہ لیٹ کر بڑے اشتیاق سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ میری بیوی بالکل ننگی تھی۔

یکا یک میں نے کرپان نکالی اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کو اوپر اٹھایا اور اپنی پوری طاقت سے بچنے پر وار کیا بچنے کے منہ سے ''ہک'' کی ایک ہلکی سی آواز نکلی۔

دوسرے لمحے میں اس کا سر قلم ہو گیا۔ پھر میں بیریوں کے جھاڑ کے پیچھے سے کھیتوں میں غائب ہو گیا۔ ٹیلوں کے پیچھے سے نالے کو عبور کر کے سرسوں کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے چند لمحوں کیلئے رک کر اپنی کرپان کو مٹی سے اچھا طرح صاف کیا اور جب وہ

بالکل صاف شفاف ہو کر آئینے کی طرح چمکنے لگی تو اسے میان میں رکھ کر گھر کے اندر آیا اور کمرے کے اندر آ کر پھر اپنے بستر پر سو گیا۔

کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد پریتو میرے گھر میں دھیرے سے داخل ہوئی۔ میں جاگ رہا تھا لیکن میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبے سانس لینے لگا۔ پریتو نے دروازہ کھول کر پہلے تو مجھے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے آہستہ سے میرے تکیے کے نیچے سے کرپان نکالی اور اسے کھول کر دیکھا اور جب اسے بالکل صاف پایا تو گویا اس کا دل کا شبہ دور ہو گیا اور وہ میری بغل میں آ کر لیٹ گئی۔

چپ چاپ پتھر کی سل!

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا؟

کچھ نہیں ہوا۔ اس کا باپ چونکہ صحتیاب ہو چکا تھا اس لیے میں پریتو کو لے کر دوسرے دن ہی اپنے گاؤں چلا آیا اور ہم دونوں ہنسی خوشی اکٹھے رہنے لگے۔

دن بیتے، مہینے بیتے، سال بیتے۔ میں نے کبھی اس بات کا تذکرہ نہیں کیا۔ نہ پریتو نے کسی بات سے مجھ پر ظاہر ہونے دیا کہ اسے کسی بات کا شبہ ہوا تھا یا اسے کسی بات کا کوئی غم تھا۔ ہاں ایک بات میں نے ضرور دیکھی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ پھر کبھی اپنے میکے نہیں گئی۔

میرے کہنے پر یا اپنے باپ کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔ ہوتے ہوتے میں بھی اس واقع کو بھول سا گیا۔ کیونکہ اب میرے بچے ہو گئے تھے۔ میرے اور پریتو کے بچے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بڑے خوبصورت بچے تھے۔ ہمارے، پرتاپ، دلیپ اور ہرنام کور، بڑھتے بڑھتے بچے بھی بڑے ہو گئے اور سکول جانے لگے سکول سے کالج جانے لگے تو ہمارے ہاں تیسرا لڑکا پیدا ہوا ہربنس سنگھ۔ اب ہمارے گھر میں شادمانی اور مسرت تھی۔ آرام و سکون، خوشی اور یقین، گہری رفاقت اور مفاہمت جو اچھے گھروں کی مثال بنتی ہے۔

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے واپس آ کر آگ کے مگھ کے پیچھے بیٹھا ہوا

تھا۔ پرتاپ اور دلیپ کالج سے واپس آ گئے تھے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کیلئے ہرنام ایک کونے میں کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ میرا سات سال کا ہربنس لکڑی کے گھوڑے کو چلانے کی کوشش کرر ہا تھا۔ پریتو مکھ کے پیچھے ایک کونے میں چولہے میں مکئی کی روٹیاں سینک رہی تھی۔ ہانڈی میں سرسوں کا ساگ ابل رہا تھا اور اس کی کھٹ کنی خوشبو سے میری بھوک اور بھی بے چین کر رہی تھی۔ میں نے جلدی سے کرپان کھول کر الگ رکھ دی اور ہاتھ منہ دھو کر پریتو کے سامنے مونڈھا بچھا کر بیٹھ گیا اور بالکل بچوں کی طرح بے چین ہو کر اس سے کھانا مانگنے لگا۔

پریتو جلدی سے کھانا دے دے۔

پریتو نے سب سے پہلے میرے لئے کھانا پروسا۔ پھر پرتاب کیلئے، پھر دلیپ کیلئے، پھر ہرنام کور کیلئے۔ سب سے چھوٹے ہربنس نے مچل کر کہا۔ میں تو اماں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔

میں نے پریتو سے کہا تو بھی بیٹھ جا اب!

میں بیٹھ جاؤں گی تو تمہیں کھانا کون کھلائے گا؟ پریتو نے ذرا ناک سکیڑ کر کہا۔

اس وقت چولہے میں روشنی میں اس کے رخسار تمتما رہے تھے اور الجھی ہوئی زلف ماتھے پر اتر آئی تھی۔ مجھے وہ اس وقت بہت اچھی لگ رہی تھی۔

ماں! مجھے سرسوں کا ساگ اور دے دے۔ دلیپ نے اپنی تھالی بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ہربنس کی ماں! تھوڑا سا اچار اگر اس وقت کہیں سے مل جائے تو کھانے کا مزہ دونا ہو جائے۔

اچار تو اندر کوٹھڑی میں ہے۔ پریتو نے رک رک کر کہا۔

تو کیا ہوا اندر سے جا کر لا دے۔

پریتو سہم کر بولی اکیلی کیسے جاؤں؟ اندر تو بڑا اندھیرا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

ڈر لگتا ہے؟ یکایک میرے منہ سے بے اختیار نکلا اس وقت سب کے سامنے اندر

جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ لیکن اس رات کو کھیتوں کو پار کر کے اکیلی جانے میں ڈر نہیں لگا تھا؟ یکا یک میں نے تنک کر کہا، جانے کیسے کہہ دیا۔ اتنے سالوں کے بعد میرے ہونٹوں پر آ گئی۔

پریتو نے بیٹھے بیٹھے بس ایک لمحے کیلئے مجھے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کرپان لئے میرے سر پر کھڑی ہے پھر ایک بجلی سی تڑپی اور میں نے اپنے آپ کو بچانے کیلئے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

ایک بار، دو بار، تین بار، کرپان میرے رخساروں کو کاٹتی ہوئی چلی گئی میں نے اپنے بچاؤ کیلئے اپنے ہاتھوں سے اسے روکنا چاہا۔ اور چلایا۔ پریتو، پریتو! رک جا مگر پریتو ایک بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر وار کرتی رہی۔ آخر غصہ میں بھر کر میں نے ایک جھٹکے سے کرپان اس کے ہاتھ سے چھین لی اور دونوں ہاتھوں سے کرپان کو اٹھا کر اپنے جسم اور روح کی پوری طاقت لگا دی پریتو کی گردن کٹ کر ہربنس کے گھوڑے کے قدموں میں جا گری اور وہاں سے لڑھک کر میری تھالی میں اوندھی ہو گئی اور اس کے سیاہ بال کھل کر میرے سامنے بکھر گئے۔

بوڑھا سکھ چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔ کھڑکی میں چاند بھی ایک وحشت ناک بھوت کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ گاڑی کے مسافروں کے چہرے سپید اور ستے ہوئے تھے جیسے وہ چہرے نہ ہوں، بہروپیوں کے خول ہوں۔ گاڑی کھیتوں سے گزرتی ہوئی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اور چاند مجبور اور بے کس نہتا اور اکیلا کھڑا تھا۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد بوڑھے سکھ نے دلگیر لہجے میں کہا۔ عورت کبھی نہیں بھولتی! وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک ڈولی میں سوار کرا کے، ایک پلنگ پر لٹا کر چار بچے پیدا کرا کے اس کے دل کا سپنا اس سے چھین سکتے ہیں۔

وہ لوگ عورت کو نہیں جانتے۔

عورت کبھی نہیں بھولتی۔

بوڑھا سکھ خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے رخسار کی صلیب پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا اور

خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ صلیب بہت گہری اس کے دل کے اندر ڈوب چکی ہے۔

گاڑی میں اس قدر سناٹا تھا کہ مجھے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے منہ کھولا۔ دو تین لمبے لمبے سانس اندر کو لیے۔ پھر اچانک میری نظر کونے میں سوئے ہوئے جوڑے پر پڑی۔ لڑکی کا ہاتھ ابھی تک لڑکے کے ہاتھ میں تھا اور لڑکے کا بازو ابھی تک لڑکی کے شانے پر تھا اور دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں سو رہے تھے۔ یکا یک لڑکی نے لڑکے کے شانے سے سر اٹھایا۔ آہستہ سے اپنا ہاتھ لڑکے کے نیچے سے نکالا اور لڑکے کی طرف دیکھا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ لڑکا گہری نیند سو رہا ہے تو لڑکی نوجوان کا بازو اپنے شانے سے الگ کیا اور اس سے منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھا۔ پھر ایسی حسرت آمیز نگاہ سے دیکھا جو اس کی گلنار مسکراہٹ کی ہر قدم پر تکذیب کرتی تھی۔ میں بالکل بھونچکا رہ گیا۔ یکا یک میرے ذہن میں کرپان سی لہلہاتی محسوس ہوئی اور میں نے ڈر کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

دوسرے لمحے جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لڑکی نے اپنی کھڑکی کا پردہ گرا لیا تھا۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ گو میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

◆◆◆

پورے چاند کی رات

اپریل کا مہینہ تھا۔ بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں۔ اور ہوا میں برفیلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آ گئی تھی۔ بلند و بالا تنگوں کے نیچے مخملیں دوب پر کہیں کہیں برف کے ٹکڑے سپید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے، اور دوب کا رنگ گہرا سبز ہو جائے گا۔ اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے بادام پکھراج کے نگینوں کی طرح جھلملائیں گے اور نیلگوں پہاڑوں کے چہروں سے کہرا دور ہوتا جائے گا۔ اور اس جھیل کے پل کے پار پگڈنڈی کی خاک ملائم بھیڑوں کی جانی پہچانی با آ آ سے جھنجھنا اٹھے گی۔ اور پھر ان بلند و بالا ڈالیوں کے نیچے چرواہے بھیڑوں کے جسموں سے سردیوں کی پلی ہوئی موٹی موٹی گف اون گرمیوں میں کترتے جائیں گے اور گیت گاتے جائیں گے۔

لیکن ابھی اپریل کا مہینہ تھا۔ ابھی ڈالیوں پر پتیاں نہ پھوٹی تھیں۔ ابھی پہاڑوں پر برف کا کہرا تھا۔ ابھی پگڈنڈی کا سینہ بھیڑوں کی آواز سے نہ گونجا تھا۔ ابھی سمل کی جھیل پر کنول کے چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جھیل کا گہرا سبز پانی اپنے سینے کے اندر ان لاکھوں روپوں کو چھپائے بیٹھا تھا۔ جو بہار کی آمد پر یکا یک اس کی سطح پر ایک معصوم اور بے لوث ہنسی کی طرح کھل جائیں گے۔ پل کے کنارے کنارے بادام کے پیڑوں کی شاخوں پر شگوفے چمکنے لگے

تھے۔ اپریل میں زمستان کی آخری شب میں جب بادام کے پھول جاگتے ہیں۔ اور بہار کے نقیب بن کر جھیل کے پانی میں اپنی کشتیاں تیراتے ہیں۔ پھولوں کے ننھے ننھے شکارے سطح آب پر رقصاں ولرزاں بہار کی آمد کے منتظر ہیں۔

پل کے جنگلہ کا سہارا لے کر میں ایک عرصہ سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سہ پہر ختم ہو گئی۔ شام آ گئی، جھیل ولر کو جانے والے ہاؤس بوٹ پل کی سنگلاخی محرابوں کے بیچ سے گزر گئے اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کا قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلتا گیا اور قرمزی سے سرمئی اور سرمئی سے سیاہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگڈنڈی بھی سو گئی۔ اور پھر رات کے سناٹے میں پہلا تارہ کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا کی خنکی تیز ہو گئی۔ اور نتھنے اس کے برفیلے لمس سے سن ہو گئے۔

اور پھر چاند نکل آیا۔

اور پھر وہ آ گئی۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی، بلکہ پگڈنڈی کی ڈھلان پر دوڑتی ہوئی۔ وہ میرے قریب آ کے رک گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہائے''

اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی، پھر رک جاتی، پھر تیزی سے چلنے لگی۔ اس نے میرے شانے کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پھر اپنا سر وہاں رکھ دیا۔ اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کا پریشان گھنا جنگل دور تک میری روح کے اندر پھیلتا چلا گیا اور میں نے اس سے کہا:

''سہ پہر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں''

اس نے ہنس کر کہا۔ ''اب رات ہو گئی ہے، بڑی اچھی رات ہے''۔ اس نے اپنا کمزور ننھا چھوٹا ہاتھ میرے دوسرے شانے پر رکھ دیا اور جیسے بادام کے پھولوں سے بھری شاخ جھک کر میرے کندھے پر سو گئی۔

دیر تک وہ خاموش رہی۔ دیر تک میں خاموش رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنسی اور بولی۔ ''ابا پگڈنڈی کے موڑ تک میرے ساتھ آئے تھے، کیونکہ میں نے کہا، مجھے ڈر لگتا ہے۔ آج مجھے اپنی سہیلی رجو کے گھر سونا ہے، سونا نہیں ہے، جاگنا ہے۔ کیونکہ بادام کے پہلے شگوفوں کی خوشی میں ہم سب سہیلیاں رات بھر جاگیں گی اور گیت گائیں گی اور یہی تو سہ پہر سے تیاری کر رہی تھی، ادھر آنے کی۔ لیکن دھان صاف کرنا تھا اور کپڑوں کا یہ جوڑا کل دھویا تھا آج سوکھا نہ تھا۔ اسے آگ پر سکھایا اور اماں جنگل سے لکڑیاں چننے گئی تھیں۔ وہ ابھی آئی نہ تھیں۔ اور جب تک وہ نہ آتیں میں مکئی کے بھٹے اور خشک خوبانیاں اور جر والو تمہارے لئے کیسے لا سکتی ہوں۔ دیکھو یہ سب کچھ لائی ہوں تمہارے لئے۔ ہائے تم تو سچ مچ خفا کھڑے ہو۔ میرے طرف دیکھو میں آ گئی ہوں۔ آج پورے چاند کی رات ہے...... آؤ کنارے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور جھیل کی سیر کریں''۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور میں نے اس کی محبت اور حیرت میں گم پتلیوں کو دیکھا، جن میں اس وقت چاند چمک رہا تھا اور یہ چاند مجھ سے کہہ رہا تھا، جاؤ کشتی کھول کے جھیل کے پانی پر سیر کرو۔ آج بادام کے پہلے شگوفوں کا مسرت بھرا تیوہار ہے۔ آج اس نے تمہارے لئے اپنی سہیلیوں، اپنے ابا، اپنی ننھی بہن اپنے بھائی سب کو فریب میں رکھا ہے، کیونکہ آج پورے چاند کی رات ہے اور بادام کے سپید خنک شگوفے برف کے گالوں کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں بچے کے دودھ کی طرح امنڈ آئے ہیں۔ اس کی گردن میں تم نے موتیوں کی یہ ست لڑی دیکھی۔ یہ سرخ ست لڑی میں نے اس کے گلے میں ڈال دی اور اس سے کہا ''آج رات بھر جاگے گی۔ آج کشمیر کی بہار کی پہلی رات ہے۔ آج تیرے گلے سے کشمیر کے گیت یوں کھلیں گے، جیسے چاندنی رات میں زعفران کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سرخ ستلڑیاں پہن لے''۔

چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران پتلیوں سے جھانک کے دیکھا پھر یکا یک کہیں کسی پیڑ پر ایک بلبل نغمہ سرا ہو اٹھی اور کشتیوں میں چراغ جھلملانے لگے اور تنگوں سے پرے

بستی میں گیتوں کی مدھم صدا بلند ہوئی۔ گیت اور بچوں کے قہقہے اور مردوں کی بھاری آوازیں اور ننھے بچوں کے رونے کی میٹھی صدائیں چھتوں سے اُبھریں اور زندگی کا آہستہ آہستہ سلگتا ہوا دھواں اور شام کے کھانے کی مہک، مچھلی اور بھات اور کڑم کے ساگ کا نرم نمکین اور لطیف ذائقہ پورے چاند کی رات کا بہار آفریں جوبن میرا غصہ ڈھل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کہا ''آؤ چلیں جھیل پر''

پل گزر گیا۔ پگڈنڈی گزر گئی، بادام کی درختوں کی قطار ختم ہوگئی۔ تلہ گزر گیا۔ اب ہم جھیل کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں میں مینڈک بول رہے تھے۔ مینڈک اور جھینگر اور بینڈے، ان کی بے ہنگم صداؤں کا شور بھی ایک نغمہ بن گیا تھا۔ ایک خواب ناک سمفنی اور سوئی سوئی جھیل کے بیچ میں چاند کی کشتی کھڑی تھی، ساکن چپ چاپ، محبت کے انتظار میں، تمہاری اور تمہاری محبوب کی مسکراہٹ کی منتظر، انسان کے انسان کو چاہنے کی آرزو کی منتظر، یہ پورے چاند کی حسین پاکیزہ رات کسی کنواری کے بے چھوئے جسم کی طرح محبت کے مقدس لمس کی منتظر ہے۔

کشتی خوبانی کے ایک پیڑ سے بندھی تھی۔ جو بالکل جھیل کے کنارے اگا تھا۔ یہاں پر زمین بہت نرم تھی اور چاندنی پتوں کی اوٹ سے چھنتی ہوئی آ رہی تھی اور مینڈک ہولے ہولے گا رہے تھے اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چومتا جاتا تھا اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ، اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اسے زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چوم رہا تھا۔ پہلے میں نے اس کی آنکھیں چومیں اور جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے۔ پھر میں نے اس کے رخسار چومے، اور نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو کے صد ہا گیت گانے لگے۔ پھر میں نے اس کے ہونٹ چومے اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں میں دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں اڑنے والے بادل سب مل کر ناچنے لگے۔ پھر میں نے اس کی ٹھوڑی کو چوما اور اس کی گردن کے پیچ وخم کو اور کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے کلیوں کی

طرح اور گیت بلند ہو ہو کے مدھم ہوتے گئے اور ناچ دھیما پڑتا پڑتا رک گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی۔ وہی جھیل کے نرم نرم بوسے اور کوئی چھاتی سے لگا سسکیاں لے رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کشتی کھولی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے چپو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کشتی کو کھے کر جھیل کے مرکز میں لے گیا۔ یہاں کشتی آپ ہی آپ کھڑی ہو گئی۔ نہ ادھر بہتی تھی نہ ادھر۔ میں نے چپو اٹھا کر کشتی میں رکھ لئے۔ اس نے پوٹلی کھولی۔ اس میں سے جروالو نکال کر مجھے دیئے۔ خود بھی کھانے لگی۔

جروالو خشک تھے اور کھٹے میٹھے۔

وہ بولی یہ پچھلی بہار کے ہیں۔

وہ جروالو کھاتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ آہستہ سے بولی۔

''پچھلی بہار میں تم نہ تھے''۔

پچھلی بہار میں، میں نہ تھا۔ اور جروالو کے پیڑ پھولوں سے بھر گئے تھے اور ذرا سی شاخ ہلانے پر پھول ٹوٹ کر سطح زمین پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور جروالو کے پیڑ پھلوں سے لدے پھندے تھے۔ سبز سبز جروالو۔ سخت کھٹے جروالو جو نمک مرچ لگا کر کھائے جاتے تھے اور زبان سی سی کرتی تھی اور ناک بہنے لگتی تھی۔ اور پھر بھی کھٹے جروالو کھائے جاتے تھے۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا۔ اور یہ سبز سبز جروالو، پک کر پیلے اور سنہرے اور سرخ ہوتے گئے۔ اور ڈال میں مسرت کے سرخ شگوفے جھوم رہے تھے اور مسرت بھری آنکھیں، چمکتی ہوئی معصوم آنکھیں انہیں جھومتا ہوا دیکھ کر رقص سا کرنے لگتیں۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور سرخ سرخ جروالو خوبصورت ہاتھوں نے اکٹھے کر لئے۔ خوبصورت لبوں نے ان کا تازہ رس چوسا اور انہیں اپنے گھر کی چھت پر لے جا کر سوکھنے کیلئے رکھ دیا کہ جب یہ جروالو سوکھ جائیں گے، جب ایک بہار گزر جائے گی اور دوسری بہار آنے کو ہو گی تو میں آؤں گا اور اس کی لذت سے لطف اندوز ہو سکوں گا۔

جروالو کھانے کے بعد ہم نے خشک خوبانیاں کھائیں۔ خوبانی پہلے تو بہت میٹھی معلوم نہ ہوتی مگر جب دہن کے لعاب میں گھل جاتی تو شہد و شکر کا مزہ دینے لگتی۔

''نرم نرم بہت میٹھی ہیں یہ''میں نے کہا۔

اس نے ایک گٹھلی کو دانتوں سے توڑا اور خوبانی کا بیج نکال کر مجھے دیا ''کھاؤ''

بیج بادام کی طرح میٹھا تھا۔

''ایسی خوبانیاں میں نے کبھی نہیں کھائیں''۔

''اس نے کہا؟'' یہ ہمارے آنگن کا پیڑ ہے۔ ہمارے ہاں خوبانی کا ایک ہی پیڑ ہے۔ مگر اتنی بڑی سرخ اور میٹھی خوبانی ہوتی ہیں اس کی کہ میں کیا کہوں۔ جب خوبانیاں پک جاتی ہیں تو میری ساری سہلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اور خوبانیاں کھلانے کو کہتی ہیں...... پچھلی بہار میں......

اور میں نے سوچا، پچھلی بہار میں، میں نہ تھا۔ مگر خوبانی کا پیڑ آنگن میں اسی طرح کھڑا تھا۔ پچھلی بہار میں وہ نازک پتوں سے بھر گیا تھا۔ پھر ان میں کچی خوبانیوں کے سبز اور نوکیلے پھل لگے تھے۔ ابھی ان خوبانیوں میں گٹھلی پیدا ہوئی تھی اور یہ کچے کھٹے پھل دوپہر کے کھانے کے ساتھ چٹنی کا کام دیتے تھے۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور ان خوبانیاں میں گٹھلیاں پیدا ہوگئی تھیں اور خوبانیوں کا رنگ ہلکا سنہرا ہونے لگا تھا اور گٹھلیوں کے اندر نرم نرم بیج اپنے ذائقے میں سبز باداموں کو بھی مات کرتے تھے۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور یہ سرخ سرخ خوبانیاں جو اپنی رنگ میں کشمیری دوشیزاؤں کی طرح صبیح تھیں اور ایسی ہی رس دار۔ سبز سبز پتوں کے جھومروں سے جھانکتی نظر آتی تھیں۔ پھر الہڑ لڑکیاں آنگن میں ناچنے لگیں۔ اور چھوٹا بھائی درخت کے اوپر چڑھ گیا اور خوبانیاں توڑ توڑ کر اپنی بہن کی سہیلیوں کیلئے پھینکتا گیا۔ کتنی میٹھی تھیں، وہ پچھلی بہار کی رس بھری خوبانیاں۔ جب میں نہ تھا......

خوبانیاں کھا کے اس نے مکئی کا بھٹا نکالا۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ سنہرا سینکا ہوا بھٹا اور کرکرے دانے صاف شفاف موتیوں کی سی جلا لئے ہوئے اور ذائقے میں بے حد

شیریں۔

''وہ بولی'' یہ مصری مکئی کے بھٹے ہیں۔

''بے حد میٹھے ہیں'' میں بھٹا کھاتے ہوئے بولا۔

وہ بولی'' پچھلی فصل کے رکھے تھے، گھڑوں میں چھپا کے۔اماں کی آنکھ سے اوجھل''

میں نے بھٹا ایک جگہ سے کھایا۔دانوں کی چند قطاریں رہنے دیں، پھر اس نے اسی جگہ سے کھایا اور دانوں کی چند قطاریں میرے لئے رہنے دیں۔جنہیں میں کھانے لگا اور اس طرح ہم دونوں ایک ہی بھٹے سے کھاتے گئے۔اور میں نے سوچا، یہ مصری مکئی کے بھٹے کتنے میٹھے ہیں۔یہ پچھلی فصل کے بھٹے۔جب تو تھی لیکن میں نہ تھا۔جب تیرے باپ نے ہل چلایا تھا کھیتوں میں۔گوڈی کی تھی، بیج بوئے تھے، بادلوں نے پانی دیا تھا۔زمین نے سبز سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اگائے تھے۔جن میں تو نے نلائی کی تھی۔پھر پودے بڑے ہو گئے تھے اوران کے سروں پر سریاں نکل آئی تھیں اور ہوا میں جھومنے لگی تھیں۔اور تو مکئی کے پودوں پر ہرے ہرے بھٹے دیکھنے جاتی تھی۔جب میں نہ تھا۔لیکن بھٹوں کے اندر دانے پیدا ہو رہے تھے، دودھ بھرے دانے، جن کی نازک جلد کے اوپر اگر ذرا سا بھی ناخن لگ جائے تو دودھ باہر نکل آتا ہے۔ایسے نرم و نازک بھٹے اس دھرتی نے اگائے تھے اور میں نہ تھا۔اور پھر یہ بھٹے جوان اور توانا ہو گئے اوران کا رس پختہ ہو گیا۔پختہ اور سخت۔اب ناخن لگانے سے کچھ نہ ہوتا تھا۔اپنے ناخن ہی کے ٹوٹنے کا احتمال تھا۔بھٹوں کی مونچھیں جو پہلے پیلی تھیں۔اب سنہری اور پھر آخر میں سیاہی مائل ہوتی گئیں۔مکئی کے بھٹوں کا رنگ زمین کی طرح بھورا ہوتا گیا۔میں جب بھی نہ آیا تھا اور پھر کھیتوں میں کھلیان لگے اور کھلیانوں میں بیل چلے اور بھٹوں سے دانے الگ ہو گئے۔اور تو نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ محبت کے گیت گائے اور تھوڑے سے بھٹے چھپا کے سینک کے الگ رکھ دیئے۔جب میں تھا، دھرتی تھی، تخلیق تھی، محبت کے گیت تھے۔آج پر سینکے ہوئے بھٹے تھے۔لیکن میں نہ تھا۔

میں نے مسرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔'' آج پورے چاند کی رات کو جیسے

ہر بات پوری ہوگئی ہے۔ کل رات پوری نہ تھی آج پوری ہے''۔

اس نے بھٹا میرے منہ سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹوں کا گرم گرم نمناک لمس ابھی تک اس بھٹے پر تھے۔ میں نے کہا ''میں تمہیں چوم لوں''؟

وہ بولی ''ہش، کشتی ڈوب جائے گی''

''تو پھر کیا کریں؟ میں نے پوچھا۔

وہ بولی ''ڈوب جانے دو''

وہ پورے چاند کی رات مجھے اب تک نہیں بھولتی۔ میری عمر ستر برس کے قریب ہے۔ لیکن وہ پورے چاند کی رات میرے ذہن میں اسی طرح چمک رہی ہے، جیسے ابھی وہ کل آئی تھی۔ ایسی پاکیزہ محبت میں نے آج تک نہیں کی ہوگی۔ اس نے بھی نہیں کی ہوگی۔ وہ جادو ہی کچھ اور تھا۔ جس نے پورے چاند کی رات کو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یوں ملا دیا کہ پھر وہ گھر نہیں گئی اسی رات میرے ساتھ بھاگ آئی اور ہم پانچ چھ دن محبت میں کھوئے ہوئے بچوں کی طرح ادھر ادھر جنگلوں کے کنارے ندی نالوں پر اخروٹوں کے سائے تلے گھومتے رہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر پھر میں نے اسی جھیل کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا اور اس میں ہم دونوں رہنے لگے۔ کوئی ایک مہینے کے بعد میں سری نگر گیا اور اس سے یہ کہہ کے گیا کہ تیسرے دن لوٹ آؤں گا، تیسرے دن میں لوٹ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک نوجوان سے گھل مل کر باتیں کر رہی ہے۔ وہ دونوں ایک ہی رکابی میں کھانا کھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے ہیں اور ہنستے جاتے ہیں میں نے انہیں دیکھ لیا۔ لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی مسرت میں اس قدر محو تھے کہ انہوں نے نہ دیکھا۔ اور میں نے سوچا کہ یہ پچھلی بہار یا اس سے بھی پچھلی بہار کا محبوب ہے۔ جب میں نہ تھا۔ اور پھر شاید آگے بھی کتنی ہی ایسی بہاریں آئیں گی، کتنی ہی پورے چاند کی راتیں، جب محبت ایک فاحشہ عورت کی طرح بے قابو ہو جائے گی اور عریاں ہو کے رقص کرنے لگے گی۔ آج تیرے گھر میں خزاں آ گئی ہے۔ جیسے ہر بہار کے بعد آتی ہے۔ اب تیرا یہاں کیا کام۔ اس لئے میں یہ سوچ کر ان سے ملے بغیر

ہی واپس چلا گیا اور اپنی پہلی بہار سے کبھی نہیں ملا۔

اور اب میں اڑتالیس برس کے بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ میرے بیٹے میرے ساتھ ہیں۔ میری بیوی مر چکی ہے۔ لیکن میرے بیٹوں کی بیویاں اور بچے میرے ساتھ ہیں اور ہم لوگ سیر کرتے کرتے سمل جھیل کے کنارے آ نکلے اور اپریل کا مہینہ سہ پہر سے شام ہو گئی ہے اور میں دیر تک پل کے کنارے کھڑا بادام کے پیڑوں کی قطاریں دیکھتا جاتا ہوں اور خشک ہوا میں سفید شگوفوں کے گچھے لہراتے جاتے ہیں اور پگڈنڈی کی خاک پر سے کسی جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک حسین دوشیزہ لڑکی ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دبائے پل پر سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے اور میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ دور پار تنگوں سے پرے بستی میں کوئی بیوی اپنے خاوند کو آواز دے رہی ہے۔ وہ اسے کھانے پر بلا رہی ہے۔ کہیں سے ایک دروازہ بند ہونے کی صدا آتی ہے اور ایک روتا ہوا بچہ یکا یک چپ ہو جاتا ہے۔ چھتوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پرندے شور مچاتے ہوئے ایک دم درختوں میں اپنے پر پھڑپڑاتے ہیں اور پھر ایکدم چپ ہو جاتے ہیں۔ ضرور کوئی مانجھی گا رہا ہے۔ اور اس کی آواز گونجتی گونجتی افق کے اس پار گم ہوتی جا رہی ہے۔

میں پل کو پار کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ میرے بیٹے اور ان کی بیویاں اور بچے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے نہیں۔ یہاں پر بادام کے پیڑوں کی قطار ختم ہو گئی۔ جھیل کا کنارہ ہے۔ وہ خوبانی کا درخت ہے۔ لیکن کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ مگر کشتی، یہ کشتی کیا یہ وہی کشتی ہے۔ سامنے وہ گھر ہے۔ میری پہلی بہار کا گھر۔ میری پورے چاند کی رات کی محبت۔

گھر میں روشنی ہے بچوں کی صدائیں ہیں۔ کوئی بھاری آواز میں گانے لگتا ہے۔ کوئی بڑھیا اسے چیخ کر چپ کرا دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں، آدھی صدی ہو گئی۔ میں نے اس گھر کو نہیں دیکھا۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ آخر میں نے اسے خریدا تھا۔ دیکھا جائے تو میں ابھی تک اس کا مالک ہوں۔ دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے۔ میں گھر کے اندر چلا جاتا ہوں۔

بڑے اچھے پیارے بچے ہیں۔ ایک جوان عورت اپنے خاوند کیلئے رکابی میں کھانا رکھ رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔ دو بچے لڑ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے چپ ہو جاتے ہیں۔ بڑھیا جو ابھی غصہ میں ڈانٹ رہی تھی۔ تھم کے پاس آ کے کھڑی ہو جاتی ہے، کہتی ہے ''کون ہو تم؟''

میں نے کہا ''یہ میرا گھر ہے''۔

وہ بولی تمہارے باپ کا ہے۔

میں نے کہا ''میرے باپ کا نہیں ہے، میرا ہے، کوئی اڑتالیس برس ہوئے، میں نے اسے خریدا تھا۔ بس اس وقت تو یونہی میں اسے دیکھنے کیلئے چلا آیا۔ آپ لوگوں کو نکالنے کیلئے نہیں آیا ہوں۔ یہ گھر تو بس سمجھئے اب آپ ہی کا ہے میں تو یونہی...... میں یہ کہہ کر لوٹنے لگا بڑھیا کی انگلیاں سختی سے تھم پر جم گئیں۔ اس نے سانس زور سے اندر کو کھینچی۔ بولی تو تم ہو......اب اتنے برس کے بعد کوئی کیسے پہچانے......

وہ تھم سے لگی دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نیچے آنگن میں چپ چاپ کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔ پھر وہ آپ ہی ہنس دی۔ ''آؤ میں تمہیں اپنے گھر کے لوگوں سے ملاؤں...... دیکھو، یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ اس سے چھوٹا ہے، یہ بڑے بیٹے کی بیوی ہے۔، یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ پوتی...... یہ میرا خاوند ہے۔ شش، اسے جگانا نہیں، برسوں سے اسے بخار آ رہا ہے۔، سونے دو اسے......''

''وہ بولی تمہاری کیا خاطر کروں''

میں نے دیوار پر کھونٹی سے ٹنگے ہوئے مکئی کے بھٹوں کو دیکھا، سینکے ہوئے بھٹے سنہرے موتیوں کے سے شفاف دانے۔

ہم دونوں مسکرا دیئے۔

وہ بولی ''تم کھا لو میرے تو بہت سے دانت جھڑ چکے ہیں، جو ہیں بھی وہ کام نہیں کرتے''۔

میں نے کہا ''یہی حال میرا بھی ہے۔ بھٹا نہ کھا سکوں گا''

مجھے گھر کے اندر گھستے دیکھ کر میرے گھر کے افراد بھی اندر چلے آئے تھے۔ اب خوب گہما گہمی تھی۔ بچے ایک دوسرے سے بہت جلد مل جل گئے۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر چلے آئے۔ آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے چلے گئے۔

وہ بولی ''میں نے چھ برس تمہارا انتظار کیا۔ تم اس روز کیوں نہیں آئے؟''

میں نے کہا ''میں آیا تھا۔ مگر تمہیں کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا''۔

''کیا کہتے ہو'' وہ بولی۔

ہاں تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی، ایک ہی رکابی میں اور وہ تمہارے منہ میں اور تم اس کے منہ میں لقمے ڈال رہے تھیں''۔

وہ اک دم چپ ہوگئی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' میں حیران ہو کر پوچھا۔

وہ بولی ''ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا''

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ ''وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اسی روز تم بھی آنے والے تھے۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک لیا۔ کہ تم سے مل کر جائے۔ تم پھر آئے ہی نہیں''۔

وہ اک دم سنجیدہ ہوگئی۔ چھ برس میں نے انتظار کیا۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے خدا نے بیٹا دیا۔ مگر ایک سال بعد وہ بھی مر گیا۔ چار سال اور میں نے تمہاری راہ دیکھی۔ مگر تم نہیں آئے۔ پھر میں نے شادی کر لی''۔

وہ بچے باہر نکل آئے۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچہ دوسری بچی کو مکئی کا بھٹا کھلا رہا تھا۔

اس نے کہا ''وہ میرا پوتا ہے''

میں نے کہا ''وہ میری پوتی ہے''

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے جھیل کے کنارے دور تک چلے گئے۔ زندگی کے دو

خوبصورت مرقعے۔ ہم دیر تک انہیں دیکھتے رہے۔ وہ میرے قریب آ گئی۔ بولی آج تم آئے ہوتو مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ اب اپنی زندگی بنا لی ہے۔ اس کی ساری خوشیاں اور غم دیکھے ہیں۔ میرا ہرا بھرا گھر ہے۔ اور آج تم بھی آئے ہو، مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے''۔

میں نے کہا ''یہی حال میرا ہے۔ سوچتا تھا زندگی بھر تمہیں نہیں ملوں گا۔ اس لئے اتنے برس ادھر کبھی نہیں آیا۔ اب آیا ہوں تو ذرا رتی بھر بھی برا نہیں لگ رہا''۔

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ بچے کھیلتے کھیلتے ہمارے پاس واپس آ گئے۔ اس نے میری پوتی کو اٹھا لیا، میں نے اس کے پوتے کو، اس نے میری پوتی کو چوما، میں نے اس کے پوتے کو، اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت اور مسرت سے کہہ رہا تھا ''انسان مر جاتے ہیں، لیکن زندگی نہیں مرتی۔ بہار ختم ہو جاتی ہے، لیکن پھر دوسری بہار آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن زندگی کی بڑی عظیم سچی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے۔ یہ تم نے دیکھی، اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہو گے۔ لیکن زندگی بھی ہو گی اور محبت بھی ہو گی اور خوبصورت اور رعنائی اور معصومیت بھی......

بچے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ سے کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت کے قریب چلے گئے، جہاں کشتی بندھی تھی۔

میں نے پوچھا ''یہ وہی درخت ہے''۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''نہیں یہ دوسرا درخت ہے''۔

◆◆◆

ممتا

یہ کوئی دو بجے کا وقت تھا، بادلوں کا ایک ہلکا سا غلاف چاند کو چھپائے ہوئے تھا۔ یکا یک میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھ والی چار پائی پر اماں سسکیاں لے رہی ہیں۔

''کیوں امی؟'' میں نے گھبرا کر آنکھیں ملتے ملتے پوچھا۔

''کیوں...... امی'' اماں نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان میرے سوال کو غصہ سے دہراتے ہوئے کہا۔ ''شرم نہیں آتی، باپ کو بھی اور بیٹے کو بھی اتنے بڑے ہو گئے ہو، کچھ خدا کا خوف نہیں''۔

''آخر ہوا کیا؟'' میں نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا۔ ''یہ آدھی رات کے وقت رونا کیسا؟''

گرمیوں کے دن تھے ہم سب برآمدے میں سو رہے تھے۔ مگر ابا سامنے ایک کمرے میں سو رہے تھے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی اور انہیں اکثر گرمیوں میں بھی سردی لگ جانے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اس لیے عموماً وہ اندر ہی سویا کرتے ہیں آخر ان کی آنکھ بھی کھل گئی۔ وہیں بستر پر سے کروٹ بدل کر بولے۔ ''کیا بات ہے وحید؟ تمہاری اماں کیوں رو رہی ہیں؟''

''میں کیا بتاؤں ابا۔ بس رو رہی ہیں''۔

''ہاں اور تمہیں کس بات کی فکر ہے۔'' اماں کی ہچکیاں اور تیز ہو گئیں۔ ''پتہ نہیں میرا

لال اس وقت کس حالت میں ہے۔ میرا چھوٹا محمود، اورتم یہاں پڑے سور ہے ہو۔ وہاں اس کا کون ہے، نہ ماں، نہ بھائی، نہ بہن اورتم خراٹے لے رہے ہو۔ آرام سے جیسے تمہیں کسی بات کی فکر ہی نہیں (سسکتے ہوئے) میں نے ابھی ابھی اپنے چھوٹے محمود کوخواب میں دیکھا ہے۔ وہ ایک میلے کچیلے بستر میں پڑا بخار سے تپ رہا تھا۔ اس کا پنڈا تنور کی طرح گرم تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اماں، اماں کہہ رہا تھا......'' یہ کہہ کراماں زورزور سے رونے لگیں۔

اماں کا ''چھوٹا محمود'' اور میرا بڑا بھائی لاہور بی اے میں تعلیم پا تا تھا، تھرڈ ایئر میں، میں ایف کا امتحان دے کرلاہور سے یہاں مئی کے مہینے میں آ گیا تھا، مگر محمود کوابھی لاہور کی تپتی ہوئی فضاؤں میں پورا ایک مہینہ اورگزارنا تھا۔ اماں بہت پریشان تھیں اور سچ پوچھیے تو ہم سب بہت پریشان تھے۔ ہم نے اسے پرسوں ایک تار بھی دے دیا تھا اور مدتوں کے بعد اچانک محمود کا ایک خط بھی آیا تھا۔ چند منحنی سطور تھیں۔ لکھا تھا۔''میں بیمار ہوں، ملیریا کا بخار ہے۔ لیکن اب ٹوٹ رہا ہے۔ چند دنوں سے یہاں بہت بارش ہو رہی ہے۔ اگر لاہور کا یہ حال ہے تو اسلام آباد میں کیا ہوگا۔ کیا کشمیر آنے کا راستہ کھل گیا۔ جلدی لکھیے کہ کس راستے سے آؤں، کیا جموں با نہال روڈ سے آؤں...... کہ کوہالہ اوراوڑی سڑک سے، کونسا راستہ بہتر رہے گا؟'' ہم نے سوچ بچار کے بعد ایک تار اور دے دیا تھا۔ گو بارش بہت ہو رہی تھی اور دونوں سڑکیں شکستہ حالت میں تھیں۔ پھر بھی کوہالہ اوڑی روڈ، بانہال روڈ سے بہتر حالت میں تھی۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ محمود کوہالہ روڈ ہی سے آئے۔ اب آدھی رات کے وقت یہ افتاد آ پڑی۔

ابا کی نیند پریشان ہوگئی تھی چیں بچیں ہوتے ہوئے بولے۔''تو اس کا کیا کیا جائے؟ اور تمہیں تو یونہی دل میں وسوسے اٹھا کرتے ہیں۔ بھلا اس کا علاج کیا ہے؟ آخر محمود کوئی بچہ تو نہیں؟ تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ ہزاروں ماؤں کے لال لاہور میں پڑھتے ہیں اور ہوسٹلوں میں رہتے ہیں۔ آتا ہی ہوگا، اگر آج صبح وہ لاہور سے چلا تو شام کو وہ راولپنڈی پہنچ گیا ہوگا کل کوہالہ اور......''

اماں جلدی سے بولیں۔''اور......اور؟ کیا غضب کرتے ہو اور اگر خدا نہ کرے۔

اس کا بخار ابھی نہ ٹوٹا ہو تو پھر؟ میں پوچھتی ہوں تو پھر؟'' یہ کہہ کر اماں رک گئیں اور دوپٹے سے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں۔

''مجھے موٹر منگوا دو۔ میں ابھی لاہور جاؤں گی''۔

''اب تم سے کون بحث کرے ہمیں تو نیند آئی ہے'' کہ کہہ کر ابا کروٹ بدل کر سو رہے۔ میں نے بھی یہی مناسب جان کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر کانوں میں ماں کی مدہم سسکیوں کی آواز جسے وہ دبانے کی بہت کوشش کر رہی تھیں برابر آ رہی تھیں۔ کیا دل ہے ماں کا اور کتنی عجیب ہستی ہے اس کی؟ میں آنکھیں بند کیے سوچنے لگا۔ ماں کا دل، ماں کی محبت، مامتا، کس قدر عجیب جذبہ ہے، عالم جذبات میں اس کی نظیر ملنی محال ہے۔ نہیں یہ تو اپنی نظیر آپ ہے۔ ایک سپنے کے دھندلکے میں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھتی ہے اور چونک پڑتی ہے۔ لرز جاتی ہے۔ مامتا...... کیا اس جذبے کی اساس محض جسمانی ہے، محض اس لیے کہ بیٹا ماں کے گوشت و پوست کا ایک ٹکڑا ہے؟ اور کیا ہم سچ مچ فلابیر کے تخیل کے مطابق اس کائنات میں اکیلے ہیں، تنہا، بے یارو مددگار، ایک دوسرے کو سمجھتے ہوئے بھی نا آشنا، مگر میں بھی تو محمود کا بھائی ہوں، میری رگوں میں وہی خون موجزن ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کے ان بیس سالوں میں صرف دو دفعہ محمود سے جدا ہوا ہوں اور وہ بھی نہایت قلیل عرصوں کیلئے۔ پھر میں کیوں اس قدر اس کے لئے بیتاب و بیقرار نہیں۔ مامتا...... کیا ہم سچ مچ پتھروں کے تودوں کی طرح ہیں، مصر کے میناروں کی طرح خوبصورت لیکن بے جان اشوک کے کتبوں کی طرح سبق آموز لیکن بے حس، بے روح؟ مامتا...... بدھ نے کہا تھا کہ یہ دنیا دھوکا ہے، سراب ہے، مایا ہے، ہوگی۔ لیکن یقین نہیں پڑتا آخر یہ حسین جذبہ کہاں سے آیا؟ اور کائنات کے ایک گوشے میں سسکتی ہوئی اماں کیا یہ بھی ایک دھوکا ہے؟ سچ جانیے یقین نہیں پڑتا ہے۔

چھوٹا محمود...... میرا ننھا محمود...... میرا لال

امی ہلکی ہچکیوں میں بھائی کا نام لے رہی تھیں۔ کتنی معمولی سی بات تھی۔ بھائی جان شاید ابھی لاہور ہی میں ہوں گے۔ ضیافتیں اڑاتے ہوں گے، سنیما دیکھتے ہوں گے۔ یا اگر

لاہور سے چلے آئے ہوں تو راولپنڈی میں اس وقت خواب خرگوش میں پڑے خراٹے لے رہے ہوں گے۔ ملیریا کیا عجیب ملیریا کا بخار مطلق ہی نہ ہو۔ میں بھائی جان کے بہانوں کو خوب جانتا ہوں، اماں بھی جانتی ہیں مگر پھر بھی رو رہی ہیں۔ آخر کیوں؟ ماں مامتا! شاید یہ کوئی روحانی قرابت ہے، شاید اس دنیا کے وسیع صحرا میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ شاید ہم محض پتھروں کے تودوں کی طرح نہیں ہیں۔ شاید اس انسانی مٹی میں کسی ازلی آگ کے شعلوں کی تڑپ ہے معاً مجھے موپاساں کا افسانہ ''تن تنہا'' یاد آ گیا۔ جس میں اس نے اس شدید احساس تنہائی کا رونا رویا ہے۔ آہ بے چارا موپاساں، وہ ایک ماہر نفسیات تھا اور ایک ماہر نفسیات کی طرح وہ کئی بار نفسیاتی واردات کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر رہا اس کے افکار نے اسے کثرت سے غلط راستہ پر ڈال دیا۔ ''تن تنہا'' ایک ایسی ہی مثال ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

''عورت ایک سراب ہے اور حسن ایک فروعی امر۔ ہم ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتے، میاں بیوی سالہا سال ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں...... دو دوست ملتے ہیں اور ہر دوسری ملاقات میں ایک دوسرے سے دور چلے جا رہے ہیں...... نسوانی محبت مستقبل دھوکا ہے...... اور جب میں عورت کو دیکھتا ہوں تو مجھے چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے''۔

میں نے آنکھیں کھول کر اماں کی طرف دیکھا، امی روتے روتے سو گئی تھیں، گال آنسوؤں سے گیلے تھے اور بند آنکھوں کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ کیا امی موت ہے؟ اور کیا مامتا بھی کوئی ایسا ہی ہلاکت آفریں جذبہ ہے؟ شاید موپاساں غلطی پر تھا، شاید اسے یہ لکھتے وقت اپنی شفیق ماں کی یاد نہ آئی تھی۔ وہ اس کی جاں بخشش لوریاں، وہ نرم نرم تھپکیاں جبکہ وہ بچوں کی طرح صرف ''اوں اوں'' کہہ کر بلبلا اٹھتا تھا اور اس کی چھاتی سے لپٹ جاتا تھا...... نسوانی محبت مستقل دھوکہ ہے...... شاید اسے اپنی ماں کے وہ طویل بوسے بھول گئے کہ جب بڑا ہونے پر بھی اس کا نفسیاتی سر اپنے بازوؤں میں لے لیتی تھی اور پیار کرتی تھی۔ جب وہ مامتا سے بیقرار ہو جاتی تھی اور ان کی غیر حاضری میں بھی اس کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ اس کی ہر غلطی کو

بچوں کی بھول سے تعبیر کیا کرتی تھی اور گناہ کو نیکی میں مبدل کر دیتی تھی۔ اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں وہ اس شدید احساس تنہائی جس کی موپاساں کو شکایت ہے، جو دنیاوی کلفتوں اور الفتوں میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا، نجانے وہ ماں کی گود میں آ کر کیسے ناپید ہو جاتا ہے؟ ماں کے جذبہ محبت میں ایک ایسی دیوانگی و وارفتگی ہے جو اس کی انانیت کو فنا کر دیتی ہے اور اس کی ذات کو بچوں میں منتقل کر دیتی ہے۔

یقیناً ہم اس دنیا میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ ہماری مائیں ہیں...... یقیناً......مگر......

غڑغوں، غڑغوں، ککڑوں کوں، کبوتر، مرغ، چڑیاں، دوشیزہ سحر کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان کی خوش الحانی نے مجھے بیدار کر دیا، میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں چار پائی سے نیچے لٹکا دیں اور آنکھیں ملنے لگا۔ اتنے میں آنگن سے اماں کی آواز آئی۔

''بیٹا وحید اٹھو، محمود آ گئے''۔

آنکھیں کھول کر دیکھا تو سچ مچ...... اماں آنگن میں اگے ہوئے پنجتار کے بوٹے کے نیچے ایک مونڈھے پر بیٹھی تھی اور محمود ان کے پیروں پر جھکا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اٹھا آنگن میں ہم دونوں بھائی بغل گیر ہوئے۔

''اتنے دن کہاں رہے'' میں نے محمود سے پوچھا۔

محمود نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ایک آنکھ میچ لی۔ پھر گردن موڑ کر پنچ تارے کے سرخ سرخ پھولون کے گچھوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

''کوئی سات روز جھڑی رہی، متواتر بارش ہونے سے سڑک جا بجا سے بہہ گئی تھی اور سپرنٹنڈنٹ ٹریفک نے راستہ بند کر دیا تھا''۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور یہ کہہ کر ایک ہاتھ میرے ہاتھ کو پکڑ کر زور سے ہلانے لگا۔

اماں کدو چھیل رہی تھیں اور ہم دونوں کو دیکھتی جاتی تھیں۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں۔ آنسوؤں کے ان دو سمندروں میں خوشیوں کی جل پریاں ناچ رہی تھیں۔

◆◆◆

مچھلی جال

گاؤں سویا ہوا تھا، بھورے بھورے مچھلی جال دھوپ میں سوکھنے کیلئے لکڑی کی اونچی کھپچیوں پر تنے ہوئے تھے اور ان کے شطرنجی سائے میں بڈھے ماہی گیر سو رہے تھے، ساحل کی ریت میں آدھے سے زیادہ اندر دھنسا ہوا سفید شوالا اپنے کلس پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اونچے ٹیلے پر ناریل کا درخت تھا، جہاں ایک گدھا چپ چاپ کھڑا تھا، اس سے پرے باڑھ تھی جس کے اندر ناریل کا جھنڈ تھا، جو دور تک اندر گاؤں میں چلا گیا تھا اور جس نے ماہی گیروں کے چھپروں کو نظر سے اوجھل کر دیا تھا۔

یہاں ساحل کے کنارے کی ریت کس قدر خشک اور نرم تھی، ساحل سے جتنا دور جاؤ، ریت گرم اور سخت ہوتی جاتی تھی۔ اور ٹیلوں کے کنارے جہاں سمندر جھاگ سوکھ گیا تھا اور چھوٹی چھوٹی مہین سپیوں اور سنکھوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہاں کی ریت پر پاؤں سے پتلے کانچ کے ٹوٹنے کی آواز پیدا ہوتی تھی اور پاؤں ایک عجیب گدگدا دینے والی کرکری لذت سے آشنا ہوتے تھے۔ گل دیر تک ان ٹیلوں کے کنارے چلتا رہا چلتے چلتے بیچ میں رک رک کر خوبصورت سپیاں، گھونگھے اور سنکھ جمع کرتا۔ ساحل ایک نیم دائرے کی صورت میں بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان نیم دائرے کے سرے پر یہ گاؤں تھا، دوسرے سرے پر اس کا اپنا گاؤں، بیچ میں یہ لمبا کٹا پھٹا ساحل تھا اور اونچے ٹیلوں سے بھرا ہوا، گل چلتے چلتے یکا یک ٹھٹک گیا۔ ایک

بڑے ٹیلے کی اوٹ میں ایک کشتی اوندھے منہ پڑی تھی اور اس کے قریب ایک لڑکی اوندھے منہ لیٹی تھی۔ گل نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، اس نے اس لڑکی کے ننھے ننھے پاؤں سرخ مہندی میں رچے ہوئے دیکھے، اس نے اس کے سیاہ ابرق کی طرح چمکتے ہوئے جوڑے میں گل شفق کا ایک بہت بڑا پھول دیکھا۔ جس کی رنگت بالکل سونے کی طرح تھی، ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے تھا، دوسرا ہاتھ ساحل کی ریت پر پڑا تھا، گل نے اس کے ہاتھ کی چوڑیاں گنیں، گہرے سرخ کانچ کی سات چوڑیاں تھیں لیکن اب کے اسے یہ ہاتھ بہت خوبصورت معلوم ہوا۔ اس نے یہ ہاتھ دیکھا رخساروں پر سوئی ہوئی پلکوں کی آراستہ صف کو دیکھا۔ ان ننھے ننھے نتھنوں کو دیکھا سانس کی لہروں سے باریک سپیوں کی طرح ہل رہے تھے اور پھر اس ہاتھ کو دیکھا جو اس کی طرف پھیلا ہوا ساحل کی ریت پر پڑا تھا اور جس کی کلائی میں سات چوڑیاں تھیں اور وہ وہیں ریت میں قریب بیٹھ گیا اور کانچ کی چوڑیوں کو الگ الگ کرنے لگا۔

''ہٹو مجھے سونے دو''۔ لڑکی نے اسی طرح لیٹے لیٹے ہلے جلے بغیر کہا۔ اور گل ایک لمحے کیلئے چونک کر اچھل گیا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکی سو رہی ہے۔ لڑکی نے پھر کہا ''تم کب کے یہاں کھڑے ہو''۔ میں نے سوچا آپ چلے جاؤ گے مجھے دیکھ کر اب تو چلے جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے۔ دیکھو کتنی اچھی دھوپ ہے اف......اف......ام'' لڑکی نے اب اپنے بازو ریت پر پھیلا دیئے اور اپنی طرف سے خوب جم کر سوگئی۔

گل نے اس کے جوڑے میں سجے سنہری پھول کو دیکھا اور پھر کانچ کی چوڑیاں گننے لگا۔ جب پوری سات گن چکا تو اس نے آہستہ سے اس کے جوڑے سے وہ پھول نکال لیا۔

وہ لڑکی پھر اسی طرح لیٹے لیٹے بولی۔ ''تم ابھی تک نہیں گئے''۔

گل نے کہا۔ ''میں تمہارے لئے شفق کا پھول لایا ہوں، دیکھو''۔

لڑکی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے جوڑے پر گیا، گل کا خیال ٹھیک نکلا لڑکی بہت خوبصورت تھی۔

لڑکی نے کہا۔ ''لاؤ میرا پھول مجھے دے دو''۔

گل نے پھول آگے بڑھایا۔

لڑکی نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

گل نے ہاتھ پیچھے ہٹا کر کہا۔ ''اونہوں، ایسے نہیں۔ میں خود تمہارے جوڑے میں لگاؤں گا''۔

''نہیں۔'' لڑکی نے بڑی سختی سے کہا۔

''نہیں؟ تو اچھا میں چلتا ہوں، خدا حافظ''

گل پھول اپنے ہاتھ میں لیے دو قدم چلا، لڑکی نے کہا، اچھا آ جاؤ۔

وہ اپنے جوڑے میں پھول لگوانے کیلئے ایک بت کی طرح اکڑ کر بیٹھ گئی اس سے اس کے سینے کا ابھار اور بھی تن گیا اور کمر کا خم اور بھی نمایاں ہو گیا اور گل نے سوچا، اس لڑکی کا نام ضرور پوچھنا چاہیے۔ اس نے جوڑے میں پھول لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ہم نہیں جانتے......'' لڑکی نے کہا۔

''کیوں نہیں جانتے؟''

''میں نہیں بتاؤں گی''۔

''کیوں نہیں بتاؤ گی؟''

لڑکی نے غصے سے ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے اور کہا۔ ''اب تم چلے جاؤ، یہ سامنے کے ٹیلے پر میرا گاؤں ہے، ابھی شور مچاؤں گی تو اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ تمھارے جسم پر گوشت کا ایک تکہ بھی نہیں ملے گا۔ یہ تمہارا جسم جو اس وقت سمندری مچھلی کی طرح پلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں صرف مچھلی کا کانٹا رہ جائے گا''۔

پھول جوڑے میں سج گیا۔

لڑکی نے ہنس کر کہا۔ ''مگر مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہارے اندر وہ مچھلی کا کانٹا بھی ہے کہ نہیں۔ بغیر کانٹے کی بھی تو مچھلیاں ہوتی ہیں نا؟''

گل نے یکا یک اسے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ لڑکی تڑپ کر

اچھلی اوراس کا ہاتھ زور سے گل کے رخسار پر پڑا۔گل نے فوراً ایک ہاتھ لڑکی کے منہ پر رکھ دیا اور وہ دونوں لڑنے لگے۔لڑکی اس کی گرفت سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ اور زور زور سے چلانا چاہتی تھی مگر گل کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔اوراس کا دوسرا ہاتھ بڑی سختی سے اس کے منہ پر جمایا تھا۔گل کو معلوم تھا کہ اس نے لڑکی کو چیخ کا موقع دیا تو اس کی خیر نہیں۔ یکا یک اسے معلوم ہوا کہ لڑکی اس کی گرفت سے نکلی جا رہی ہے۔ وہ دونوں بازوؤں سے لڑ رہی تھی اور گل صرف ایک بازو سے کام لے رہا تھا اور وہ دونوں لوٹتے پوٹتے بالکل کشتی کے قریب چلے گئے۔لڑکی نے کوشش کر کے دونوں ہاتھوں سے گل کا ایک ہاتھ موڑ لیا۔اب ایک طرف کشتی تھی گل ادھر منہ موڑ سکتا تھا۔ دوسری طرف ٹیلا تھا، بیچ میں گل پھنس گیا تھا۔لڑکی نے کوشش کر کے اپنا منہ پرے ہٹا لیا۔ بولی ''اب بتاؤ'' اس نے گل کے منہ پر دو گھونسے دیئے۔گل تڑپ کر اپنے مروڑے ہوئے ہاتھ پر زور دے کر جو اٹھا تو اسے کشتی کی کیل چبھ گئی تھی۔مگر اس نے ہنس کر کروٹ بدل ڈالی۔اب لڑکی ریت پر گر گئی۔اوراس کے دونوں بازو گل کی گرفت میں تھے اور گل نے اپنے ہونٹوں کے بالکل قریب لے جا کر کے کہا ''اب کہو''۔

لڑکی کے ہونٹ یوں پھڑک رہے تھے جیسے مچھلی بہت پتلے پانی میں ہانپتی ہے۔اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ملا دیئے ایک بار، دوبار پھر ایسا محسوس ہوا جیسے مچھلی بہت گہرے پانیوں میں پہنچ گئی جہاں بالکل سکون ہے اور امن ہے اور چین ہے اور وہ دونوں گہرے سبز پانیوں میں سے ایک دوسرے سے جل پریوں کی طرح لپٹے ہوئے آنکھیں بند کیے ہونٹ سے ہونٹ ملائے تیرتے چلے جا رہے ہیں اوران کے اردگرد خوب صورت طلائی مچھلیاں گھوم رہی ہیں اور مونگے کے خوشنما آبی جزیروں میں اسفنج حیرت سے اپنی آنکھیں کھولے ان کی طرف تک رہے ہیں اور بانکے چھریرے آبی پودوں کی ریشمی ڈالیاں آہستہ آہستہ مسرت سے ہل رہی ہیں اوران کے جسم آپ ہی آپ ڈولتے ہوئے، سبز وسیاہ پتوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے ریشمی ڈالیوں کو چھوتے ہوئے تیرتے ہوئے ان خوش رنگ محلوں کی طرف جا رہے ہیں جہاں سیپیوں میں خوبصورت موتی رہتے ہیں اور رنگا رنگ کے گھونگے

اور سنکھ اپنے مرمریں دروازوں سے باہر جھانک کر دیکھتے ہیں۔ جس کے دور اوپر سمندر کے روشندان سے نیلی نیلی مدھم مدھم شعاعیں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آ رہی ہیں۔

لڑکی نے گہرا سانس لیا اور اس کے ہاتھ کی مٹھیاں آپ ہی آپ کھلتی گئیں۔

گل نے آہستہ سے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''مہر'' لڑکی نے بڑی کمزور آواز میں جواب دیا۔

''میرا نام گل ہے'' اس نے آہستہ سے کہا۔

گل؟......گل!......لڑکی کے کانپتے ہوئے ہونٹ ہلنے لگے۔ ''گل مہر''

''نہیں۔ مہر گل'' گل نے جواب دیا اور لڑکی کو سہارا دے کر اٹھایا۔

لڑکی بولی۔ ''تم کیا کرتے ہو؟ کہاں رہتے ہو؟''

گل نے کہا۔ ''میں وہ سامنے کے گاؤں میں رہتا ہوں اور مصیرا تیار کرتا ہوں''۔

''مصیرا کیا ہوتا ہے''۔

گل نے کہا۔ ''مصیرا ایک قسم کی شراب ہوتی ہے، بالکل ایسی جیسے تمہارے ہونٹوں میں ہوتی ہے۔ نرم، گرم، پاکیزہ، لطیف، میٹھی میٹھی چاشنی لئے......''

مہر نے کہا ''......اگر تم نے کوئی شرارت کی تو میں واقعی گاؤں والوں کو بلا لوں گی''۔

گل ہنسا کہنے لگا ''میں جانتا ہوں، گاؤں والے ہیں کہاں وہ سب مچھلیاں پکڑنے گئے ہیں''۔

مہر نے کہا۔ ''تم مصیرا کیوں بناتے ہو؟ مچھلیاں کیوں نہیں پکڑتے''

گل نے کہا۔ ''میں مصیرا تیار کرتا ہوں۔ ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے ہیں اور پھر ایک ہی جگہ دسترخوان پر یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ مچھلی اور مصیرا......گل اور مہر''

مہر ذرا پرے سرک گئی۔ بولی دیکھو میں تم سے کہتی ہوں، میرے قریب مت آؤ، تم نہیں جانتے میں کتنی خطرناک لڑکی ہوں۔

گل نے پوچھا۔ کتنی خطرناک ہو؟

مہر نے کہا۔میرے لئے تین خون ہو چکے ہیں،اب تک۔

گل نے کہا۔تو اب چوتھے کی تیاری سمجھو۔

مہر نے کہا۔لوگ کہتے ہیں کہ میں دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہوں۔

گل نے کہا۔ہر گاؤں میں ایک ایسی لڑکی ہوتی ہے،جو دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہوتی ہے۔اور لڑکی جب پہلی انگڑائی لیتی ہے تو دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی بن جاتی ہے۔لیکن خوبصورتی میں میری محبوبہ کا جواب نہیں ہے۔

''کون ہے وہ؟'' مہر نے آنکھیں چمکا کے پوچھا۔

''مصیر ا'' گل نے ہنستے ہوئے کہا۔

مہر نے کہا۔''تمہارا کام اچھا نہیں ہے۔اسے چھوڑ دو۔

تو کیا کروں؟

مچھلیاں پکڑا کرو۔

گل نے مہر کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

مہر نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔''کیا کر رہے ہو؟''

''مچھلیاں پکڑ رہا ہوں'' گل نے جواب دیا۔

مہر ہنسنے لگی۔ہنستے ہنستے بولی۔میں کس آفت میں پھنس گئی،میرا منگیتر اس وقت مجھے دیکھ لے تو جان سے مار ڈالے۔

تمہارا منگیتر بھی ہے؟

ہاں۔اس کا نام عبدل ہے۔

عبدل کیا بہت خوفناک آدمی ہے؟

ہاں سارے گاؤں میں اس جیسا تگڑا جوان نہیں ہے......مگر مہر نے گل کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے رشک سے کہا۔وہ تمہاری طرح خوبصورت نہیں ہے اور اتنا کہہ کر مہر نے گل کے سر میں ساری ریت ڈال دی۔گل اپنے بالوں کو جھٹک کر کہنے لگا۔میں عبدل سے ملنا

چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ وہ تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔

گل نے کہا۔ اسی لیے ملنا چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ میں جانتی ہوں تم اس سے ملے بغیر نہیں رہو گے اور پھر تمہاری لاش سمندر کے گہرے پانی میں مچھلیاں کھا جائیں گی۔

گل نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اپنے پاؤں ریت میں گاڑ دیئے اور گھونگے اور خالی سیپیاں اکٹھی کر کے گھروندا بنانے لگا۔ پھر مہر نے بھی اپنے خالی پاؤں ریت میں ڈبو دیئے اور چھوٹا سا گھروندا بنانے لگی...... گھروندا بنانے میں وہ بڑی مشاق معلوم ہوتی تھی۔ بہت جلد اس نے ایک خوبصورت سا ریت کا محل تعمیر کر لیا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔ گل انہیں دیکھتا ہی رہ گیا اور اس کا اپنا گھروندا نامکمل رہ گیا اور جب مہر کا گھروندا بن گیا تو اس نے جلدی جلدی اپنے کھردرے بڑے بڑے ہاتھوں سے ایک بے ڈول اور بے ڈھنگا سا گھروندا تیار کیا۔ جو خوبصورت محل کے بجائے ایک بدنما تاریک غار معلوم ہو رہا تھا۔

مہر نے گل کے گھروندے کو لات مار کر کہا۔ اونہہ، یہ بھی کوئی گھروندا ہے۔ گل کا گھروندا ڈھے گیا۔ اس نے مہر کے گھروندے کو لات مار دی اور کہا اونہہ، یہ بہت اچھا ہے؟ مہر نے پھر گل کو بالوں سے پکڑ لیا اور بہت ساری ریت اس کے سر پر ڈال دی اور ریت اس کے سر میں، اس کے کانوں میں، اس کی آنکھوں میں، اس کے نتھنوں میں، اس کے منہ میں چلی گئی اور اس نے اس حالت میں بالوں کو ایک بار جھٹک کر مہر کو پکڑ لیا اب کے ان رسیلے ہونٹوں کا مزہ ہی کچھ عجیب تھا رگ رگ میں نس نس میں ریت کے خوشگوار ذرے ایک عجیب گدگدی سی پیدا کر رہے تھے۔

یکایک دور سمندر کے پانیوں سے گانے کی آواز آئی مہر نے پلٹ کر دیکھا ساحل کے نیم دائرے کے مغربی کونے پر ایک بادبان والی کشتی نمودار ہو چکی تھی۔ مہر نے کشتی پہچان کے کہا۔ ''عبدل آ گیا''

گل کے بازو تن گئے۔ بولا ''اچھا ہے''

نہیں تم چلے جاؤ۔

نہیں

دیکھو میں کہتی ہوں۔ اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اب خون خرابا نہیں چاہتی۔

نہیں۔

مہر نے گل کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کے کہا۔ مہر آج تک کسی کی نہ ہوسکی۔ مگر آج سے وہ تمہاری ہو جائے گی۔

گل مہر کی طرف دیر تک دیکھتا رہا۔ بولا۔ سچ کہتی ہو؟

مہر نے کہا۔ دیکھ لینا۔ اب تم جاؤ۔

مہر نے کہا۔ ٹھہرو......ٹھہرو۔

رات کے سناٹے میں مہر کی آواز گونج گونج کر ٹوٹ گئی اور پھر عبدل کا گیت ابھر آیا، یہ گیت اس مچھلی کا معلوم ہوتا تھا۔ جس کے گلے میں ہنسی کا کانٹا پھنس جائے اور حلق سے نکلنے سے انکار کر دے۔

مہر رونے لگی۔

گل نے کہا۔ روتی کیوں ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں میں مل گیا ہے۔ آج چاندنی رات ہے۔ آج گاؤں والے بیچ سمندر جا کے جال ڈالتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ صبح سب کے ساتھ آ جائے گا، دیکھ لینا۔

لیکن عبدل صبح کو سب کے ساتھ نہیں آیا، رات بھر وہ اپنے ساتھیوں کیساتھ مچھلیاں پکڑتا رہا اور گیت گاتا رہا اور سب کو ہنساتا رہا۔ آج رات اس کے جال میں بہت سی مچھلیاں آئیں۔ ڈھیروں کے ڈھیر، ایسی موٹی تازی خوبصورت مچھلیاں ان ماہی گیروں نے بہت مدت کے بعد پکڑی تھیں۔ وہ لوگ بہت خوش تھے۔ صبح کے وقت سب لوگ لوٹنے لگے تو عبدل نے کہا میں ابھی دیر میں آؤں گا تم لوگ چلو۔ عبدل نے اپنی مچھلیاں مہر کیلئے بھجوا دیں۔ یہ سب

اسے دے دینا۔ اس میں کوئی عجیب بات بھی نہ تھی۔ جو کسی کو شک پکڑتا اور پھر سب سے جدا ہو کے سمندر کے ایک حصے کی طرف چلا گیا جہاں کہتے ہیں بڑے سے بڑے طوفان کے وقت بھی لہریں ساکن رہتی ہیں اور جن کے اندر مچھلیوں نے گھیرا باندھ کے کنول کا پھول بنا رکھا ہے۔ ماہی گیر کبھی ادھر نہیں جاتے، نہ انہوں نے کبھی اس مقام کو دیکھا ہے۔ صرف اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ مغربی کنارے سے دو میل آگے بیچ سمندر میں وہ مقام ہے جہاں ساکن سمندر کے اندر ایک خوفناک بھنور ہے اور جس کے اندر مچھلیاں اک کنول کا پھول نما دائرہ بنائے ہوئے گھومتی ہیں۔

عبدل چلا گیا۔ وہ صبح کو واپس نہیں آیا۔ وہ دوپہر کو بھی نہیں لوٹا، شام کو اس کی لاش کنارے سے آ لگی اور گاؤں والوں نے اسے اٹھا کے اپنے قبرستان میں دفن کر دیا۔

◆◆◆

پانی کا درخت

جہاں ہمارا گاؤں ہے اس کے دونوں طرف پہاڑوں کے روکھے سوکھے سنگلاخی سلسلے ہیں۔ مشرقی پہاڑوں کا سلسلہ بالکل بے ریش و برودت ہے۔ اس کے اندر نمک کی کانیں ہیں۔ مغربی پہاڑی سلسلے کے چہرے پر جنڈ، بھیکڑ، املتاس اور کیکر کے درخت اگے ہوئے ہیں۔ اس کی چٹانیں سیاہ ہیں لیکن ان سیاہ چٹانوں کے اندر میٹھے پانی کے دو بڑے قیمتی چشمے ہیں، اوران دو پہاڑی سلسلوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تلہٹی پر ہمارا گاؤں آباد ہے۔

ہمارے گاؤں میں پانی بہت کم ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے اپنے گاؤں کے آسمان کو تپتے ہوئے پایا ہے، یہاں کی زمین کو ہانپتے ہوئے دیکھا ہے اور گاؤں والوں کے محنت کرنے والے ہاتھوں اور چہروں پر ایک ایسی ترسی ہوئی بھوری چمک دیکھی ہے جو صدیوں کی ناآسودہ پیاس سے پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے گاؤں کے مکان اور آس پاس کی زمین بالکل بھوری اور خشک نظر آتی ہے۔ زمین میں باجرے کی فصل جو ہوتی ہے اس کا رنگ بھی بھورا بلکہ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے گاؤں کے کسانوں اوران کے کپڑوں کا ہے۔ صرف ہمارے گاؤں کی عورتوں کا رنگ سنہری ہے کیونکہ وہ چشمے سے پانی لاتی ہیں۔

بچپن ہی سے میری یادیں پانی کی یادیں ہیں۔ پانی کا درد اور اس کا تبسم، اس کا ملنا

اور کھو جانا۔ یہ سینہ اس کے فراق کی تمہید اور اس کے وصال کی تاخیر سے گودا ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں بہت چھوٹا سا تھا دادی اماں کے ساتھ گاؤں کی تلہٹی کے نیچے بہتی ہوئی رویل ندی کے کنارے کپڑے دھونے کیلئے جایا کرتا تھا۔ دادی اماں کپڑے دھوتی تھیں۔ میں انہیں سکھانے کیلئے ندی کے کنارے چمکتی ہوئی بھوری ریت پر ڈال دیا کرتا۔ اس ندی میں پانی بہت کم تھا۔ یہ بڑی دبلی پتلی ندی تھی۔ چھریری اور آہستہ خرام جیسے ہمارے سردار پیندا خان کی لڑکی بانو۔ مجھے اس ندی کے ساتھ کھیلنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا۔ جتنا بانو کے ساتھ کھیلنے میں۔ دونوں کی مسکراہٹ میٹھی تھی اور مٹھاس کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جو میری طرح نمک کی کان میں کام کرتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ہماری رویل ندی سال میں صرف چھ مہینے بہتی تھی، چھ مہینے کیلئے سوکھ جاتی۔ جب چیت کا مہینہ جانے لگتا تو ندی سوکھنا شروع ہو جاتی اور جب بیساکھ ختم ہونے لگتا تو بالکل سوکھ جاتی، اور پھر اس کی تہہ پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے نیلے پتھر رہ جاتے یا نرم نرم کیچڑ جس میں چلنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ریشم کے دبیز غالیچے پر گھوم رہے ہوں۔

چند دنوں میں ہی ندی کا کیچڑ بھی سوکھ جاتا اور اسکے چہرے پر باریک درزوں اور جھریوں کا جال پھیل جاتا، کسی محنتی کسان کے چہرے کی طرح اس کے ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جم جاتیں اوا یسا معلوم ہوتا جیسے اس کی گرم گداز ریت نے سالہا سال سے پانی کی ایک بوند نہیں چکھی۔

مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں نے ندی کو اس طرح سوکھتے ہوئے پایا تھا تو بے کل، بے چین اور پریشان ہو گیا تھا، اور اس رات سو بھی نہ سکا تھا۔ اس رات دادی اماں مجھے بہت دیر تک گود میں لے کر عجیب عجیب کہانیاں سناتی رہیں اور ساری رات دادی اماں کی گود میں لیٹے لیٹے مجھے رویل ندی کی بہت سی پیاری باتیں یاد آنے لگی اس کا ہولے ہولے پتھروں سے ٹھمکتے ہوئے چلنا، اور پتھروں کے درمیان سے اس کا ذرا تیز ہونا اور کترا کر چلنا، جیسے کبھی کبھی بانو غصے میں گلی کے موڑ پر سے تیزی سے نکل جاتی ہے اور جہاں دو پتھر ایک دوسرے کے بہت قریب

ہوتے تھے وہاں میں اور بانو باجرے کی ڈنڈیوں کی بنی ہوئی پن چکی لٹکا دیتے تھے اور گیلا آٹا پیا کرتے تھے۔ پن چکی ندی کی آہستہ خرامی کے باوجود کیسے تیز تیز چکر لگا کر گھومتی تھی اور اب یہ ندی سوکھ گئی۔

ان سب باتوں کو یاد کر کے میں نے دادی اماں سے پوچھا۔

''دادی اماں یہ ہماری ندی کہاں چلی گئی؟''

زمین کے اندر چھپ گئی''

''کیوں؟''

''سورج کے ڈر سے''

''کیوں؟ یہ سورج سے کیوں ڈرتی ہے؟ سورج تو بہت اچھا ہے۔

''سورج ایک نہیں بیٹا، دو سورج ہیں۔ ایک تو سردیوں کا سورج ہے۔ وہ بہت اچھا اور مہربان ہوتا ہے۔ دوسرا سورج گرمیوں کا ہے۔ یہ بڑا تیز چمکیلا اور غصے والا ہوتا ہے، اور یہ دونوں باری باری ہر سال ہمارے گاؤں میں آتے ہیں۔ جب تک تو سردیوں کا سورج رہتا ہے ہماری ندی اس سے بہت خوش رہتی ہے۔ لیکن جب گرمیوں کا ظالم سورج آتا ہے تو ہماری ندی کے جسم سے اس کا لباس اتارنا شروع کرتا ہے۔ ہر روز کپڑے کی ایک تہہ اترتی چلی جاتی ہے اور جب بیساکھی کا آخری دن آتا ہے تو ندی کے جسم پر پانی کی ایک پتلی سی چادر رہ جاتی ہے۔ اس رات کو ہماری ندی شرم کے مارے زمین پر چھپ جاتی ہے اور انتظار کرتی ہے سردیوں کے سورج کا جو اس کیلئے اگلے سال پانی کی نئی پوشاک لائے گا''۔

میں نے آنکھ جھپکتے ہوئے کہا ''سچ مچ گرمیوں کا سورج تو بہت برا ہے''۔

''لو اب سو جاؤ بیٹا''

مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے میں نے ایک اور سوال پوچھا؟ ''دادی یہ ہمارے نمک کے پہاڑ کا پانی کیوں کڑوا ہے؟''

ہمارے گاؤں میں بچے پانی کیلئے بہت سوال کرتے تھے۔ پانی ان کے تخیل کو ہمیشہ

اکساتا رہتا ہے۔ دوسرے گاؤں میں، جہاں پانی بہت ہوتا ہے، وہاں کے لڑکے شاید سونے کے جزیرے ڈھونڈتے ہوں گے یا پرستان کا راستہ تلاش کرتے ہوں گے لیکن ہمارے گاؤں کے بچے ہوش سنبھالتے ہی پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ اور تلہٹی پر اور پہاڑی پر اور دور دور تک پانی کو ڈھونڈنے کا کھیل کھیلتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں پانی کو ڈھونڈا تھا اور نمک کے پہاڑ پر پانی کے دو تین نئے چشمے دریافت کیے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے کتنے چاؤ اور خوشی سے پانی کا پہلا چشمہ ڈھونڈا تھا، کس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے چٹانوں کے درمیان سے جھجکتے ہوئے پانی کو اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کا سہارا دے کر باہر بلایا تھا اور جب میں پہلی بار اسے اوک میں لیا تو پانی میرے ہاتھ میں یوں کانپ رہا تھا جیسے نو گرفتار چڑیا بچے کے ہاتھوں میں کانپتی ہے۔

پھر جب میں اسے اوک میں بھر کر اپنی زبان تک لے گیا تو مجھے یاد ہے میری کانپتی ہوئی خوشی کیسے تلخ اچھو میں تبدیل ہو گئی تھی۔ پانی نے زبان پر جاتے ہی بچھو کی طرح ڈنگ مارا اور اس کے زہر نے میری روح کو کڑوا کر دیا۔ میں نے پانی تھوک دیا اور پھر کسی نئے چشمے کی تلاش میں چل کھڑا ہوا، لیکن نمک کے پہاڑ پر مجھے آج تک میٹھا چشمہ نہ ملا۔ اس لیے جب ندی سوکھنے لگی تو میٹھے چشمے کی یاد نے مجھے بے چین کر دیا۔ اور میں نے دادی اماں سے پوچھا۔

''دادی اماں یہ نمک کے پہاڑ کا پانی کڑوا کیوں ہے؟''

دادی اماں نے کہا۔ ''یہ تو ایک دوسری کہانی ہے''۔

''تو سناؤ''

''نہیں اب سو جاؤ''۔

''نہیں سناؤ، نہیں تو ہم روئیں گے''

''اچھا بابا سناتی ہوں، مگر تم اب چیخو گے نہیں''

''نہیں''

''اور نہ ہی بیچ بیچ میں ٹوکو گے''

''نہیں''

''اچھا تو سنو۔ یہ تم اس طرف نمک کی پہاڑی جو دیکھتے ہو یہ پرانے زمانے یں ایک عورت تھی جو اس پہاڑ کی بیوی ہے، جہاں آج کل میٹھے پانی کا چشمہ ہے''۔

''پھر''

''پھر ایک روز دیووں میں بڑی جنگ چھڑی اور یہ سامنے کا پہاڑ بھی جو اس عورت کا خاوند تھا، جنگ میں بھرتی ہو گیا اور بیوی کو پیچھے چھوڑ گیا اور اسے کہہ گیا کہ وہ اس کے آنے تک کہیں نہ جائے، نہ کسی سے بات کرے، صرف اپنے گھر کا خیال کرے''۔

''اچھا''

''ہاں۔ پھر کئی سال تک بیوی اپنے دیو خاوند کا انتظار کرتی رہی لیکن اس کا خاوند جنگ سے نہ لوٹا۔ آخر ایک دن اس کے گھر میں ایک سفید دیو آیا اور اس پر عاشق ہو گیا''

''عاشق کسے کہتے ہیں''

دادی اماں رک گئیں، بولیں، تو نے پھر ٹوکا۔'' میں نے دل میں سوچا: دادی اماں اگر خفا ہو گئیں تو باقی کہانی سننے کو نہیں ملے گی اور کہانی اب دلچسپ ہوتی جا رہی ہے اس لیے چپکے سے سن لینا چاہیے عاشق کا مطلب بعد میں پوچھ لیں گے۔ اس لیے میں نے جلدی سے سوچ کر دادی اماں سے کہا۔''اچھا اچھا، دادی اماں آگے سناؤ، اب نہیں ٹوکیں گے''۔

دادی اماں بڑی رکھائی سے اس طرح خفا ہو کے بولیں جیسے انہیں کہانی کا آگے آنے والا حصہ پسند نہیں ہے۔

کہنے لگیں ''ہونا کیا تھا، مگر پہاڑ کی بیوی بے وفا نکلی۔ جب اسے سفید دیو نے جھوٹ موٹ یقین دلا دیا کہ اس کا پہلا خاوند دیویوں کی جنگ میں مارا گیا ہے تو اس نے سفید دیو سے شادی کر لی''۔

''دیویوں کی جنگ کیوں ہوتی تھی؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''تو نے پھر ٹوکا''۔ دادی اماں بہت خفا ہو کے بولیں، چل اب آگے نہیں سناؤں

گی‘‘۔

نہیں دادی اماں میری اچھی دادی اماں اچھا اب بالکل نہیں ٹوکوں گا۔’’میں نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

’’پھر؟‘‘

’’پھر ایک دن بہت سالوں کے بعد ایک بوڑھا دیو اس وادی میں آیا۔ یہ اسی عورت کا پہلا خاوند تھا۔ جب اس نے اپنی بیوی کو سفید دیو کے ساتھ دیکھا تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے کلہاڑا لے کر سفید دیو اور اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ جب سے ان دونوں پہاڑوں کو بڑے پیر کی بددعا لگی ہے اور یہ لوگ سل پتھر ہو گئے ہیں۔ سامنے والے پہاڑ کا پانی اس لیے میٹھا ہے کیونکہ اسے اپنی بیوی سے سچی محبت تھی۔ اس کے مقابل پہاڑ کا پانی کھارا ہے اور اس میں نمک ہے کیونکہ وہ عورت ہے اور اپنی بے وفائی پر ہر وقت روتی رہتی ہے اور جب اس کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں تو نمک کے ڈلے بن جاتے ہیں، جنہیں ہر روز تمہارا باپ پہاڑ کے اندر جا کے کھود کے نکالتا ہے۔

’’پھر؟‘‘

’’پھر کہانی ختم‘‘

کہانی ختم ہو گئی اور میں بھول گیا کہ میں نے کیا سوال کیا تھا۔ مجھے کیا جواب ملا۔ میں نے کہانی سن لی، اطمینان کا سانس لیا اور پلک جھپکتے ہی سو گیا۔ سوتے سوتے میری آنکھوں کے سامنے نمک کی کان کا منظر آیا۔ جہاں میرے ابا کام کرتے تھے، جہاں جوان ہو کر مجھے کام کرنا پڑا اور جہاں پہلی بار میں اپنی اماں کے ساتھ اپنے ابا کا کھانا لے کر گیا تھا۔ افوہ! کتنی بڑی کان تھی وہ چاروں طرف نمک کے پہاڑ نمک کے ستون، نمک کے آئینے نمک کی دیواروں میں لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ نمک کی آبی جھیل تھی جس کے چاروں طرف نیلگوں دیواریں تھیں اور چھت بھی نمک کی تھی جس سے قطرہ قطرہ کر کے نمک کا پانی رستا تھا اور نیچے گر گر کر جھیل بن گیا تھا اور یکا یک مجھے خیال آیا یہ اس عورت کے آنسو ہیں جو بڑے پیر کی بددعا سے نمک کا پہاڑ بن

چکی ہے۔

میرے ابا اس جھیل کو دیکھ کر بولے ''یہاں اس قدر پانی ہے پھر بھی پانی کہیں نہیں ملتا۔ دن بھر نمک کی کان میں کام کرتے کرتے سارے جسم پر نمک کی پتلی سی جھلی چڑھ جاتی ہے جسے کھرچو تو نمک چورا چورا ہو کر گرنے لگتا ہے۔ اس وقت کس قدر وحشت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہیں میٹھے پانی کی جھیل ہو اور آدمی اس میں غوطے لگاتا جائے''۔

''پانی! پانی!

پانی سارے گاؤں میں کہیں نہیں تھا۔ پانی نمک کے پہاڑ پر بھی نہیں تھا۔ پانی تھا تو سامنے پہاڑ پر جس کی محبت نے بے وفائی نہیں کی تھی۔ یا پانی پھر رویل ندی میں تھا۔ لیکن وہ ندی بھی چھ مہینے غائب رہتی تھی اور پھر آخر ایک دن یہ بالکل ہی غائب ہوگئی اور آج تک اس کے نیلے پتھر اور سوکھی ریت اور اس کے کنارے کنارے چلنے والی عورتوں کے نا امید قدم اس کی راہ تکتے ہیں۔ لیکن یہ میرے بچپن کی کہانی نہیں ہے، یہ میرے لڑکپن کی کہانی ہے۔ جب ہمارے گاؤں سے بہت دوران پہاڑی سلسلوں کے دوسری طرف سینکڑوں میل لمبی جاگیر کے مالک راجہ اکبر علی خان نے ہمارے دیہات والوں کی مرضی کے خلاف رویل ندی کا بہاؤ موڑ کر اپنی جاگیر کی طرف کر لیا اور ہماری تلہٹی کو اور آس پاس کے بہت علاقے کو سوکھا، بنجر اور ویران کر دیا۔ اس وقت ندی کے کنارے کا ہمارا گاؤں اور اس وادی کے اور دوسرے بہت سے گاؤں پریشان ہو گئے۔ اس طرح ہمارے لیے رویل ندی مر گئی اور اس کا پانی بھی مر گیا اور مارے لیے ایک تلخ یاد چھوڑ گیا۔

مجھے یاد ہے اس وقت گاؤں والوں نے دوسرے گاؤں والوں سے مل کر سرکار سے اپنی کھوئی ہوئی ندی مانگی تھی کیونکہ ندی تو گھر کی عورت کی طرح ہے۔ وہ گھر میں پانی دیتی ہے، کھیتوں میں کام کرتی ہے، ہمارے کپڑے دھوتی ہے، جسم کو صاف رکھتی ہے۔ ندی کے گیت اس کے بچے ہیں۔ جنہیں وہ لوری دیتے ہوئے، تھپکتے ہوئے مغرب کے جھولے کی طرف لے جاتی ہے۔ پانی کے بغیر ہمارا گاؤں بالکل ایسا تھا جیسے گھر عورت کے بغیر۔ گاؤں والوں کو بالکل

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے انکے گھر سے ان کی لڑکی اغوا کر لی ہو۔ وہی غم، وہی غصہ تھا، وہی تیور تھے، وہی مرنے مارنے کے انداز تھے۔

لیکن راجہ اکبر علی خان چکوال کے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ حکومت کے افسروں کے ساتھ اس کا گہرا اثر رسوخ تھا۔ نمک کی کان کا ٹھیکہ بھی اسی کے پاس تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں والوں کو ان کی ندی واپس نہ ملی، الٹا ہمارے بہت سے گاؤں والے، جو نمک کی کان میں کام کرتے تھے، باہر نکال دیئے گئے۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے گاؤں کے اغوا شدہ پانی کو واپس بلانے کی جرأت کی تھی۔ مجھے یاد ہے اس روز ابا کانپتے کانپتے گھر آئے تھے۔ ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور بار بار اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتے، توبہ توبہ! کیسی غلطی ہوئی۔ وہ تو اللہ کا کام تھا کہ میں بچ گیا اور نہ راجہ صاحب مجھے نکال دیتے، میں تو اب کبھی راجہ کے خلاف عرضی نہ دوں، چاہے وہ پانی تو کیا میری لڑکی ہی کیوں نہ اغوا کر کے لے جائیں۔ توبہ توبہ۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے گاؤں میں پانی کی عزت لڑکی طرح بیش قیمت ہے۔ پانی جو زندگی دیتا ہے۔ پانی جو رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ پانی، جو منہ دھونے کو نہیں ملتا۔ پانی، جس کے نہ ہونے سے ہمارے کپڑے بھورے اور میلے رہتے ہیں، سر میں جوئیں، جس پر پسینے کی دھاریاں اور روح پر نمک جما رہتا ہے۔ یہ پانی تو سونے سے زیادہ قیمتی ہے اور لڑکی سے زیادہ حسین۔ اس کی قدر اور قیمت ہمارے گاؤں والوں سے پوچھیے جن کی زندگی پانی کیلئے لڑتے جھگڑتے گزرتی ہے۔ ایک دفعہ سامنے کے پہاڑ کے میٹھے چشمے سے پانی لانے کیلئے سرور خان کی بیوی سیداں اور ایوب خان کی بیوی عائشاں دونوں آپس میں لڑ پڑی تھیں حالانکہ دونوں اتنی گہری سہیلیاں تھیں کہ ہر وقت اکٹھی رہتیں، گھر بھی ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ چشمے پر بھی پانی اکٹھے ہی لینے جاتی تھیں۔ پہلے ایک پھر دوسری پانی بھرتی۔ باری باری وہ دونوں ایک دوسرے کا گھڑا اٹھا کے سر پر رکھتیں اور پھر باتیں کرتی ہوئی واپس چل پڑتیں۔ لیکن آج نہ جانے کیا ہوا، آج جانے دونوں کو کیا جلدی تھی۔ ایک کہتی پہلے پانی میں بھروں گی، دوسری کہنے

لگی نہیں میں بھروں گی۔ شاید انہیں غصہ ایک دوسرے کے خلاف نہیں تھا۔ شاید غصہ انہیں اس لیے تھا یہاں میٹھے پانی کا ایک ہی چشمہ تھا جہاں ندی کے سوکھ جانے کے بعد دور سے دوسرے لوگ پانی لینے کیلئے آتے تھے۔ منہ اندھیرے ہی عورتیں گھڑا لے کے چل پڑتیں۔ جب یہاں پہنچتیں تو ایک لمبی لائن پہلے سے موجود ہوتی یا چشمے کے منہ سے ایک ایسا پتلی سی دھار کو نکلتے دیکھتیں جو آدھے گھنٹے میں مشکل سے ایک گھڑا بھرتی تھی۔ اور تین کوس کا آنا جانا قیامت سے کم نہ تھا۔ لڑائی کی وجہ کچھ بھی ہو اصلی لڑائی پانی کی تھی۔ دونوں عورتوں نے دیکھتے دیکھتے ایک دوسرے کو نوچ لیا، گھڑے توڑ دیئے، کپڑے پھاڑ دیئے اور پھر روتیں ہوئی اپنے اپنے گھروں کو گئیں۔ تب سیداں نے سرور خان کو بھڑکایا اور عائشاں نے ایوب خان کو۔ دونوں کے خاوند غصے سے بے تاب ہو کے کلہاڑیاں لے کر باہر نکل پڑے اور پیشتر اسکے کہ لوگ آ کے بیچ بچاؤ کریں دونوں نے کلہاڑیوں سے ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔ شام ہوتے ہوتے دونوں ہمسایوں کا جنازہ نکل گیا۔ ہمارے گاؤں کے قبرستان کی بہت سی قبریں پانی نے بنائی ہیں۔

میرے لڑکپن کے زمانے میں جب دو قتل ہوئے اس وقت سامنے کے پہاڑ پر ایک ہی میٹھے پانی کا چشمہ تھا لیکن بعد میں جب میں اور بڑا ہوا تو یہاں ایک اور چشمہ بھی نکل آیا۔ اس نئے چشمے کی داستان بھی بڑی عجیب ہے۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہمارے پوٹھوہار میں سخت کال پڑا تھا اور گرمی کی وجہ سے علاقے کے سارے ندی نالے اور کنویں سوکھ گئے تھے۔ صرف کہیں کہیں ان چشموں میں پانی رہ گیا تھا۔ ان دنوں ہمارے گھروں میں عورتیں رات کے دو بجے ہی اٹھ کے چل دیتیں اور چشمے کے نیچے ہمیشہ گھڑوں کی ایک لمبی قطار جس میں سے پیاس سے بلکتے ہوئے بچوں کی صدا آتی تھی۔

اس زمانے میں بڑے بڑے لوگ نیکی اور خدائی سے منحرف ہو گئے اور ان لوگوں میں سب سے برا کام ذیلدار ملک خان نے کیا۔ اس نے تھانیدار فضل علی سے مل کے اس چشمے پر پولیس کا پہرہ لگا دیا اور پھر تحصیل دار غلام نبی سے مل کے چشمے کے اردگرد کی ساری زمین خرید کر راتوں رات اس پر ایک چار دیواری باندھ دی اور چار دیواری کے باہر تالا لگا دیا۔ اب اس

چشمے سے کوئی آدمی بغیر اجازت پانی نہ لے سکتا تھا کیونکہ اب یہ چشمہ ذیلدار کی ملکیت تھا، اور ذیلدار نے چشمے سے پانی لے جانے والے گھڑوں پر اپنا ٹیکس رکھ دیا۔ ایک گھڑے پر ایک آنہ دو گھڑوں پر دو آنے۔

تب سارے گاؤں میں اس ظلم کے خلاف شور مچ گیا۔ لیکن پولیس سردار ذیلدار ملک خان کی حمایت میں تھی، قانون بھی اس کی طرف تھا اور جدھر قانون تھا پانی بھی ادھر تھا۔ اس لئے گاؤں کے سارے جوان اور بڈھے اور بچے جمع ہو کے میرے ابا کے پاس آئے اور بولے؟ ''چچا خدا بخش اب تم ہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دلوا سکتے ہو''۔

''وہ کیسے؟'' میرے ابا نے حیران ہو کے پوچھا۔

سفید ریش بڈھے حاکم خان نے کہا؟ ''یاد ہے یہ میٹھے پانی کا چشمہ، جواب ذیلدار ملک خاں کا ہو گیا، یہ چشمہ بھی تم نے دریافت کیا تھا۔ کیا تم دوسرا چشمہ نہیں ڈھونڈ سکتے؟ آخر اس پہاڑ کے اندر، اس کے سینے میں اور بھی تو کہیں میٹھا پانی ہو گا جو انسان کو آب حیات بخش سکتا ہے۔ خدا بخش تم ہم سب سے قابل ہو۔ اپنی عقل دوڑاؤ، ہم تمہارے ساتھ مرنے مارنے کو تیار ہیں۔ ہمارے گاؤں میں پانی نہیں ہے اور اب پانی چاہیے'۔

میرا باپ چارپائی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اسی وقت اللہ کا نام لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سارا گاؤں اس کے ساتھ تھا۔ پہاڑ پر چڑھائی تھی اور تلاش پانی کی تھی۔ فرہاد کی کوہ کنی سے پانی کی تلاش مشکل ہے، یہ بات مجھے اس روز معلوم ہوئی کیونکہ سامنے پانی نہیں ہوتا وہ تو ایک چھلاوے کی طرح پہاڑ کی سلوٹوں میں گم ہو جاتا ہے پانی خانہ بدوش ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ پانی ایک پردیسی ہے جس کی محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ پانی کا وجود اس نازک خوشبو کی طرح ہے جو تیز دھوپ میں اڑ جاتی ہے۔ اس پوٹھوہار کے علاقے میں، جہاں عورتیں باوفا اور با حیا ہیں، پانی بے وفا اور ہرجائی ہے۔ وہ کبھی کسی ایک کا ہو کے نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ یہاں سے وہاں، ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا ہے، پاسپورٹ کے بغیر ایسے ہرجائی کی تلاش کیلئے ایک تیشہ نہیں ایک آئینہ چاہیے جس کے سامنے پہاڑ کا دل اس طرح

ہو جیسے ایک کھلی کتاب آخر میرے گاؤں والوں نے کچھ سمجھ کر میرے باپ کو اس کام کیلئے چنا تھا۔

اس روز ہم دن بھر اس بلند و بالا پہاڑ کی خاک چھانتے رہے۔ ہم نے کہاں کہاں اس پانی کو تلاش نہیں کیا، بیریوں کی گھنی جھاڑیوں میں چٹانوں کی گہری درزوں میں، سیاہ ڈراؤنی کھوؤں میں، جنگلی جانوروں کے بھٹ میں۔ پانی کی تلاش میں ہم نے سارے پرانے چشمے کھودوائے لیکن ان کا کھودنا ایسے ہی تھا جیسے آدمی زندگی کی تلاش میں قبریں کھود ڈالے۔ پانی کہیں نہیں ملا۔ ایک چور کی طرح اس نے جگہ جگہ اپنے جھوٹے سراغ چھوڑے لیکن آخر کو وہ ہمیشہ ہمیں جل دے کر کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ جانے فطرت کے کس کونے میں بیٹھا ہوا اپنے چاہنے والوں پر ہنس رہا تھا۔

لیکن گاؤں والوں نے آس نہیں چھوڑی۔ وہ سارا دن میرے باپ کے پیچھے پیچھے پانی کی کھوج کرتے رہے۔ آخر جب شام ہونے گی تو میرے ابا نے پسینہ پونچھ کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑے ہو کر ادھر نظر دوڑائی جدھر سورج غروب ہو رہا تھا۔ یکا یک انہیں غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی میں چٹانوں کی ایک گہری درز میں فرن کا سبزہ نظر آیا اور کہتے ہیں جہاں فرن کا سبزہ ہوتا ہے وہاں پانی ضرور ہوتا ہے۔ فرن پانی کا جھنڈا ہے اور پانی ایک گھومنے والی قوم ہے۔ پانی جہاں جاتا ہے اپنا جھنڈا ساتھ لے جاتا ہے۔

ایک چیخ مار کر جلدی سے میرے ابا اس طرح لپکے جہاں فرن کا سبزہ اگا تھا۔ گاؤں والے ان کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ جلدی جلدی میرے ابا نے اپنے ناخنوں ہی سے زمین کو کریدنا شروع کر دیا۔ زمین، جو اوپر سے سخت تھی، نرم ہوتی گئی گیلی ہوتی گئی۔ آخر میں زور سے پانی کی ایک دھار اوپر آئی اور سینکڑوں سوکھے ہوئے گلوں سے مسرت کی آواز نکلی۔

"پانی! پانی"

ابا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اوک میں پانی بھرا۔ ساری نگاہیں ابا کے چہرے پر تھیں، سنکڑوں دل دھڑک رہے تھے، یا اللہ پانی میٹھا ہو، یا اللہ پانی میٹھا ہو، یا اللہ پانی میٹھا ہو۔

ابا نے پانی چکھا ’’پانی میٹھا ہے‘‘ ابا نے خوشی سے کہا۔

گاؤں والے زور سے چلائے۔ ’’پانی میٹھا ہے‘‘ ساری وادی میں آوازیں گونج اٹھیں ’’میٹھا پانی مل گیا، پانی میٹھا ہے‘‘

ساری وادی میں ڈھول بجنے لگے۔ عورتیں گانے لگیں، جوان ناچنے لگے، بچے شور مچانے لگے۔ گاؤں والوں نے جلدی سے چشمے کو کھود کر اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اب چشمہ ان کے بیچ میں تھا اور وہ ان کے چاروں طرف تھے اور وہ اسے مڑ مڑ کر اس طرح محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے جیسے ماں اپنے نوزائدہ بچے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔

وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ اس رات کوئی آدمی گاؤں میں واپس نہیں گیا۔ اس رات سارے گاؤں نے چشمے کے کنارے جشن منایا۔ اس رات تاروں کی گود میں بھوری بیریوں کے سائے میں ماؤں نے چولہے سلگائے، بچوں کو تھپک تھپک کر سلایا۔ اس رات کنواریوں نے لہک لہک کر گیت گائے۔ ایسے گیت جو پانی کی طرح نرمل اور سندر تھے، جن میں جنگلی جھرنوں کا سا حسن اور آبشاروں کی سی روانی تھی۔ اس رات ساری عورتیں سارے بیج تخلیق سے بے قرار ہوکر پھوٹ پڑے تھے۔

ایسی رات ہمارے گاؤں میں کب آئی تھی! جب ابا خدا بخش نے پانی ڈھونڈ نکالا تھا۔ پانی جو انسان کے ہاتھوں کی محنت تھا، اس کے دل کی محبت تھا۔ آج پانی ہمارے ہاں اس طرح آیا تھا جیسے بارات ڈولی لے کے آتی ہے۔ وہ نیا چشمہ ہمارے درمیان آج اس طرح ہولے ہولے شرمیلے انداز میں چل رہا تھا جیسے نئی دلہن جھجک جھجک کر اجنبی آنگن میں پاؤں رکھتی ہے، اس رات میرے ایک ہاتھ میں پانی تھا، دوسرے ہاتھ میں بانو کا ہاتھ تھا اور آسمان پر تارے تھے۔

اس نئے چشمے کے ساتھ میری جوانی کی بہترین یادیں وابستہ ہیں۔ اس چشمے کے کنارے میں نے بانو سے محبت کی۔ بانو جس کا حسن پانی کی طرح نایاب تھا، جسے دیکھ کر ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ جانے اس زمین کی گود میں کتنے ہی میٹھے چشمے نہاں ہیں، کتنی حسین یادیں منجمد

ہیں، موسم گرما کے کتنے ہی شوخ چمکتے ہوئے پھول، خزاؤں کے سنہری پتے، زمستان کی پاکیزہ برف، بانو کی محبت بھی کتنی خاموش اور چپ چاپ تھی، زمین کے نیچے بہنے والے پانی کی طرح۔ وہ رات کے اندھیرے میں یا فجر سے پہلے اس چشمے کے کنارے آتی تھی، جب یہاں اور کوئی نہ ہوتا میرے سوا مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر تبسم کی ضیا پھیل جاتی، جیسے اندھیرے میں سحر کا اجالا پھیلتا ہے۔ وہ گھڑے کو چشمے کی دھار کے نیچے رکھ دیتی پانی گھڑے سے باتیں کرنے لگتا اور میں بانو سے۔ دھیرے دھیرے باتیں کرتے کرتے گھڑا بھر جاتا اور ہمارے دل خوشی سے معمور ہو جاتے اور ہمارے جانے بغیر کہیں دور سے صبح یوں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آتی جیسے بادِ نسیم سنگترے کے پھولوں کی سی کلیاں لیے سوئے ہوئے چہروں پر سے گزر جاتی ہے اور ہم چونک کر اٹھ کھڑے ہوتے اور حیرت سے ادھر دیکھنے لگتے۔ پھر میں اس کا گھڑا اٹھا کر اس کے سر کے اوپر رکھی ہوئی سرخ پٹی پر رکھتا اور وہ مسکرا کر، پلٹ کر اور گھوم کر ڈھلوان پر سے گزر جاتی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہتا اس وقت بھی دیکھتا جب دوسری عورتیں میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگتیں، اور مجھے وہ دن یاد آتا جب میں نے دادی اماں سے پوچھا ''دادی اماں عاشق کسے کہتے ہیں''

اور پھر اس چشمے کے کنارے مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب میں کان میں کام کرتا تھا اور دن بھر تھک کے گھر لوٹتا تھا اور اس تھکن سے چور ہو کر سو جاتا تھا، صبح ہی آنکھ کھلتی تھی۔ کئی دنوں سے میں بانو سے چشمے پر ملنے نہ گیا تھا مگر کوئی بے قراری نہ تھی۔ وہ ساتھ کے گھر میں تو رہتی تھی۔ انہی دنوں میں اس کے چچا کا لڑکا غضنفر بھی آیا اور چلا گیا لیکن مجھے اس سے ملنے کی بھی فرصت نہ ملی کیونکہ کان میں نیا نیا ملازم ہوا تھا، کام سیکھنے کا بہت شوق تھا اور یہ تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ نمک کی جان میں جا کے ہر شخص نمک کا ہو جاتا ہے۔

ایک رات بانو نے مجھے کہا کہ میں رات کے دو بجے چشمے پر اس سے ملوں۔ میں نے کہا ''میں بہت تھکا ہوا ہوں''

وہ بولی ''نہیں ضروری کام ہے، آنا ہوگا'' چنانچہ میں گیا۔

دو بجے کے وقت آدھی رات میں چشمے پر کوئی نہیں تھا، ہم دونوں کے سوا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟'' وہ دیر تک چپ رہی، پھر میں نے پوچھا ''ابھی بتاؤ آخر کیا بات ہے''؟

وہ بولی ''میں گاؤں چھوڑ کر جا رہی ہوں''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چشمہ چلتا چلتا رک گیا۔ میرے گلے سے آواز نکلی ''کیوں؟''

''میری شادی طے ہوگئی ہے''

کس سے؟

چچا کے لڑکے کے ساتھ جو لام سے ہو کر یہاں آیا تھا۔ وہ چکوال میں ہے صوبیدار ہے، اور تم جا رہی ہو! میں نے تلخی سے پوچھا۔ ہاں۔

وہ چپ ہوگئی۔ میں بھی چپ ہو گیا۔ سوچ رہا تھا اسے ابھی جان سے نہ مار دوں یا شادی کی رات قتل کر دوں۔ تھوڑی دیر رک کے بانو پھر بولی، سنا ہے چکوال میں پانی بہت ہوتا ہے سنا ہے وہاں بڑے بڑے نل ہوتے ہیں جن سے جب چاہو ٹوٹی گھما کے پانی نکال لو۔ اس کی آواز خوشی کے مارے کانپ رہی تھی۔ وہ شاید اور بھی کچھ کہتی لیکن شاید میری آزردگی کا خیال کر کے چپ ہوگئی۔

میں نے اس کے بالکل قریب آ کر اسے دونوں شانوں سے پکڑ لیا اور غور سے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک لمحہ میری طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی نگاہوں میں میری محبت سے انکار نہیں تھا بلکہ پانی کا اقرار تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے شانے چھوڑ دیئے اور الگ ہو کے کھڑا ہو گیا۔ یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ محبت سچائی خلوص اور جذبے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ تھوڑا پانی بھی مانگتی ہے۔ بانو کی جھکی ہوئی نگاہوں میں اک ایسی جانگسل شکایت کا گریز تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو، جانتے ہو ہمارے گاؤں میں کہیں پانی نہیں ملتا۔ یہاں میں دو دو مہینے نہا نہیں سکتی۔ مجھے اپنے آپ سے اپنے جسم سے نفرت سی ہوگئی ہے۔

بانو چپ چاپ زمین پر چشمے کے کنارے بیٹھ گئی۔ میں اس تاریکی میں بھی اس کی آنکھوں کے اندر اس محبت کے خواب کو دیکھ سکتا تھا جو گندے بدبودار جسموں پسوؤں جوؤں اور کھٹملوں کی ماری غلیظ چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی محبت نہ تھی۔ اس محبت سے نہائے ہوئے جسموں، دھلے ہوئے کپڑوں اور نئے لباس کی مہک آتی تھی۔ میں بالکل مجبور اور بے بس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

رات کے دو بجے۔ بانو اور میں۔ دونوں چپ چاپ کبھی ایسا سناٹا جیسے ساری دنیا خالی ہے کبھی ایسی خاموشی جیسے سارے آنسو مر گئے ہیں۔

چشمے کے کنارے بیٹھی ہوئی بانو آہستہ آہستہ گھڑے میں پانی بھرتی رہی۔ آہستہ آہستہ پانی گھڑے میں گرتا ہوا بانو سے باتیں کرتا رہا اس سے کچھ کہتا رہا مجھ سے کچھ کہتا رہا۔ پانی کی باتیں انسان کی بہترین باتیں ہیں۔

بانو چلی گئی۔

جب بانو چلی گئی تو میرے ذہن میں بچپن کی وہ کہانی آئی جب محبت روئی تھی اور آنسو نمک کے ڈلے بن گئے تھے۔ اس وقت میری آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ تھا لیکن میرے دل کے اندر نمک کے کتنے بڑے بڑے ڈلے اکٹھے ہو گئے تھے، میرے دل کے اندر نمک کی ایک پوری کان موجود تھی۔ نمک کی دیواریں ستون غار اور کھارے پانی کی ایک پوری جھیل۔ میرے دل و دماغ اور احساسات پر نمک کی ایک پتلی سی جھلی چڑھ گئی تھی اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اگر میں اپنے جسم کو کہیں سے بھی کھرچوں گا تو آنسو ڈھلک کر بہہ نکلیں گے اس لئے میں چپ چاپ بیٹھا رہا اور جب وہ میرے طرف دیکھ کر ڈھلوان پر مڑ گئی اس وقت بھی میں چپ چاپ بیٹھا رہا کیونکہ میرے پاس پانی نہیں تھا اور بانو پانی کے پاس جا رہی تھی۔

جس رات بانو کا بیاہ غضنفر سے ہوا اس رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ہماری کھوئی ہوئی ندی ہمیں واپس مل گئی ہے اور نمک کے پہاڑ پر میٹھے پانی کے چشمے ابل رہے ہیں اور ہمارے گاؤں کے مرکز میں ایک بہت بڑا درخت کھڑا ہے۔ یہ درخت

سارے کا سارا پانی کا ہے اس کی جڑیں، شاخیں، پھل، پھول پتیاں سب پانی کی ہیں اور اس درخت کی شاخوں سے، پتوں سے پانی بہہ رہا ہے اور یہ پانی ہمارے گاؤں کی بنجر زمین کو سیراب کر رہا ہے۔

اور میں نے دیکھا کہ کسان ہل جوت رہے ہیں، عورتیں کپڑے دھورہی ہیں، کان کن نہا رہے ہیں اور بچے پھولوں کے ہار لئے پانی کے درخت کے گرد ناچ رہے ہیں اور بانو صاف ستھرے کپڑے پہنے میرے کندھے سے لگی مجھ سے کہہ رہی ہے، اب ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت اگ آیا ہے۔ اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔

یہ بڑا عجیب خواب تھا لیکن میں نے جب اپنے ابا کو سنایا تو وہ مارے ڈر کے کانپنے لگے بولے ''تم نے یہ خواب میرے سوا کسی دوسرے کو تو نہیں سنایا'' میں نے کہا 'نہیں ابا مگر آپ ڈر کیوں گئے ہیں''۔

یہ تو ایک خواب ہے۔

وہ بولے ''ارے خواب تو ہے مگر یہ ایک سرخ خواب ہے''

میں نے ہنس کر کہا ''نہیں ابا جو درخت میں نے خواب میں دیکھا وہ سرخ نہیں تھا۔ اس کا رنگ تو بالکل ایسا تھا جیسے پانی کا ہوتا ہے۔ وہ پانی کا درخت تھا۔ اس کا تنا، شاخیں، پتے سب پانی کے تھے۔ ہاں اس درخت پر پھلوں کی جگہ کٹ گلاس کی چمکتی ہوئی صراحیاں لٹکی تھیں اور ان میں پانی بچوں کی ہنسی کی طرح چمکتا تھا اور فواروں کی طرح اونچا جا کے گرتا تھا''۔

وہ بولے ''کچھ بھی ہو یہ بڑا خطرناک سپنا ہے۔ اگر پولیس نے کہیں سن لیا یا تم نے کسی سے اس کا ذکر کر دیا تو وہ تمہیں اس طرح پکڑ کے لے جائیں گے جس طرح وہاں مزدوروں کو پکڑ کر لے گئے تھے جنہوں نے ہمارے گاؤں کی ندی کو واپس لانا چاہا تھا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم اس خواب کا ذکر کسی نے نہ کرو۔ اسے بھول جاؤ جیسے تم نے یہ خواب کبھی نہ دیکھا تھا کیونکہ اس خواب کا چرچا کر کے اس سے کچھ نہ ہوگا، سوکھی ندی ہمیشہ سوکھی رہے گی اور پیاسے سدا پیاسے رہیں گے''۔

مجھے اپنے ابا کے لہجے کی حسرتنا کی آج تک یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ شروع شروع میں اس کا ذکر میں نے کسی سے نہیں کیا لیکن جب چند مزدور ساتھیوں سے اپنے خواب کا ذکر کیا تو وہ میرا جواب سن کر ڈرنے کی بجائے ہنسنے لگے اور جب میں نے ان سے پوچھا کہ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے تو انہوں نے کہا ''بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات۔ یہ خواب تو بہت اچھا ہے اور یہ ان کی کان میں ہر ایک دیکھ چکا ہے''۔

''کیا سچ کہتے ہو! وہی پانی کا درخت؟''

''ہاں ہاں۔ وہی پانی کا درخت گاؤں میں، ایک ٹھنڈا میٹھا پانی کا چشمہ ہر نمک کی کان میں''

''گھبراؤ نہیں، ایک دن یہ خواب ضرور پورا ہوگا''۔

پہلے مجھے ان کی باتوں کا یقین نہیں آیا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام کرتے کرتے اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ہمارا خواب ضرور پورا ہوگا ایک دن ہمارے گاؤں میں پانی کا درخت ضرور اگے گا۔ اور جو جام خالی ہیں وہ بھر جائیں گے اور جو کپڑے میلے ہیں وہ دھل جائیں گے اور جو دل ترسے ہوئے ہیں وہ کھل جائیں گے اور ساری زمینیں اور ساری محبتیں اور ساری ویرانی اور سارے صحرا شاداب ہو جائیں گے۔

◆◆◆

سو روپے

میں نے سو روپوں کا کام کیا تھا۔ مجھے سو روپے ملنے چاہیے اس لیے میں نے سیٹھ سے بات کی۔

سیٹھ نے کہا ''سولہ تاریخ کو آنا''

میں سولہ تاریخ کو گیا۔

سیٹھ وہاں نہیں تھا۔ اس کا بڈھا منیجر جس کی چندیا صاف تھی اور جس کا ایک دانت باہر نکلا ہوا تھا اور جو اپنے اسسٹنٹ کو کسی غلطی پر ڈانٹ رہا تھا، مجھ سے بڑی شفقت سے کہنے لگا ''تم نے سو روپے کا کام کیا ہے، تم کو برابر سو روپے ملیں گے۔ مگر آج سیٹھ یہاں پر نہیں ہے کل آنا''۔

میں نے پوچھا ''اگر سیٹھ کل بھی یہاں نہ ہوا تو؟''

منیجر بولا ''تو میں انتظام کر رکھوں گا، تم فکر نہ کرو تمہارا پیسہ تم کو مل جائے گا۔

میں نے دفتر سے باہر نکل کر دو پیسے کا پونا پتہ، سکیلی مسالہ اور ہری پتی والا پان کھایا۔ دو پیسے میں دیسی کالا کانڈی اور ٹھنڈک والا پان بھی کھا سکتا تھا اور ملٹھی، لال مسالہ والا پان بھی اور بنارسی چھوٹا پتہ، گیلی ڈلی اور الا یچی والا پان یا موہنی تمباکو والا، مگر میں نے صرف پونا پتہ سکیلی مسالا اور ہری پتی والا ہی کھایا کیونکہ مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی اور میری جیب میں صرف

ڈیڑھ دو آنے تھے اور یہ پان جو میں نے کھایا کافی موٹا ہوتا ہے اور دیر تک منہ میں رہتا ہے۔

پھر میں نے ایک آنے کا ٹرام کا ٹکٹ لیا اور ٹرام میں بیٹھ کر میں نے زور سے سیٹھ کی بلڈنگ کی طرف تھوک دیا۔

دوسرے دن پھر سیٹھ وہاں نہیں تھا۔ اس کے منیجر نے کہا ''سیٹھ آج بھی یہاں نہیں ہیں اور پھر تمہارے حساب میں کچھ غلطی بھی ہے''۔

مجھے غصہ آیا۔ میں حساب دے چکا تھا۔ منیجر اسے دس بار چیک کر چکا تھا پھر بھی کہیں غلطی نکل آتی ہے مگر میں کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ منیجر کا لہجہ بہت نرم تھا اور اس ہر فقرہ ریشم میں لپٹا ہوا تھا۔ اس لیے میں نے بھی نرمی سے کہا ''میرا حساب تو بہت صاف ہے''۔

اتنا کہہ کر میں نے اپنی خاکی پتلون کی جیب سے ایک میلا پرزہ نکالا اور منیجر کے ساتھ گیارہویں دفعہ تفصیلات چیک کرنے بیٹھ گیا۔ اتنے پیسے ریگ مال پھیرنے کے، اتنے پیسے روغن کے، اتنے پیسے مزدوری کے، ریگ مال اور روغن کی رسیدیں میرے پاس تھیں۔ مزدوری پہلے سے طے ہو چکی تھی۔ سیٹھ کا فرنیچر میری محنت سے جگ مگ، جگ مگ کر رہا تھا۔

منیجر نے کہا ''ہاں حساب ٹھیک ہے، اچھا کل آنا''

''مگر کل ضرور'' میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

''ہاں کل ضرور'' منیجر نے چندیا کو سہلاتے ہوئے کہا۔

باہر آ کر میں نے دو پیسے کا پان بھی نہیں کھایا، ایک آنے کا ٹرام کا ٹکٹ بھی نہیں لیا اور فیروز شاہ مہتا روڈ سے سائین تک پیدل گیا۔

مگر دوسرے دن میں پھر سیٹھ کے دفتر گیا۔

آج دفتر میں سیٹھ موجود نہیں تھا، منیجر بھی غائب تھا۔

منیجر کا اسسٹنٹ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ایک سنگل چائے اپنے سامنے رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بہت زرد تھا۔ ماتھے کے قریب، سفید رخساروں کے قریب پیلا اور تھوڑی کے قریب مٹیلا سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کے چہرے کی ہڈیوں پر کھال

کے بجائے میلے میلے، پیلے پیلے کاغذ تراش کے منڈھ دیئے ہوں۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

اسسٹنٹ نے پیالی سے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے پوچھا ''سیٹھ کہاں ہیں؟''

وہ بولا ''سیٹھ اپنے دوسرے دفتر گیا ہوا ہے''

''اور منیجر کہاں ہے؟''

''منیجر سیٹھ کے تیسرے دفتر گیا ہے''۔

''تو مجھے یہاں چوتھی منزل پر کس لیے بلایا ہے؟'' میں نے ذرا غصے میں تیز ہوتے ہوئے کہا۔

اسسٹنٹ نے چائے کا آخری گھونٹ بھی نگل لیا۔ آہستہ سے بولا۔ ''تم یہاں بیٹھ جاؤ، منیجر ابھی آتا ہوگا۔ اس سے بات کر لینا''۔

میں ایک کرسی پر ساڑھے دس بجے سے لے کر پونے دو بجے تک بیٹھا رہا۔

پہلے میں نے سوچا کہ کسی شیشے کا ٹکڑا لے کر سارے روغن کو اتار دوں جو میں نے اتنی محنت سے اس فرنیچر پر چڑھایا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اسسٹنٹ کے نقلی چہرے سے پیلے پیلے کاغذ کے ٹکڑوں کو اتارتا جاؤں حتیٰ کہ اندر کی ہڈی ننگی ہو جائے۔ پھر میں نے سوچا، منیجر کو جان سے مار دینا بہتر ہوگا۔ بہت دیر تک سیٹھ کیلئے سزا سوچتا رہا۔ آخر خیال آیا کہ اس کے سارے جسم پر بی نمبر کی موٹی ریگ مال پھیر دوں گا تو اس کی ساری کھال ادھڑ کر ننگی ہو جائے گی۔ پھر منیجر آ گیا۔

مسکراتے ہوئے بولا ''تمہارا کام ہو گیا ہے، مگر چیک ملا ہے سو روپے کا اور اب پونے دو بج چکے ہیں اور دو بجے بنک بند ہوتا ہے اور بنک یہاں سے دو میل دو ہے اور کل چھٹی ہے اور پرسوں اتوار ہے۔'' میں نے مایوسی سے کہا

''ہاں'' منیجر مسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

میں نے بے حد رکھائی سے کہا ''چیک مجھے دے دو''

پانچ منٹ اور چیک لینے میں گزر گئے کیونکہ چیک پر میرا نام غلط لکھا ہوا تھا۔ محمد شفیع کے بجائے محمد رفیع لکھا ہوا تھا۔

''چچ چچ''، منیجر نے کہا ''بڑی غلطی ہوگئی، محمد شفیع لکھتے لکھتے محمد رفیع لکھا گیا مگر کوئی حرج نہی، اب تم سوموار کو آ کے نیا چیک لے لینا''۔

میں نے کہا ''مگر یہ بیرر چیک ہے۔ نام کی غلطی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میرے نام کی رسید لے لو اور چیک مجھے دے دو، سوموار کو میں کہاں آؤں گا کہیں اور دھندا کروں گا''۔

''اچھا لے جاؤ''، منیجر نے رکتے رکتے کہا۔

چیک لے کر باہر آیا تو دو بجنے میں پونے دو منٹ تھے کسی صورت پیدل چل کے بنک نہیں پہنچ سکتا۔ سو روپے کا چیک میرے ہاتھ میں تھا مگر ابھی کاغذ کا پرزہ تھا۔ اسے سو روپوں میں تبدیل کرنے کیلئے بنک تک پہنچنا ضروری تھا۔ دو بجے سے پہلے صرف ایک صورت ہوسکتی تھی۔

میں نے فیصلہ کرلیا اور چلا کر کہا ''ٹیکسی''

پیلی چھت اور سیاہ جسم والی ٹیکسی زوم سے میرے قریب آ کر رک گئی۔

میں نے اندر بیٹھتے ہوئے کہا '' کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر چلو اور ذرا تیز چلو' جب کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر پہنچا تو دو بجنے میں دو منٹ تھے مگر بنک کالبا دیوی روڈ پر نہیں تھا، گو چیک پر یہ لکھا تھا مگر بنک کالبا دیوی روڈ کے ناکے پر نظر نہ آیا۔ دو ایک دکانداروں سے پوچھا، کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی، کوریا میں جنگ تیز تھی، بھاؤ بھی تیز جا رہے تھے، کسی کو وارنش کرنے والے کے سو روپوں کی فکر تھی؟

ہار کر میں نے ایک پنجابی سکھ ہارمونیم بنانے والے کی دکان میں گھس گیا۔ '' آیئے آیئے کیا باجہ چاہیے آپ کو؟'' سردار نے اس آری کو چھوڑ کر جس سے وہ لکڑی کاٹ رہا تھا مجھ سے مسکرا کر کہا۔

میں نے کہا ''سردار جی مجھے باجہ نہیں چاہیے، مرکنٹائل بنک کا پتہ چاہیے چیک پر تو لکھا ہے کالبادیوی روڈ اور یہاں کہیں نہیں ملتا''۔

سردار جی نے مسکرا کر کہا ''بادشاہو! وہ بنک ساتھ والی گلی میں ہے، ادھر سے گھوم کر سٹہ بازار سے اس طرف پرانے چاندی والے مندر کے پاس''۔ میں نے سردار جی کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا بھاگا واپس ٹیکسی کے پاس، جب بنک میں پہنچا تو دو بج کر چار منٹ تھے۔ اصولاً میرا چیک کلرک کو نہیں لینا چاہیے تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلرک چیک پڑھنے کے علاوہ چہرہ پڑھنا بھی جانتا تھا۔ اس نے خاموشی سے چیک مجھ سے لے لیا۔ پھر الٹا کر کے دیکھا، مجھ سے کہنے لگا۔

اس پر دستخط کر دو۔

میرا نام محمد شفیع تھا لیکن میں نے محمد رفیع لکھا۔ یہ محمد رفیع کون تھا؟ یہاں کہاں سے آیا تھا؟ کب پیدا ہوا؟ اس کی صورت کیسی تھی؟ اس کے ماں باپ کون تھے؟ کون جانتا ہے؟ کچھ زندگیاں ایسی ہوتی ہیں جو چیک پر لکھی جاتی ہیں اور چیک پر ہی کاٹ دی جاتی ہیں۔

میں ٹیکسی والے کو چلتا کرنے لگا۔ دو روپے دو آنے ٹیکسی چھوٹی تھی اس لیے میٹر بڑھا نہیں۔ ٹیکسی بڑی ہوتی تو پانچ سات روپے کھل جاتے۔ میں خوشی سے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنے میں کسی نے آ کے میرے شانے پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا ''کہو میرے یار، بڑے ٹیکسی میں گھوم رہے ہو آج''۔

میں نے گھوم کر دیکھا: میرا دوست اسحاق تھا۔ اسحاق بڑے کھلے دل کا آدمی تھا۔ وہ خود تو عبدالرحمٰن سٹریٹ کے نادر ایک خوجہ کے مکان میں ایک تنگ سے کمرے میں رہتا ہے اور وہی دھندا کرتا ہے جو میں کرتا ہوں یعنی وارنش کا اور پرانے فرنیچر کو پھر سے نیا کر دینے کا لیکن اس کی محبوبہ محمد علی روڈ اور کرافورڈ مارکیٹ کے ناکے پر ایک اچھے ہوٹل میں رہتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے بڑی خوبصورت عورت ہے، بڑے بڑے سیٹھوں کے پاس جاتی ہے۔ یہ اسحاق اس سے پہلے اس کے پاس ڈرائیور تھا۔ اسحاق کو یہ کام پسند نہیں آیا اور وہ اس سے الگ ہو گیا۔

وہ عورت اس کو بہت پسند کرتی ہے، یہ بھی اس کو چاہتا ہے مگر وہ اس کو اپنے دھرے

پر لانا چاہتی ہے اور یہ اس کو اپنے طریقے پر رکھنا چاہتا ہے۔ دونوں میں ہمیشہ لڑائی ہوتی ہے۔ پھر یہ اس سے دس بارہ روز نہیں ملتا۔ پھر وہ اس سے ملنے آتی ہے۔ ایسے ہی یہ چکر چلتا رہتا ہے کبھی کبھی اسحاق جب کوئی موٹی رقم کما لیتا ہے تو اسے جا کے دے آتا ہے اور اسے ایک لیکچر بھی جھاڑ آتا ہے۔ مگر جس عورت کے پاس اچھا ہوٹل ہوگا، اچھی جوانی، صحت اور خوبصورت ہوگی اور سونے چاندی والے سیٹھ ہوں گے۔ وہ وارنش کرنے والے اسحاق کی بات کیوں سننے لگی، سوچنے کی بات ہے یارو!

میں نے اسحاق سے پوچھا ''مجھے بھوک لگی ہے، کچھ کھاؤ گے؟''

وہ بولا ہاں بھوکا تو میں بھی ہوں، چلو فیروزے کباب یے کی دکان پر۔

فیروزے کباب یے کی دکان سے فارغ ہو کر اسحاق نے مجھ سے دس روپے ادھار لئے اور اپنے راستے پر چلا گیا۔ مجھے اسحاق بہت پسند ہے۔ اس کے اس ہوں تو نا نہیں کرے گا، سب کو کھلائے پلائے گا اور جب پیسے نہی ہوں گے تو میرے سوا کسی سے قرض نہیں مانگے گا۔ بھوکا مر جائے گا مگر کسی سے ادھار نہیں لے گا۔ ایسا دوست جو دنیا میں میرے سوا کسی سے ادھار نہ لے کہاں ملتا ہے؟ مجھے اسحاق کی دوستی پر بڑا فخر ہے۔ میں جب بھی اسحاق سے ملتا ہوں، ایک عجیب سی خوشی لا پروائی، بچوں کی سی مسرت محسوس کرتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل میں کوئی غم نہیں ہے، کوئی تکلیف نہیں ہے۔ جیسے ساری دنیا کھلونوں سے بھری پڑی ہے اور اسکے سارے بازار میرے لیے سجے پڑے ہیں۔ بعض آدمیوں میں کچھ ایسی ہی طاقت ہوتی ہے۔ بعض آدمیوں میں کچھ ایسی ہی بات ہوتی ہے۔

اس وقت اسحاق سے مل کر میرا جی ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میں نے کرافورڈ مارکیٹ سے دو سیب خرید کر کھائے، ایک بھکاری کو دو آنے دیئے وہاں سے چلتا چلتا بوری بندر آ گیا۔ لیکن جیب میں سو روپے تھے اور ابھی گھر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اس لیے بوری بندر سے ہارن بی روڈ پر ہو گیا۔

ہارون بی کی دکانیں مجھے بہت پسند ہیں، خاص طور پر ان کے نمائشی دریچے میں

آئینے لگے ہوئے ہیں اور نی آن کی روشنیاں اور قد آدم کانچ کی بڑی بڑی شفاف سلوں کے پیچھے کیسی کیسی خوبصورت چیزیں پڑی ہوئی ہیں۔ خوبصورت ٹائیاں، موزے، جراب، پتلون کے کپڑے مفلر، جوتے، ہر ہفتے ان دریچوں کے اندر خوبصورت چیزیں بدل جاتی ہیں اور پرانے ڈیزائنوں کی بجائے نئے ڈیزائن آ جاتے ہیں۔ شام کو گھر جانے سے پہلے میں اکثر ہارون بی روڈ کے نمائشی دریچے دیکھا کرتا ہوں۔ جیب میں پیسے ہوں یا نہ ہوں اس سے کوئی غرض نہیں لیکن میں اکثر اپنا کام ختم کر کے بوری بندر جانے کیلئے ہارون بی روڈ سے گزرتا ہوں اور ایک دریچے سے ناک رگڑ کر اندر کی خوبصورت چیزیں دیکھا کرتا ہوں۔ اس میں مجھے اتنا لطف حاصل ہوتا ہے جتنا بچپن میں نئے کھلونے دیکھ کر حاصل ہوتا تھا۔

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نئے کرکرے نوٹوں کو تھپتھپایا اور بڑی شان سے ایوان اینڈ فریزر کے نمائشی دریچوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ آہ! کس قدر خوبصورت قمیض تھی۔

بادامی رنگ کی صاف شفاف قمیض پر بلیو اور سرخ دھاریاں میرا تو جی مچل گیا، میں نے اپنی قمیض کے پھٹے ہوئے کالر کو سہلایا۔ اس بلیو اور سرخ رنگ کی دھاری دار قمیض کو پہن کر میں کیسا دکھائی دوں گا۔ میں نے تخیل میں اپنے آپ کو قمیض پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے دیکھا، واہ! کیا ٹھاٹ تھے اور قمیض کے دام تھے صرف تیس روپے اس سے تگنے روپے اس وقت میری جیب میں تھے، میں یہ قمیض خرید سکتا تھا مگر کچھ اور بہتر دیکھنے کی خاطر آگے چلا گیا۔

اگلے دریچے میں خوبصورت صابن تھے، جھاگ والے، اسپنج اور تولیے جنہیں دیکھ کر خود بخود نہانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ یہ سب میں خرید سکتا تھا۔ اس سے اگلے دریچے میں مردوں کیلئے شب خوابی کے گاؤن تھے۔ بھڑکیلے، ریشمی، منقش گاؤن جنہیں پہن کر وارنش والا بھی مصر کا پاشا معلوم ہو۔ سترہ روپے کا گاؤن اور اس سے زیادہ رقم میرے پاس تھی۔ میں نے اس گاؤن کو اپنے تخیل میں پہنا اور ایک ایرانی غالیچے پر اڑتا ہوا دور چلا گیا۔ ہوا صاف تھی، میرے نیچے خوبصورت باغوں والی زمین گھوم رہی تھی اور ہری ہری دوب میں ایک چھریری

نازک اندام ندی ایک پہاڑی حسینہ کی طرح دھوپ سینک رہی تھی۔

میں نے اس غالیچے کو اس ندی کے کنارے اترنے کا حکم دیا۔ غالیچہ ندی کے کنارے اتر آیا اور خود بخود کہیں سے ایک صراحی آ گئی اور ایک مرمریں ہاتھ اور دو آنکھیں اور ایک حسین چہرہ۔ پھر مجھے کسی نے ٹہوکا دیا کرخت لہجے میں بولا۔

''آگے بڑھو، اب کسی اور کو بھی دیکھنے دو، آدھے گھنٹے سے یہیں کھڑا ہے نہ لینا نہ دینا'' میں نے مسکرا کا ایوان اینڈ فریزر کے وردی پوش غلام کی طرف دیکھا جو مجھے ڈانٹ رہا تھا اور آگے چل دیا۔ بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ میرے پاس ایک اڑنے والا ایرانی غالیچہ ہے اور جیب میں ستر روپے سے بھی زیادہ کی رقم ہے۔ میں اس وقت اندر جا کے اس گاؤن کو خرید سکتا تھا، مگر میرا جی نہیں مانا۔ ہارن بی روڈ پر اس سے بہتر بھی کوئی چیز ہو گی۔ آگے چل کر دیکھا جائے۔ اس وردی پورش غلام کو تو کسی وقت بھی شکست دی جا سکتی ہے۔

آگے چلتا چلتا بہت سی دکانیں دیکھتا بھالتا میں جگد مبالال پائل کی دکان پر پہنچ گیا۔ یہاں نمائشی دریچے میں کیمرے پڑے تھے جنہیں میں خرید سکتا تھا۔ کیمرے خرید کے میں ان فرنیچروں کی تصویر لے سکتا تھا جو پرانے تھے لیکن جنہیں میرا وارنش اور میری محنت اتنا خوبصورت بنا دیتی تھی کہ وہ بالکل نئے فرنیچر کی طرح جگمگانے لگتے تھے۔ میں نے سوچا یہ کیمرہ لے کر میں اسحاق کے پاس چلا جاؤں گا اور اسے کہوں گا۔

''چل، آج تیری اور تیری محبوبہ کی اکٹھی تصویریں لیں گے'' میں نے اپنا ایرانی غالیچہ منگوایا اور کیمرہ ہاتھ میں لے کر سارے جہان کے خوبصورت مناظر کی تصویریں اتارنے لگا۔

کیمرے کے ساتھ جادو بین پڑی تھی جس میں دیکھنے سے تصویریں بالکل اپنی گہرائی کے ساتھ نظر آتی ہیں یعنی جیسے آدمی بالکل آپ کے سامنے چل پھر رہے ہوں اور مکان آپ کے سامنے ہو بہو جیسے آپ کا۔ تصویر اپنی لمبائی چوڑائی اور موٹائی کے ساتھ اتنی اچھی دکھائی دیتی کہ سینما میں بھی اتنی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ بچپن میں ایک بڑھیا ایک بڑی سی جادو بین ہمارے محلے میں لایا کرتی تھی اور ہم لوگ ایک پیسہ دے کر تماشا دیکھتے تھے۔ اس جادو بین

کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے کانپنے لگا اور دکان کے اندر داخل ہو گیا۔

کونٹر پر میں نے ایک نوجوان سے پوچھا ''یہ جادو بین کتنے کی ہے؟''

''ساڑھے پینتیس روپے کی''

نوجوان بڑی خوبصورت قمیض پہنے تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے اور پیچھے کو گھومے ہوئے ٹی آئرن کی روشنی میں نئے فرنیچر کے وارنش کی طرح چمکتے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بھی جوانی کی وارنش تھی۔ اس کے لبوں پر ایک مغرور مسکراہٹ تھی جو صرف چیک لکھتے وقت پیدا ہوتی تھی۔ اس نے میری طرف سے نگاہ اٹھا کر ایک خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی دکان میں داخل ہوئی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا اور ایک میلے میلے چہرے والا نا آسودہ گجراتی جو غالباً اس کا اسسٹنٹ تھا، میری طرف آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا وارنش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے اور اس نے مسکرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

میں نے کہا ''جادو بین مجھے دیکھاؤ''

اس نے جادو بین میں ایک مدور فلیتہ رکھ کر میرے ہاتھ تھما دیا اور مجھ سے کہا: ''اسے گھماتے جاؤ، یوں سوئچ دبا کر، نئی نئی تصویریں تمہارے سامنے آتی جائیں گی'' میں نے بٹن دبایا ''ٹارزن ہاتھی پر سوار سامنے سے چلا آ رہا تھا۔

میں نے بٹن دبایا۔

ٹارزن آبشار میں چھلانگ لگا رہا تھا، نیچے مگر مچھ کتنے خوف ناک معلوم ہو رہے تھے، میں نے بٹن دبا دیا۔

پھولوں کے گجرے، پھولوں کے ہار اور پھولوں کے لہنگے پہنے ہوئے ہوائی جزیرے کی لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔

میں نے بٹن دبا دیا۔

ساحل کی ریت پر شراب اور پھل اور بسکٹ اور کھانے کی چیزیں ایک شفاف طشتری میں پڑی تھیں اور ایک عورت ریت پر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کا منہ میرے اس

قدر قرب تھا کہ میں نے جلدی سے بٹن دبا دیا۔

ایرانی غالیچہ زمین پر آ گیا۔

میں نے گجراتی خارش زدہ کلرک سے کہا ''یہ جادو بین تو بہت اچھی ہے، میرے بچپن کی جادو بین سے ہزار درجے بہتر ہے، کتنے میں دو گے؟''

وہ مسکرائے بغیر بولا ''ساڑھے پینتس روپے کی جادو بین آتی ہے، مدور رنگین تصویروں والے فیتلے ایک درجن اس کے ساتھ لینا پڑیں گے۔ دس روپے کے یہ ہوں گے، سیلز ٹیکس اس کے علاوہ پچاس کے اوپر رقم جائے گی۔

میں جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے نئے کر کرے نوٹوں کو تھپتھپایا آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ اس سے پہلے میرے دل میں جادو بین کے سوائے اور کوئی تصویر نہ تھی۔ لیکن نوٹوں کو ہاتھ لگانے سے ایک دم مجھے دھچکا سا لگا اور بہت سی تصویریں بٹن دبائے بغیر ہی میرے سامنے گھوم گئیں۔

ایک بچہ پھٹی ہوئی قمیض پہنے گلی کے فرش پر بیٹھا ہے اور رو رہا ہے۔ میں نے پہچانا میرا بچہ تھا۔ ایک عورت کی شلوار کا پائنچہ دوسرے پائنچہ سے اونچا ہے۔ اس کی اوڑھنی اس کے سر کے الجھے ہوئے بال باہر نکلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ

ایک آدمی دروازے پر کھڑا ہے۔

اس کی صورت ہر لمحہ بدلتی جاتی ہے۔ اس کا غصہ ہر لمحہ بڑھتا جاتا ہے۔

کبھی یہ مالک مکان کا منیجر بن جاتا ہے۔

کبھی دودھ والے سیٹھ کا نوکر۔

کبھی بجلی والی کمپنی کا عہدیدار۔

کبھی پانی والے دفتر کا۔

میں نے بٹن دبا دیا۔

اب میرے سامنے گھر کے فرش پر ایک خالی طشتری پڑی تھی جس پر ایک گلاس اوندھا پڑا ہے۔

نوٹ میری جیب سے باہر نکلے، پھر وہیں ہاتھ رہ گئے۔

خوبصورت کلرک، خوبصورت لڑکی کو کیمرہ بیچ کر کونٹر پر واپس آ گیا۔ میں جلدی سے گھوم کر دکان سے واپس جانے لگا۔ باہر جاتے جاتے میں جانتا تھا کہ وہ کلرک اپنی بہترین وارنش شدہ مسکراہٹ سے میرے پھٹے ہوئے کالر دیکھ رہا ہے، میری خاکی زین کی پتلون دیکھ رہا ہے، جس کی پٹھ میں دو جگہ ٹکڑے سلے ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہا ہے۔

میں نے اچھی طرح دانت پیس لیے، اچھی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور نمائشی دریچوں سے نگاہ اٹھا کر سیدھا بوری بندر کی طرف چلنے لگا۔

چلتے چلتے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے مجھ سے شدید دھوکا کیا ہے، کسی نے مجھے سو روپے دے کر دوسو چھین لیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرا ایرانی غالیچہ اور جادو بین بھی چھین لی ہے۔ کسی نے زور سے میرے منہ پر چپت ماری ہے۔ کسی نے میرے ہر نوٹ پر لکھایا ہے۔

''تمہارے لیے نہیں''

میرے قدم بھاری ہوتے گئے اور میں نے محسوس کیا کہ میری محنت کا ہر نوٹ اداسی کی ایک لمبی زنجیر ہے، جسے میں خود اپنے ہاتھوں سے کھینچ رہا ہوں۔

بوری بندر پہنچ کر یکایک میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج گاڑی سے اپنے گھر واپس نہیں جا سکتا۔ آج پیدل ہی بوری بندر سے سائین جاؤں گا۔

بہت رات گئے میں تھکا ماندہ اپنے گھر لوٹا، میری بیوی متفکر تھی اور میرا انتظار کر رہی تھی لیکن جب اس نے نوٹ دیکھے تو خوش ہو گئی۔ اس لیے وہ میری اداسی کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

بولی ''لیکن یہ کیا بات ہے، تم آج خوش ہونے کی بجائے اداس ہو؟''

میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''جانِ من! آج مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ دنیا بہت بوڑھی ہو چکی ہے اور مجھے ایسی دنیا چاہیے جو بچوں کی طرح مسکرا سکے''۔

وہ بولی ''میں نہیں سمجھی تم کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''جانِ من! میں کہہ رہا ہوں کہ اب پرانے فرنیچر پر وارنش کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اب نیا فرنیچر لانا ہوگا۔

◆◆◆

دردگردہ

کرسچین کراہ رہا تھا۔ دردگردہ نے اس کے پیٹ میں کرب انگیز لہریں دوڑا دی تھیں۔اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ان لہروں کی مدافعت نہ کر سکے گا اور پھر کل اس کا آپریشن ہونے والا تھا۔ دوسرا آپریشن، پہلا آپریشن کامیاب نہ ہوا تھا۔ دائیں گردے کا بہت بڑا حصہ کاٹ ڈالا گیا تھا اور پتھری بھی نکل آئی تھی، لیکن درد اسی شدت کے ساتھ موجود تھا اور پیشاب زخم سے رستا تھا۔لحظہ بہ لحظہ گویا اس کی جان نکلی جارہی تھی۔ وہ اپنے سرہانے کے دائیں طرف لوہے کی سلاخ پکڑ کر اسے زور سے بھینچتا۔لیکن اس سے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوتا تھا بلکہ اسے یہ معلوم ہوتا کہ ہسپتال کے آہنی بستر کی سلاخیں اس کے پیٹ میں چبھی جارہی ہیں۔

''میرے خدا......میری ماں'' وہ بار بار کہتا۔اس کی ماں مرچکی تھی، یعنی خدا کے پاس جاچکی تھی اور خدا......اے خدا میری سن لے میں اس درد کی شدت سے مرا جاتا ہوں۔کل میرا آپریشن ہونے والا ہے۔دوسرا آپریشن، اے خدا! مجھے زندہ رہنے دے۔ڈاکٹر کہتا ہے کہ میرے جینے کیلئے ایک ہی گردہ کافی ہے۔اے خدا مجھے اس درد سے نجات دے، مجھے زندہ رکھ اے خدا...... میری ماں''۔ وہ آہستہ آہستہ دیر تک کراہتا رہا اور اپنے خدا اور اپنی ماں اور اس ہولناک سیاہ رنگ کی پتھری کو یاد کرتا رہا جو پہلے آپریشن کے وقت اس گردے میں سے نکالی گئی تھی۔اس کے ابروؤں کے نیچے دو سیاہ گڑھوں میں اس کی آنکھیں خطرناک طور پر چمکتی تھیں۔لیکن اس کے

چہرے پر زردی کو کوئی علامت نہ تھی۔ کیونکہ اس کے چہرے کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور یہ سیاہی اور بھی گاڑھی ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی فاؤنٹین پن کی سیاہی کی طرح تھی جو لکھتے وقت تو تازہ اور بلیو بلیک رنگ کی ہوتی ہے۔ لیکن خشک ہوتے ہوئے بالکل سیاہ ہو جاتی ہے۔

جائے اپنی سفید ٹوپی ٹھیک کرتے ہوئے اس کے بستر کے قریب آئی۔ جائے کی شفقت، ہمدردی اور مامتا سارے ہسپتال میں مشہور تھی۔ باقی نرسیں بھی بیماروں سے نہایت التفات سے پیش آتی تھیں۔ لیکن کنواری جائے کا انداز ہی الگ تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں کی حزیں موہنی نگاہیں، اس کے لبوں کی پتلی خمیدہ مسکراہٹ جیسے پہلے دن کے چاند کا سیمیں کنارہ۔ اس میں ایسی پاکیزگی تھی جو مرتے ہوئے بیماروں کے دلوں پر بھی تسکین کا پھاہا رکھتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مسکراہٹ سب کچھ سمجھتی ہے، سب کچھ جانتی ہے۔ جیسے وہ ساری کائنات کے دکھ اور درد کا بار اپنی نازک قوس پر اٹھائے ہوئے ہے۔ کرسچین اسے دیکھتے ہی اپنے درد میں کمی محسوس کرتا۔ اسے ایسا معلو ہوتا گویا وہ کرب انگیز طوفانی لہریں جو اس کے پیٹ اور دھڑ میں تڑپ رہی ہیں۔ اب مدھم اور ہلکی ہوتی جا رہی ہیں اور جب تک وہ اس سے ہم کلام رہتی یا اس کی چھاتی پر ہاتھ پھیرتی رہتی اس کا درد مدہم رہتا اور اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں غنودگی پیدا ہونے لگتی اور اس کے سینے کی روانی ٹھیک ہونے لگتی۔ کرسچین اس وقت ایسا محسوس کرتا گویا جائے کی آنکھوں میں مریم کا سا تقدس ہے اور اس کے ہاتھوں میں باپ یسوع کی مسیحائی۔ اکثر کرسچین کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جائے اس کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں دوسرے بیماروں کی نسبت زیادہ شفقت اور تندہی سے کام لیتی ہے۔ اس لیے وہ بھی جائے تو اپنے قریب پا کر زیادہ آرام محسوس کرتا تھا۔ کرسچین کا درد آج خلاف معمول بہت بڑھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جائے بھی خلاف معمول آج زیادہ مغموم معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ گہری تھی۔ آنکھیں ڈبڈبائی سی۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور کانپتی ہوی آواز میں بولی۔ ''معلوم ہوتا ہے خواب آور دوا کی خوراک نے تم پر کچھ اثر نہیں کیا''۔

''نہیں......آج درد بہت زیادہ ہے'' اس نے رکتے ہوئے جواب دیا۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہیں ایک خوراک پلائے دیتی ہوں۔ تم بہت آرام سے سوسکو گے۔ کل تمہارا آپریشن ہونے والا ہے اور اس کے بعد تم بالکل اچھے ہو جاؤ گے''۔

''ہاں۔ اس کے بعد میں بالکل اچھا ہو جاؤں گا''۔ کرسچین نے ناامیدی کے لہجے میں کہا۔

نرس نے کرسچین کی خواب آور دوا کی دوسری خوراک پلائی اور کرسچین کی آنکھوں سے ابلتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ دیا

کرسچین نے اپنی چھاتی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''میرا دم گھٹا جاتا ہے''۔ لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی جائے نے اس کی چھاتی کو سہلانا شروع کر دیا تھا۔

آہستہ آہستہ کرسچین کی آنکھوں پر غنودی چھانے لگی۔ وہ سوچنے لگا جائے کتنی اچھی ہے۔ خدا کتنا مہربان ہے۔ اسے اپنی ماں کی یاد آئی۔ جواب مر چکی تھی۔ اچھا ہوا، ورنہ وہ اپنے بیٹے کو یوں موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہ دیکھ سکتی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اب کے جائے نے انہیں نہیں پونچھا، ہاں وہ اس دنیا میں اب بالکل اکیلا تھا۔ ایک غریب کلرک، بے یارو مددگار، خیراتی ہسپتال میں دم توڑ رہا تھا۔ شروع شروع میں دفتر کے چند دوست اسے دیکھنے کیلئے آئے تھے۔ ایک دفعہ اس کے سیکشن کا بڑا بابو بھی اسے دیکھنے آیا تھا اور اس کے لئے پھول اور پھل بھی لایا تھا۔ لیکن اب مدت پوری ہوگئی، کسی نے اس کی خبر نہ لی تھی۔ چند ایک رشتے دار تھے۔ لیکن وہ جبل پور تھے۔ اتنی دور سے کرایہ خرچ کر کے وہ کیسے آتے اور آ بھی سکتے تو کیا کرتے۔ اس کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اب وہ بلا تنخواہ چھٹی پر تھا۔ دفتر کا کام بدستور چل رہا تھا اور اسے یہ جان کر بہت رنج ہوا تھا۔ وہ اپنا وجود دنیا میں بہت ضروری سمجھتا تھا۔ جیسے دنیا کا کام کرسچین کے بغیر نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن اب جس دن سے وہ بلا تنخواہ چھٹی پر تھا اسے اپنے غیر مصرف ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔

جائے کتنی مہربان ہے اور وہ نیا آدمی جو اس کی جگہ پر کام کر رہا تھا یہی سوچتا ہوگا کہ خدا کرے وہ مر جائے، اور اس کی جگہ ملازمت سنبھال لے۔ آخر اسے اپنے پیٹ کا دھندا کرنا

تھا۔ لیکن یہ اسے کیا معلوم کہ کبھی پیٹ کا دھندا کرتے کرتے ایسی کرب انگیز لہریں اٹھتی ہیں کہ...... ہرا بھرا باغ خوبصورت پھول، پیلا فراک پہنے ہوئے سائیکل سوار ایک حسین لڑکی نیلے آسمان پر سفید کبوتروں کی ڈار، اور دفتر کا میز، جس پر جا بجا سیاہی کے بدنما دھبے پڑے ہوئے تھے......اس نے سوچا کہ پیٹ میں ایسی کرب انگیز لہروں کے اٹھتے ہوئے بھی اس کا ذہن ان چیزوں کی طرف کیوں منتقل ہوتا ہے۔ تیس روپیہ ماہانہ میں اسے کون سی خوشی نصیب تھی۔ صبح سے لے کر شام تک وہ میز پر سر جھکائے فائلوں میں اندراج کرتا رہتا اور افسروں کی جھاڑ سن کر اور بھی زیادہ انہماک سے میز کے اوپر جھک کر کام کرنے لگتا۔ ہائے یہ درد، جیسے اس کی جان کو اندر ہی اندر سے سلب کیے جاتا تھا۔ پیلا فراک پہنے ہوئے سائیکل سوار شوخ لڑکی، دفتر آتے جاتے اسے اکثر ملتی تھی۔ لڈلو کیسل کے قریب یوکلپٹس کے درختوں کی اونچی پھننگیں نیلے آسمان کے پاس منظر میں لہراتی تھیں۔ سفید کبوتروں کی ڈار اڑتی چلی جا رہی تھی۔ کاش اس کے پاس کیمرہ ہوتا۔ ایک بار اس نے اپنی تنخواہ میں سے تین روپے بھی بچائے تھے۔ لیکن پھر سردیوں میں اسے کھانسی کی دوا خریدنا پڑی تھی۔ لال لال دوا۔ بعض دوائیں بہت خوشرنگ ہوتی ہیں۔ بعض اس کے چہرے کی طرح سیاہ۔ لیکن اس کے نقش تو اتنے برے نہ تھے۔ مدت سے اس نے آئینہ بھی نہ دیکھا تھا اور اس کی نگاہوں میں پھر پیلا فراک گھومنے لگا۔ کتنا اچھا فراک تھا وہ، حسین لڑکی، مس جوائے، سب کنواریوں میں حسین ہے اور شفیق، مہربان...... ہائے یہ درد، جیسے تند لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہر ایک تھپیڑے پہ اسے سہلا رہی تھی۔ اب سب مریض سو رہے تھے۔ کیا معلوم یہ اس کی آخری رات تھی۔ اس کی آنکھوں سے پھر آنسو ابلنے لگے۔ لیکن وہ تو ابھی جوان تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ دنیا کو میری موت کی پروا نہیں لیکن مجھے اپنی زندگی کیوں پیاری ہے۔ مس جائے اب تو تھک گئی ہوگی۔ یہ منحنی پتلی سی انگلیاں، بے چاری مس جائے صبح سے لے کر شام تک کام کرتی ہے۔ کبھی اس کے ماتھے پر بل نہیں پڑتا۔ اس نازک ناتواں جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آئی، اتنی جان، اتنی روشنی، اتنی آگ، کرسچین کے پاس اس کی دی ہوئی انجیل تھی۔ اس کی متاع تمام۔ اس کی ماں کی آخری نشانی۔ وہ اسے قبر میں نہ لے جائے

گا۔ جب مس جائے اس کی چھاتی سہلا کر اٹھے گی تو وہ اسے اس کے حوالے کر دے گا۔ اس کی نگاہ کہے دیتی ہے کہ وہ دلوں کا درد پہچانتی ہے۔ وہ اسے لینے سے انکار نہ کرے گی۔ کل آپریشن ہے۔ کیا مرنے سے پہلے ہسپتال والے مجھے لڈلو کیسل نہیں دکھا سکتے۔ وہ سڑک کا موڑ، پیلے فراک والی لڑکی، سپید کبوتر، یوکلپٹس کی شاخیں ہوا میں جھومتی ہوئیں۔ تھرتھراتی ہوئی، لہروں کے گول گول چکر...... جائے کے ہاتھ گھومتے ہوئے...... لمپ کی روشنی مدھم ہو چکی ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ روشنی اور تاریکی...... جھلمل...... جھلمل......

کرسچین سو رہا تھا اور لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ جائے آہستہ آہستہ اس کی چھاتی سہلاتے گئی۔ لمپ کی روشنی میں کرسچین کا چہرہ ایک سیاہ نقاب کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جو کارنیوال کے ظریف اکثر پہنتے ہیں۔ کارنیوال...... کارنیوال...... اسے کارنیوال دیکھے ہوئے کتنی مدت ہو گئی۔ اسے مریض کی تیمارداری سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ کارنیوال اور کارنیوال کی خوشیاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے معصوم قہقہے جن میں جوانی کی خوشیاں جھلکتی تھیں۔ کرسچین کی آنکھیں بند تھیں اور سیاہ گڑھوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ پپوٹوں کی جھلیاں آپس میں اس طرح جڑی ہوئی تھیں جیسے کسی خشک لیکن تاریخ گڑھے کی تہہ پر گندگی کی سیل جمی ہوئی ہو۔ آج سے تین سال پہلے اسی بستر پر پڑے پڑے اس کے محبوب نے دردگردہ سے جان دی تھی۔ اس کا آپریشن بھی دوبارہ کیا گیا تھا۔ ان دنوں وہ بھی نئی نئی ہسپتال میں آئی تھی، اور ہندوستانیوں کے بھورے، کالے رنگدار جسموں کو ہاتھ لگانے سے بھی ہچکچاتی تھی۔ ایک خاص قسم کی نفرت تھی۔ جس پر قابو پانے کی بہت کوشش کرتی تھی۔ پھر بھی وہ نفرت بدستور قائم تھی۔ لیکن جاوید نے اس کی نفرت کو محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔ لانبا قد، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں جن میں ہر وقت ایک ذہنی پریشانی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ فراخ ماتھا، بال پتلے ملائم الجھے ہوئے، اسے اس کے بال اب بھی یاد آ رہے تھے۔ جب وہ اس کے سر میں تیل ڈال کر آہستہ آہستہ مالش کر کے انہیں پیچھے کی طرف گھما دیا کرتی تھی۔ چنبیلی کے تیل کی تیز سی خوشبو اس کے نتھنوں میں پھیلتی ہوئی معلوم ہوئی اور اب بھی گویا وہ اپنی ناتواں سی انگلیوں کو بالوں کے نرم و

نازک گچھوں کو چھو رہی تھی...... آہ! لیکن یہ تو کرسچین کی چھاتی کے بال تھے۔ سخت اور کھردرے، غریب کرسچین کل اس کا آپریشن ہوگا۔ اور پھر خدا جانے...... اس سے کرسچین کا دکھ نہ دیکھا جاتا تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ اپنے محبوب کو دوبارہ مرتے ہوئے دیکھ رہی ہو۔ اس کی نیلی آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں، کسی زمانے میں اسے ہندوستانیوں سے نفرت تھی۔ لیکن جاوید نے اس کی نفرت کو محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ اکثر اکیلا پڑا کراہتا رہتا یا پھر کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔ لیکن اسے مذہب کتابوں سے نفرت تھی۔ اسے یاد آیا کہ کس طرح اس نے جب ایک بار انجیل پڑھنے کو دی تھی تو اس نے اسی وقت اس کتاب کو چوم کر اسے واپس کر دیا تھا۔ ''میں مذہبی کتابیں نہیں پڑھا کرتا۔ لیکن میں نے اسے تمہاری خاطر چوم لیا ہے''۔ وہ اسی طرح عجیب عجیب باتیں کیا کرتا۔ اور کبھی ایک دم چپ ہو جاتا۔ اور گھنٹوں کسی سے کلام نہ کرتا۔ اس کے دوست بہت تھے اور اکثر اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ انہیں اکثر اس کے پاس بیٹھنے کی اجازت دے دیتی تھی۔ گو یہ قاعدے کے خلاف تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی۔ وہ کچھ اس لہجے میں جس میں خودداری اور لجاجت دونوں ملے ہوئے ہوتے، اس سے اجازت طلب کرتا کہ وہ اس کی بات رد نہ کر سکتی۔ جاوید شاید درد کے وقت بہت کم چلاتا تھا۔ شاید اسی بات نے اسے پہلے پہل متاثر کیا تھا۔ وہ پہلی نگاہ اسے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ کسی کام کی وجہ سے بھاگتی بھاگتی اس کے بستر کے قریب سے جا رہی تھی۔ کہ یکا یک اس کی نگاہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے لب بھنچے ہوئے تھے۔ زرد بلکہ سپید سے لب لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وہ تمام خوفناک کرب نمایاں تھا جو اس کے بیمار گردے سے نکل کر سارے جسم میں لہریں پھیلا رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا، جیسے وہ نہتا جانور ہے اور پانی کے اندر سمندری ہزار پائے سے اکیلا جنگ کر رہا ہے۔ ہزار پائے کے ملتے ہوئے بازو اس کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ لیکن وہ نہایت دلیری سے جنگ کر رہا تھا۔ استقلال اور ہمت اور خاموشی، جیسے اس کی پشت دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور سامنے بندوق کی باڑ کے مقابلے پر قہقہے لگا رہا ہو اور جب اس نے پوچھا۔ ''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' تو اس نے نہایت نرمی سے کہا ''درد گردہ'' اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اس کی ذاتی

جنگ تھی۔ وہ اسے جائے کی رحم آمیز نگاہوں سے بچانا چاہتا تھا۔ جائے نے اکثر دیکھا تھا کہ ہندوستانی جب بیمار ہوتے ہیں تو بہت چلاتے ہیں۔ دکھ تھوڑا ہوتا ہے۔ شور زیادہ ہوتا ہے۔ ہر وقت ''مس صاحب'' کی رٹ لگی رہتی ہے ''جیسے'' مس صاحب کو صرف ایک ہی بیمار کو دیکھنا ہوتا ہے اور انہیں اُسی کے علاج معالجے، تیمارداری اور دیکھ بھال کیلئے تنخواہ ملتی ہے۔ بیمار لوگ چڑ چڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ لیکن ہندوستانی تو بالکل ہی صبر کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں سب تو نہیں، لیکن اکثر...... جاوید اس نے پہلا ہندوستانی مریض دیکھا تھا کہ درد سے بیتاب ہو کر بھی اف نہ کرتا تھا۔ اکثر خواب آور دوا بھی نہ پیتا تھا۔ کئی بار وہ دوا لے کر اس کے سرہانے کھڑی ہوتی تو اس نے کتاب پڑھتے پڑھتے اس کی طرف ایک ایک حزیں مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ ممکن نہیں کہ میں یہ خواب آور دوا نہ پیوں، مجھے درد سے جنگ کرنے میں مزا آتا ہے۔ درد میری توجہ اپنی طرف کھینچا چاہتا ہے۔ میں اپنی توجہ کتاب کو پڑھنے میں صرف کرتا ہوں اور اکثر''۔ وہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔ ''اکثر میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔'' لیکن کرسچین بچارا تو بالکل دو سالہ بچے کی طرح بلبلا اُٹھتا ہے۔ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔ سوکھی ہوئی گردن میں حلقوم کسی اکھڑے ہوئے درخت کی مڑی ہوئی جڑ کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ کل کے آپریشن سے جانبر ہو سکے گا۔ لیکن ڈاکٹر واٹ......ڈاکٹر واٹ کو ذہن میں اپنے سامنے آتے دیکھ کر وہ کانپ اٹھی۔ میانہ قد، سرخ مونچھیں، گٹھا ہوا جسم، بڑے بڑے مضبوط ہاتھ، شکل وصورت اور اطوار سے بھی وہ ایک سرجن کے بجائے ایک قصاب نظر آتا تھا۔ جب وہ ہسپتال میں نئی نئی آئی تھی، تو ڈاکٹر واٹ نے اسے کہا تھا کہ جائے سب کنواریوں میں سب سے زیادہ حسین ہے اور اس نے شرارت سے اس کے گال پر ایک چٹکی بھی لی تھی۔ اس کا سارا جسم آگ کی طرح گرم ہو گیا تھا اور اس کی شعلہ بار نگاہیں دیکھ کر ڈاکٹر واٹ نے کھسیانی ہنس کر اس سے کہا تھا، یہ تو ایک مذاق تھا، ننھی لڑکی، جاؤ وارڈ میں کام کرو۔ وارڈ میں اسے پہلے پہل ہندوستانیوں کے جسموں سے بھی ایک عجیب قسم کی بو آیا کرتی تھی۔ جسے فنائل اور لال سول بھی دور نہیں کر سکتے تھے۔ جاوید کو فنائل کی بو سے سخت نفرت تھی اور جب اسے اس نفرت کا احساس

ہوا تھا تو اس نے مہتر کو ہدایت کر دی تھی کہ کم از کم اس کے بستر کے ارد گرد وہ فنائل یا لائی سول نہ چھڑ کا کرے وہ مسکرا کر کسی اردو شاعر کا ایک شعر پڑھا کرتا تھا۔ ہندوستانی کو وہ ایک غیر مہذب زبان سمجھتی تھی۔ لیکن وہ شعر سن کر اس کے گالوں پر بھی سرخی دوڑ جاتی تھی۔ جاوید نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں سے اسے خوش کر دیا کرتا تھا۔ آج یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بھالے بن کر اس کے کلیجے کو چبھ رہی تھیں...... کیوں نہ وہ بھی درد گردہ سے مرگئی......اسے یاد آیا کہ جب جاوید کا پہلا آپریشن ہوا تھا تو وہ کتنا بشاش نظر آتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ وہ یوں اپنی حزیں مسکراہٹ کو چھپا کر اس دنیا سے ہمیشہ کیلئے چلا جائے گا۔ اسے موت ہسپتال ہی میں کیوں لائی؟ کیا وہ کسی اور جگہ جا کر نہ مر سکتا تھا۔ وہ یہاں داخل ہی کیوں ہوا اور اگر داخل بھی ہوا تھا تو کیوں اس نے اپنی مرتی ہوئی زندگی کا غبار محبت اس کی آنکھوں میں جھونک دیا تھا۔ جائے کو اپنی آنکھیں جلتی ہوئی معلوم ہوئیں اور آنسو تیز رفتاری سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ یہ کیا انصاف تھا، یہ کیسی خدائی تھی !وہ یہاں اپنے روزگار کا دھندہ کرنے آئی تھی، نہ کہ روح کو روگ لگانے کیلئے۔

جائے نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اپنے غم کو بھول جائے گی۔ زیادہ تندہی سے بیماروں کی خدمت کرے گی۔ اس خدمت کو ایک مقدس فرض سمجھ کر سرانجام دے گی۔ اسے اس فرض سے عشق ہونا چاہیے۔ لیکن عشق تو اسے جاوید کی آنکھوں سے تھا۔ اس کی علو ہمتی سے، اس کے صبر سے، اس کی حزیں مسکراہٹ سے، وہ ان چیزوں کو کہاں سے لائے۔ اب جاوید کی یاد میں اس کی چند کتابیں رہ گئی تھیں۔ اردو کی کتابیں، جنہیں وہ سمجھ بھی نہ سکتی تھی۔ لیکن جنہیں اس نے نہایت احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ انگریزی کی بھی چند کتابیں تھیں، جن پر لال پنسل سے نشان تھے اور کہیں کہیں عبارات، کیٹس کے ایک مصرعے کے آخری تین حرف "Joy for Ever" ایک جگہ Joy Indescrib-able اور پھر...... Joy is Transitary...... غریب جاوید...... وہ جائے کو عارضی سمجھتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کم بخت جائے اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گی۔ ایک بار اس نے کہا۔ ''جانتی ہو، جائے اور جاوید دونوں نام ایک ہی حرف سے شروع ہوتے ہیں''۔ جائے اور جاوید...... وہ یہ سن کر دل ہی دل میں کتنی

خوش ہوئی تھی اور گھر جا کر اپنی ڈائری میں کئی بار لکھا۔ جائے، جاوید''...... ''جائے' جاوید''۔ پہلے آپریشن کی رات کو وہ یکا یک مغموم ہو گیا تھا۔ یاسیت اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ دن بھر دوست اسے رجھاتے رہے تھے۔ لیکن وہ ہر بار کسی یقین کے ساتھ کہہ اٹھتا۔ نہیں دوست میں اس آپریشن سے جانبر نہیں ہو سکتا۔ اور جب دوست چلے گئے تو اس کا تخیل اور بھی تاریک ہوتا گیا اور ایسی نظروں سے جائے کو تک رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ کیلئے الوادع کہہ رہا ہو۔ پھر جائے نے بارہ بجے کے راؤنڈ کے وقت بھی اسے جاگتے ہوئے پایا تھا اور جائے نے اسے نہایت شوق سے کہا تھا، میں نے ابھی ایک میڈیکل سٹوڈنٹ سے تمہارے نام کا مطلب پوچھا تھا۔ اس نے کہا۔ جاوید کے معنی۔ ''ہمیشہ رہنے والا'' تم جو ہمیشہ رہنے والے ہو۔ کیسے مر سکتے ہو۔ اس پر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ شاید اسے جائے کی بات کا یقین ہو گیا تھا اور دوسرے دن اس نے ہنسی خوشی آپریشن کرا لیا تھا۔ پھر جائے کو یاد آیا۔ جب اس نے متواتر تین دن تک جاوید کے جسم پر مالش نہیں کی تھی۔ پورے تین دن تک، اسے معلوم تھا کہ جاوید اس کے ہاتھ سے مالش کرانا پسند کرتا ہے۔ لیکن دو دن سے وہ اس کے بستر کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی اور مسکرا کر اس کے قریب سے ہو کر ادھر ادھر گزر جاتی تھی۔ جاوید نے نہایت ہی خاموشی سے اسے برداشت کرتا رہا اور ہارڈی کا ایک ناول پڑھتا رہا۔ اس نے اس کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ لیکن تیسرے دن جب وہ اسے مالش کرنے بیٹھی تو اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ دو دن سے تم نے میری مالش نہیں کی جائے۔ اور جائے ایک لمحے کیلئے اس کی آنکھوں کی ملول تنہائی میں کھو گئی۔ اور پھر جب جائے نے کہا۔ ''مجھے دو دن زکام رہا۔ میں نے کہا، میں نے کہا، تمہیں مالش نہ کروں کہیں تمہیں زکام نہ ہو جائے''۔ تو ان آنکھوں کی تاباں مسرت اور بہجت نے جائے کے دل کے گوشے گوشے کو لبریز کر دیا تھا۔ ہائے وہ خوبصورت لمحے! اس وقت جاوید کے بستر پر بیٹھے ہوئے جائے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سات جزیروں کی رانی اور زخمی شاہ آرتھر کو اپنی شاہی کشتی میں بٹھائے کسی بے نام نیلی جھیل کے پار اپنی مملکت میں لے جا رہی ہے۔ لیکن کائنات کے بے رحم خداؤں کو جائے کی خوشی بھی گوارہ نہ تھی۔ جاوید پہلے آپریشن سے

اچھا نہ ہوا تھا۔ درد بدستور تھا، گو پتھری نکالی جا چکی تھی۔ لیکن درد کی شدت کہے دیتی تھی کہ اور آپریشن کرنا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر واٹ نے بہت سوچ بچار کے بعد دوسرے آپریشن کا فیصلہ کیا تھا۔ اور جائے کو دوسرے آپریشن کے وہ تاریک ایام یاد آئے۔ جب جاوید کے دوستوں نے بھی آنا جانا کم کر دیا تھا۔ اس کی آدھی تنخواہ والی چھٹی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دو سیاہ گڑھوں میں دھنسی جا رہی تھیں اور گردے سے ہر وقت پیشاب رس رس کر بہتا رہتا تھا۔ ان دونوں جاوید کی خاموشی اور بھی گہری ہوگئی تھی۔ اس کی اذیت اور بھی تلخ۔ اس کی آنکھیں دن میں صرف اس وقت چمکتیں جب جائے اس کے سامنے آجاتی، یا جب جائے علی الصبح گارڈینا کے پھولوں کا ایک گلدستہ اسے بھیج دیتی۔ گارڈینا کے پھول جاوید کو بہت پیارے تھے۔ ان کی مہک سارے وارڈ میں پھیل جاتی تھی۔ اس نے اکثر جائے سے کہا تھا کہ گارڈینا کے پھول دیکھ کر اسے اکثر لارنس گارڈن کا ایک کونا یاد آجاتا تھا۔ جہاں گارڈینا کے پھولوں کی ایک بیل سڑک کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اور لوکاٹ اور پام کے درختوں کے جھنڈ کے اوپر چاند چمکتا تھا۔ پھر اس نے جائے سے آہستہ سے کہا۔ ''جب میں اچھا ہو جاؤں گا تو ہم تم دونوں وہاں جایا کریں گے۔ کتنے اچھے ہیں یہ گارڈینا کے پھول''۔ جائے نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اب وہ کبھی نہیں روئے گی۔ لیکن جب بھی وہ اس دن کو یاد کرتی تھی۔ جب جاوید کی موت کے کچھ عرصہ بعد لارنس گارڈن گئی تھی۔ جہاں سڑک کے ایک گوشے میں گارڈینا کے پھولوں کی بیل تھی اور لوکاٹ اور پام کے درختوں کے اوپر چاند چمک رہا تھا۔ تو اس کی چھاتی بے اختیار سسکیوں کے بوجھ سے بھاری ہوگئی۔

دوسرے دن آپریشن سے پانچ دن پہلے جائے کی تبدیلی کلکتے میں ہوگئی۔ ڈاکٹر واٹ نے کہا فوری تبدیلی ہے اسے تین دن سے زیادہ ٹھہرنے کا وقت نہیں مل سکتا۔ اسے فوراً ہی کلکتہ روانہ ہو جانا چاہیے۔ سنگدل ڈاکٹر واٹ! اسے اس قصاب سے کس قدر نفرت تھی۔ جاتے جاتے اس نے جائے سے طنزاً کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ ہندوستانی چھوکرے کی نگہداشت کیلئے تمہیں کسی اور نرس پر اعتبار کرنا پڑے گا''۔ جائے کو کلکتہ جانے سے کیا انکار ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ

اس وقت جانا نہ چاہتی تھی۔ جاوید موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہا تھا۔ زندگی سے بھی زیادہ شاید وہ جائے کو چاہتا تھا۔ لیکن اگر وہ کلکتہ چلی گئی تو جاوید کبھی بچ نہ سکے گا۔ اگر جاوید نے سن لیا تو پھر وہ کبھی نہ بچ سکے گا۔ اس خبر کو وہ اپنے دل میں ہی رکھے گی۔ اس نے ڈاکٹر واٹ سے گڑگڑا کر استدعا کی تھی کہ وہ اس کی تبدیلی کو منسوخ کرا دے یا التواء میں ڈال دے۔ لیکن وہ اس کیلئے اتنا بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ وعدہ کرتی تھی کہ جاوید کے اچھا ہو جانے کے پر وہ فوراً کلکتہ چلی جائے گی۔ ہاں وہ جاوید سے محبت کرتی تھی۔ اس محبت کے اقبال کر لینے میں اسے کسی قسم کی شرم اور ہچکچاہٹ نہ محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر واٹ نے اس سے کہا۔ تمہاری تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ کسی طرح بھی ہو تمہیں فوراً جانا ہوگا۔ ہاں ایک صورت ہے۔ اور اتنا کہہ کر اسے جائے کی طرف پر معنی نگاہوں سے دیکھا اور جائے اس کے اسٹڈی روم سے اس طرح کانپتی ہوئی بھاگ آئی جیسے مجسم شیطان اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ جب پیچھے مڑ کر اس نے دیکھا تو ڈاکٹر واٹ کھڑکی کے سبز پردوں کے درمیان اپنا چہرہ باہر نکالے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''جائے ہسپتال کی سب کنواریوں میں سے حسین ہے۔'' وہ کیا کرے، وہ جاوید کو چھوڑ کر کلکتہ کیسے جا سکتی تھی۔ وہ استعفیٰ دے کر بھی رہ سکتی تھی۔ لیکن پھر اسے ہسپتال میں گھسنے کون دے گا۔ اور یہ قصاب...... اور پھر چار دن کے بعد جاوید کا آپریشن تھا۔ جاوید، اس کا محبوب جو زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ اس تذبذب میں دو دن گزر گئے۔ وہ دن بھر تیمارداری میں مصروف رہتی، صبح و شام خدا سے دعا کرتی کہ وہ اس کی مشکل کو آسان کر دے۔ لیکن اس کی مشکل آسان ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ چوتھے دن ڈاکٹر واٹ نے اسے دھمکی دی اور کہا کہ اگر وہ کلکتہ نہ جائے گی تو اسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا اور ہسپتال میں گھسنے بھی نہ دیا جائے گا اور کل جاوید کا آپریشن تھا۔ یکایک جائے نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کیا۔

جائے کو آج بھی جب کہ اس واقعہ کو تین سال ہو چکے تھے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط...... بہرحال اس فیصلے کے بعد خدا نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ اس کی

تبدیلی منسوخ ہوگئی تھی اور اب جائے کو جو ہسپتالوں کو کنواریوں میں سب سے حسین تھی، صرف اتنا یاد تھا کہ دوسرے دن جب وہ اپنے لب بھینچے، گارڈینا کے پھولوں کا گچھا اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر وارڈ میں گئی تو اس نے دیکھا کہ جاوید مرا پڑا ہے...... پو پھٹ رہی تھی۔ روشن دان کے ذریعے سورج کا سونا بہہ بہہ کر اندر آ رہا تھا۔ شرقی آسمان میں کرنوں کے لالہ زار کھیت لہرا رہے تھے۔ لیکن جاوید کائنات کی تمام خوبصورتی سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر مرا پڑا تھا۔ جائے نے گارڈینا کے پھول اپنی انگلیوں میں مسل ڈالے اور جاوید کی چھاتی پر جھک گئی اور اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسکیاں لینے لگی۔

علی الصباح جب کرسچین جاگا تو اس نے دیکھا کہ مس جائے اس کی چھاتی پر اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں ڈھانپے سو رہی ہے۔ اس نے آہستہ سے جھنجوڑا مس صاحبہ...... مس صاحبہ...... پھر وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر پرے ہٹ گیا۔ کنواری جائے کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں اور آنسوؤں کے دونوں سوتے گالوں پر بہہ بہہ کر خشک ہو گئے تھے۔

◆◆◆

آنگی

مسافر نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ آسمان کے نیلے سمندر میں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے برف کے بڑے بڑے تودوں کی طرح تیر رہے تھے اوران کے قریب چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ چیلیں، اس نے ہانپ کے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ اب کوئی گاؤں قریب ہی ہوگا۔ چیلیں انسانی آبادی کا نشان ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔ گدھ، کوے، چیلیں، انسان، ان جانوروں کی صفات ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ اسی طرح سوچتا ہوا عالم حیوانات کی خصوصیت کے متعلق مختلف نظریئے قائم کرتا ہوا وہ بہت سا راستہ طے کر گیا۔ کئی جگہ ترچھی ڈھلانیں تھیں، کئی جگہ اونچی اونچی گھاٹیاں تھیں۔ جن کے دامن میں کھڑے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی چوٹیوں پر بادلوں کے محل بنے ہیں مگر جب وہ بادلوں کی چوٹیوں پر پہنچتا تو بادلوں کا محل یکا یک اوپر اٹھ کر آسمان میں معلق ہو جاتا۔ اس دنیا میں کتنا دھوکا ہے۔ مسافر کے تخیل نے اب دوسری پگڈنڈی اختیار کی۔ مہاتما بدھ نے ٹھیک کہا تھا، قدرت ایک سراب ہے۔ اس نے پھر نگاہ اٹھا کر دور آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا۔ سپید براق چمکتے ہوئے لاکھوں تاج محل تھے اور چاروں طرف جمنا کا پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس نے سوچا ان مرمریں محلوں کو کسی شاہجہاں نے بنوایا ہے؟ اور کسی محبوب کی یاد میں۔

مسافر اسی طرح اپنے دل سے باتیں کرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ اب ہوا میں خنکی سی آ

گئی تھی اور سورج مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ سامنے پہاڑوں پر صنوبروں کے جنگل کھڑے تھے جن کا گہرا سبز رنگ ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں ہلکا ارغوانی سا ہو رہا تھا۔ یہ رنگ آخر ہے کیا؟ نیلا، پیلا، ارغوانی اور پھر ایک ہی قوس قزح میں ساتوں رنگ یا شبنم کے ایک ہی قطرے میں پوری قوس قزح عجیب بات ہے۔ یہ کیسی دنیا ہے، میں کہاں جا رہا ہوں اور وہ گاؤں ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

وہ کاندھے پر پڑے ہوئے جھولے کو درست کر کے اپنی چھڑی کو زمین پر ٹیک کر راستے میں کھڑا ہو گیا اور سرسری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ خاموشی گہری خاموشی اور پھر گھنٹیوں کی پرشور صدا۔ اسے معلوم ہوا کہ لاکھوں مندروں اور کلیساؤں کے گھنٹے ایک دم جھنجھنا اٹھے ہیں۔ مسافر کا خیر مقدم کرنے کیلئے ان آوازوں نے وادی کے طلسم کو توڑ دیا۔ یہ آواز بڑھ کر فضا میں تیر گئی۔ اوپر اٹھے ہوئے بادلوں سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوئی اور پھر گھوم گھوم کر مغرب کی سمت سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مغربی موڑ سے بھیڑوں، بکریوں، گایوں، بھینسوں، مینڈھوں کا ایک ریوڑ نکل رہا تھا۔ مسافر راستہ چھوڑ کر ایک طرف اونچے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا۔

ہاہش بلی، ہاہاہش نیلتی، ہاہا بلی، ہی ہی

نیلتی اور بلی، دو خوبصورت بچھریاں واپس گھر جانے کی خوشی میں ہرن کی طرح قلانچیں بھر رہی تھیں اور بچاری چرواہی کو انہیں ریوڑ کے ساتھ رکھنے میں بہت دقت محسوس ہو رہی تھی۔ نیلتی کبھی بھیڑوں کے گلے میں گھس جاتی اور انہیں اتنا پریشان کرتی کہ وہ ''بابے، بابے'' کرتی ہوئی تتر بتر ہو جاتی اور سارے ریوڑ کے نظام کو جو کسی تربیت یافتہ فوج کی باقاعدگی کے ساتھ چل رہا تھا توڑ دیتی، بلی ناچتی کودتی بکریوں کے قریب جاتی اور انہیں دھکے مار مار کر آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھا دیتی، بڑی بوڑھی گائیں اور بھینسیں نہایت اطمینان سے اور قدرے حقارت سے یہ منظر دیکھتی جاتی تھیں، کر لے دو دن اور عیش، پھر وہ دن بھی آئے گا جب تیری پچھلی ٹانگوں کو باندھ کر تیرا دودھ دوہا جائے گا۔ اس وقت اچھلنا، پھر تیری چال بھی ہماری

طرح بے ڈھنگی ہو جائے گی۔اب جی بھر کر مست ہرنی کی طرح قلانچیں بھر لے۔

نیلتی ،اچھلتی کودتی ہوئی مسافر کے قریب آ گئی،اس کے گلے میں بندھی ہوئی خوش آئند آواز اس کے ناچتے ہوئے قدموں کے گھنگھروؤں کا کام دے رہی تھی۔ پھر اگلے پاؤں ٹیلے پر ٹیک کر وہ مسافر کے پاؤں سونگھنے لگی جیسے جنگل میں گھاس کے کسی خوشے کو سونگھ رہی ہو— ''نیلتی ہا!'' چرواہی نے اپنی پتلی آواز میں چلا کر کہا۔اس کی آواز بھی ایک گھنٹی سے مشابہ تھی،مگر حسین نیلتی نے کوئی پروانہیں کی،شاید شوخی یا شرارت سے بچاری چرواہی کو تنگ کرنے کیلئے وہ مسافر کا بوٹ چاٹنے لگی۔

''نیلتی ہا ہا ہش،نیلتی ہی'' وہ پھر چلائی۔

چرواہی مسافر کے بالکل قریب آئی اور سونٹے سے نیلتی کو سزا دینے لگی۔ بچاری تنگ آ گئی تھی۔ چہرے پر پسینے کے قطرے تھے اور گال بھی غصے سے تمتمائے ہوئے تھے۔نیلتی کو پرے ہٹا کر اس نے نڈر نگاہوں سے مسافر کی طرف تاکا۔''راہی کوکو' راہی۔ راہرو کدھر جا رہے ہو۔اس نے پہاڑی زبان میں مسافر سے پوچھا۔

مسافر مسکرا دیا۔ پھر کہنے لگا۔''نیلتی کتنی شریر ہے''۔

چرواہی کے چہرے کی ترشی جاتی رہی۔ وہ نیلتی کی طرف جو کم بخت مار کھا کر بھی ناچتی بھاگتی ہوئی جارہی تھی۔ پیار بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔''ہاں ابھی تین سال بھی اس کی عمر نہیں''۔

''ہم......اور تمہاری عمر کتنی ہے؟''

چرواہی نے ایک لمحہ کیلئے مسافر کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا۔ دوسرے لمحہ میں اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔اس نے منہ پھیر لیا اور ریوڑ کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ گایوں کی پیٹھ پر ہلکے ہلکے سونٹے مار رہی تھی۔

مسافر ٹیلے سے اتر کر چرواہی کے ساتھ ہو گیا اور اس کا سونٹا چھین کر اس سے کہنے لگا۔معلوم ہوتا ہے آج تمہارا بھائی ساتھ نہیں۔جبھی تو ریوڑ چرانے میں تمہیں اتنی تکلیف ہوتی

ہے۔اب دیکھو میں ریوڑ کو سنبھالتا ہوں اور تم ایک شریف ننھی لڑکی طرح میرے پیچھے آ ؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ مجھے بہت دور جانا ہے۔سورج غروب ہونے کو ہے، کتنی دور ہے تمہارا گاؤں۔ یہ ہم واپس کدھر جا رہے ہیں۔

چرواہی نے ہنستے ہوئے کہا۔گاؤں تو تم پیچھے چھوڑ آئے تھے اس لیے واپس جا رہے ہو۔ دیکھا نا۔اس گھاٹی کے قریب (انگلی اٹھا کر) وہ ہمارا گاؤں ہے۔

''کیا نام ہے؟''چرواہی نے جلدی سے جواب دیا۔''سارو''

مسافر نے چرواہی کی طرف دیکھ کر کہا''میں کہنے کو تھا تمہارا نام کیا ہے؟''

میرا نام...... میرا نام آنگی ہے۔ (آنگی نے رکتے رکتے جواب دیا) کہاں سے آ رہے ہو؟ مسافر نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ زور زور سے ریوڑ کو آوازیں دینے میں مصروف ہو گیا۔ ہاہا نیلتی ہا، آنگی ہاہا، بلی ہا،

آنگی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اچھا تو گویا میں بھی ایک بچھیا ہوں، او ہو میں ہنستے ہنسے مر جاؤں گی۔ یہ راہی کتنا عجیب ہے۔ ہاہا تو تو ریوڑ کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ ادھر لاؤ سونٹا۔

چرواہی نے ہنستے ہنستے مسافر سے سونٹا چھین لیا۔

مسافر کو سارو گاؤں بہت پسند آیا۔بس کوئی بیس پچیس گھر تھے۔ سپید مٹی و کھریا سے لپے ہوئے، ناشپاتیوں، کیلوں اور سیبوں کے درختوں سے گھرے ہوئے، سیب کے درختوں میں پھول آ گئے تھے۔ کچی ناشپاتیاں لٹک رہی تھیں اور کھیت مکئی کے پودوں سے ہرے مخمل بنے ہوئے تھے۔ کیلوں کے ایک بڑے جھنڈ کی آغوش میں گنگناتا ہوا نیلا جھرنا اور اس سے پرے چھوٹا سا میدان جس کے وسط میں منو کا قدآور درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا۔اس کا سایہ اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ پر یا اور نیچے بہتی ہوئی ندی کے کنارے تک پہنچ رہا تھا۔ ندی چھوٹی سی نازک پتلی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی شمال مشرق کے برفیلے پہاڑوں سے آ رہی تھی اور ڈوبتے ہوئے سائے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ نظر کے آخری نقطے پر وہ پہاڑوں کے پتلے

کناروں سے گزرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جہاں اب سورج چمک رہا تھا۔ اس کے پیچھے مسافر کا دیس تھا۔ وہ وہاں کب واپس جائے گا۔ کیا وہ کبھی واپس جا سکے گا؟ یہاں کتنا سکون ہے۔ آرام، زندگی، موت نے مل کر یہ خوشنما وادی بنا ڈالی ہے۔ یکا یک اس کی آنکھوں کے سامنے ریل گاڑی کے گھومتے ہوئے پہیے اچھلنے لگے۔ یہ کیسا شور ہے۔ یہ انسان موت سے بھی بڑھ کر خاموشی سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔ ہر وقت شور مچاتے ہیں۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں، کس لیے؟ یہاں کتنا سکون ہے۔ امن، حسن، راحت، نیچے پگڈنڈی پر ندی کے کنارے سے آنگی کسی بے فکر ہرنی کی طرح قدم رکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ کاندھے پر پتلی سی سونٹی تھی۔ لبوں پر ایک بے معنی سا گیت۔ پاؤں ننگے تھے لیکن چال پر ایک خاموش موسیقی کا شبہ ہوتا تھا۔ مسافر نے اپنے کتاب بند کر دی اور آنگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ کاش وہ مصور ہوتا، کتنی خوبصورت تصویر ہے، کتنا دلکش پس منظر ہے، آنگی کے سڈول مگر مضبوط بازو اس کی کمر کا متناسب خم۔ اچھا تو وہ سنگ تراش ہی ہوتا۔ دنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں ورنہ ایک مجسمہ تیار کرتا کہ یونانی صنم گر بھی ششدر رہ جاتے۔ اتنے میں آنگی نے اسے دیکھ لیا۔ عجیب بات ہے۔ وہ کیوں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے لبوں پر بے معنی گیت کیوں رک گیا ہے۔ وہ سونٹی سے زمین پر کیا لکھ رہی ہے۔ ان پڑھ آنگی۔

مسافر نے زور سے آواز دی۔ ''آنگی''

آنگی نے ضرور سن لیا ہے مگر اس نے جواب کیوں نہیں دیا۔ وہ اب اوپر چڑھ رہی ہے۔ گھاٹی کے پیچ در پیچ راستے سے گزرتی ہوئی ادھر آ رہی ہے۔ مگر اس کی چال مختلف ہے۔ بازو اب بے پروائی سے نہیں ہل رہے ہیں اور گردن ایک طرف کو جھک گئی ہے۔ اب ایک نئی تصویر ہے، نیا مجسمہ ہے۔ وہ جنگل کی دیوی تھی تو یہ دوشیزہ صحرا ہے۔ اس مجسمہ کی تراش نرالی ہے۔ اس تصویر کا رنگ نیا ہے۔ اس گیت کی لے انوکھی ہے۔ کاش وہ مغنی ہوتا۔

آنگی گھاٹی پر چڑھ آئی۔ وہ مسافر کے قریب بیٹھ گئی اور سونٹی کو سبز دوب پر رکھ کر ستانے لگی۔ مسافر اس کی زلف کی طرف دیکھنے لگا جو آنگی کے رخ پر اتر آئی تھی۔ یکا یک آنگی

بول اٹھی۔تم واپس کب جاؤ گے راہی۔ جب تم اپنا نام نہیں بتاتے تو پھر میں تمہیں یہی کہوں گی، ٹھیک ہے نا؟

مسافر نے کتاب کے ورق الٹتے ہوئے کہا ٹھیک ہے، اور پھر راہی کوئی اتنا برا نام بھی نہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ میں یہاں اپنی صحت بہتر بنانے آیا ہوں جب اچھا ہو جاؤں گا چلا جاؤں گا۔

آنگی نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔''کدھر جاؤ گے؟''

مسافر نے نہایت بے پروائی سے دہنا بازو اٹھا کر کہا۔''ادھر جاؤں گا''

''تم کہاں سے آئے ہو؟''

اس دفعہ مسافر نے دوسرا بازو پھیلا کر کہا''ادھر سے آیا ہوں''۔آنگی کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن ہو گئیں، رکتے رکتے کہنے لگی۔''راہی تم...... کتنے عجیب ہو''

اور راہی دل میں سوچنے لگا۔''کیا واقعی میں عجیب ہوں، کیا یہ منظر عجیب نہیں۔ یہ خواب سی خاموشی، یہ موت کی سی زندگی، یہ آنگی کے رخ پر بل کھاتی ہوئی زلف، کیا سب عجیب نہیں؟ آنگی کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے اور اس میں درجنوں پیوند لگے ہوئے ہیں۔مگر وہ کس شان سے گردن اونچی کیے ہوئے ندی کی طرف دیکھ رہی ہے جس کے پانی کا رنگ اس کی آنکھوں کی طرح ہی نیلا ہے۔کیا یہ عجیب بات نہیں۔آنگی کے ہاتھ کتنے مضبوط نظر آتے ہیں۔ لمبی مخروطی انگلیاں جو ہل کی ہتھی پر زور سے جم جاتی ہوں گی۔ان کلائیوں نے غالباً کبھی چوڑی کی کھنک نہیں سنی۔کس قدر عجیب بات ہے مگر خود میرے ہاتھوں میں انسانیت کی جھلک نمایاں ہے اور ایک چاقو سے اپنا قلم درست کرنے میں مجھے اتنا وقت صرف کرنا پڑتا ہے جتنا آنگی کو آدھے کھیت میں ہل چلانے کیلئے۔

کئی دنوں کے وقفے کے بعد آنگی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا آنگی تمہیں اتنے دنوں سے دیکھا نہیں۔

آنگی نے جواب دیا۔ عجیب بات ہے میں سمجھتی ہوں کہ تم......اتنے دنوں غائب

رہے۔ اب بہت دن ہوئے تم نے اپنی تاروں والی بنسی (وائلن) نہیں سنائی۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ ہم سب منو کے نیچے بیٹھے ہوئے فیروزے سے الغوزہ سن رہے تھے۔ تمہیں پتہ ہے نہ وہ الغوزہ بہت اچھا بجاتا ہے۔ کرن کہنے لگی پتہ نہیں کیوں آج کل راہی دکھائی نہیں دیتا۔ اس سے اس کی تاروں والی بنسی بجانے کو کہتے۔ کیوں؟ اتنا کہہ کر آنگی نے مسافر کی طرف دیکھا۔

مسافر کی انگلیاں بے چین ہوگئیں۔ اس نے اپنا ہاتھ آنگی کے اتنا قریب رکھ دیا کہ اس کی انگلیاں دوسرے کو چھو رہی تھیں، آہستہ آہستہ بولا ''ہاں درست ہے، میں آج کل لمبی لمبی سیریں کرنے گاؤں سے بہت دور نکل جاتا ہوں، کبھی کبھی ان صنوبر کے گھنے جنگل میں نکل جاتا ہوں۔

تمہارا اکیلے جی کیسے لگتا ہے؟

اکیلا تو نہیں ہوتا۔ کبھی کوئی کتاب لے جاتا ہوں، کبھی کچھ لکھتا ہوں، کبھی اپنی تاروں والی بنسی بجاتا ہوں۔ آنگی نے حیرانی سے مسافر کی طرف دیکھا۔ ''راہی تم کتنے عجیب ہو''۔ اس کی سانس میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔

برسات کے آخری دنوں میں مکئی کی فصل پک گئی۔ سارو گاؤں والوں نے منو کے درخت کے آس پاس بڑے بڑے کھلیان لگائے ہیں۔ مکئی کے کھلیان اور پیلی پیلی گھاس کے ذخیرے منو کے قریب تین چار جگہوں پر پتلی سی چھوٹی خودرو گھاس کو چھیل کر گول گول قطعے تیار کئے۔ انہیں گوبر سے لیپ کیا۔ پھر ان پر کھریا مٹی پھیر دی۔ اب ان میں مکئی کے بھٹوں کا انبار جمع کئے اور ان پر بیلوں کو چکر دے دے کر چلایا تا کہ دانے بھٹوں سے الگ ہو جائیں کچھ بھٹے تو اس طرح سے صاف ہوگئے مگر بہت سے بھٹے سخت جان نکلے اور بیلوں کے پاؤں روندے جا کر بھی انہوں نے مکئی کے دانوں کو اپنے جسم سے الگ نہ کیا۔ پھر سارو گاؤں والی کی ٹولیاں بنیں۔ لوگ چاندنی راتوں کو اکٹھے ہو کر قطعوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور بھٹوں سے دانے الگ کر رہے ہیں۔ نیچے بہتی ہوئی ندی کا دھیما سا شور ہے۔ منو کی شاخوں میں چاند اٹک گیا ہے اور

اس اداس نغمے کو سن رہا ہے جو نوجوان کسان، ان کی مائیں، بہنیں اور بیویاں گا رہی ہیں۔ پھر وہ یکا یک چپ ہو جاتے ہیں۔ خاموشی سے مکئی کے دانوں کو الگ کر رہے ہیں۔ ہوا کے نہایت ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے ہیں اور منو کا سارا درخت سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی آگ تاپتا ہوا بوڑھا کسان آہستہ سے کہہ اٹھتا ہے گاؤ بیٹو اور گاؤ۔ پھر وہ خود ہی کوئی پرانا گیت شروع کر دیتا ہے۔ اسے اپنی ختم ہوتی زندگی کی یاد آ رہی ہے۔ زرد زرد شعلوں کی چمک اس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں لرز لرز جاتی ہے۔ گاتے گاتے گیت کے الفاظ اس کے منہ میں لڑکھڑا جاتے ہیں۔ وہ چپ ہو جاتا ہے اور آگ کے دہکتے ہوئے کوئلوں پر مکئی بھٹا بھون رہا ہے۔ نوجوان چرواہیاں آپس میں سرگوشیاں کرتی ہوئی یکا یک ہنس پڑی ہیں۔ نوجوان گڈریے انہیں کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ پھر کوئی ہجر کا نغمہ گونج جاتا ہے۔ نوجوان چرواہوں کی پتلی پتلی آوازیں بھی ان میں شامل ہو جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے معبد میں بیٹھے ہوئے اپنے معبود کی حمد و ثنا کر رہے ہیں۔ یہ مکئی کے دانے تسبیح کے بے شمار دانے ہیں۔ وہ بوڑھا کسان ایک بوڑھا پجاری ہے۔ اس کی آگ میں عنبر اور لوبان جل رہا ہے جس کا دھواں اٹھ کر سارے معبد کو معطر کر رہا ہے۔ یہ نیک نفیس روحیں ہیں۔ یہاں ابدی سکون اور قدرت کا رحم۔

سارو گاؤں والے مسافر کو ایک عزیز مہمان بلکہ اپنا بھائی سمجھتے اور اسے اپنی خوشیوں میں شریک کرتے۔ بھولے بھالے کسان، الہڑ چرواہیاں ننھے ننھے بچے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مسافر اپنی تاروں والی بنسی سناؤ۔ آنگی اس کے شانے پر اپنی باہیں ٹیک دیتی اور دوسری بانہہ سے اس کی انگلیوں میں مضراب کو پکڑ کر کہتی، لو بجاؤ راہی اپنی تاروں والی بنسی بجاؤ یا پھر کھلیانوں کے لمبے لمبے سایوں میں کوئی اس سے کسی کہانی کی فرمائش کرتا۔ اس دنیا کی کہانی جہاں لمبے لمبے میدان ہیں، بڑے بڑے دریا ہیں، میلوں تک پھیلے ہوئے شہر ہیں۔ جہاں رہنے کو تاروں پر لکڑی کے مکان قطار بنائے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں۔ کہیں سے کوئی ایک بٹن دبا دیتا ہے۔ لاکھوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ آسمان پر اڑن کھٹولے گھوم رہے ہیں اور

نیچے بازاروں میں پریاں محوخرام ہیں۔ جن کے لباس تیتریوں کے پر سے بنائے گئے ہیں۔

اس طرح...... کھلیانوں میں کئی چاندنی راتیں گزر گئیں۔ ایک رات مسافر نے پہلے قطعے میں فیروز کا الغوزہ سنتے ہوئے محسوس کیا کہ آنگی وہاں نہیں ہے۔ دوسرے قطعے میں مکئی کے دانوں کو بھٹوں سے الگ کرتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر آنگی کہیں نظر نہ آئی۔ تیسرے قطعے میں مسافر نے ایک دلکش کہانی سنائی جو شہروں کی زندگی کے متعلق تھی۔ اس کی نگاہیں، آنگی کو تلاش کرتی رہیں مگر بے سود۔ چوتھے قطعے میں اس نے اپنے وائلن کو نکالا اور ایک دلسوز نغمہ چھیڑا، باقی قطعوں سے اٹھ کر سارو گاؤں والے چوتھے قطعے میں آ کر جمع ہوئے اور مسافر کی بنسری سننے لگے۔ ان کے چہروں پر خوشی بھی تھی اور حیرت بھی مگر آج آنگی کہاں تھی؟

آخر مسافر نے پوچھ ہی لیا۔

ایک نوجوان کسان نے بے پروائی سے کہا۔ وہ کھلیان کے اس طرف بیٹھی ہے۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا اپنی ہمجولیوں میں بیٹھی گا رہی تھی کہ فیروزی بہن نے نہ جانے اس سے کیا کہا۔ کیوں دلشاد تم نے اس سے کیا کہا کہ وہ اٹھ کر چلی گئی اور جھولی میں بہت سے بھٹے بھر کر لے گئی۔ اب اکیلی بیٹھی دانے الگ کر رہی ہے۔ کون منا تا پھرے۔ کرن تو کیوں نہیں جا کر منا لاتی اسے۔

کرن ہنس پڑی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کھلیان کی دوسری طرف مسافر نے دیکھا کہ چند مکئی کے بھٹے زمین پر پڑے ہیں اور ان کے قریب کھلیان کا سہارا لیے ہوئے آنگی نیم دراز حالت میں پڑی ہے۔ آنکھیں نیم وا ہیں اور چاند کی کرنوں نے اس کے سر کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا ہے۔

آنگی! آنگی! آنگی!

مسافر آنگی پر جھک گیا۔ اس نے آنگی کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ کیا بات ہے آنگی؟ آنگی اٹھ بیٹھی۔

اس نے آہستہ سے اپنے آپ کو مسافر کے بازوؤں سے علیحدہ کر لیا اور مکئی کے دانے

الگ کرنے لگی۔

آخر اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ آہ مسافر مجھے یہاں سے لے چلو۔ اور یہ کہہ کر اس نے سر جھکا لیا اور چپ چاپ رونے لگی۔

مسافر خاموشی سے مکئی کے دانے الگ کرتا رہا۔ اس نے آنگی کے آنسو نہیں پونچھے، اس نے اسے پیار نہیں کیا، یکا یک پرندہ اپنے سیاہ پنکھ پھیلائے ہوئے سامنے سے نکل گیا۔ کھلیان کے اوپر دو تین ستارے چمک رہے تھے، آنگی کے آنسوؤں کی طرح۔ اور کھلیان کے دوسری جانب عورتیں نئی دلہن کی سسرال کی روانگی کے گیت گا رہی تھیں۔ مسافر کی نگاہیں پہاڑوں سے پرے صنوبر کے جنگلوں کو چیرتی ہوئی وسیع میدانوں کو ڈھونڈنے لگیں، جہاں اس کا دیس تھا۔ اس کی نگاہوں میں ریل گاڑی کے پہیے اچھلنے لگے۔

مسافر شکر بجالاتا ہے کہ وہ اپنی دنیا میں واپس آ گیا ہے۔

◆◆◆

شہزادہ

سدھا خوبصورت تھی نہ بدصورت، بس معمولی سی لڑکی تھی۔ سانولی رنگت، صاف ستھرے ہاتھ پاؤں، مزاج کی ٹھنڈی، مگر گھریلو، کھانا پکانے میں ہوشیار، سینے پرونے میں طاق، پڑھنے لکھنے کی شوقین، مگر نہ خوبصورت تھی نہ امیر، نہ چنچل، دل کو لبھانے والی کوئی بات اس میں نہ تھی۔ بس وہ ایک تو بے حد شرمیلی سی اور خاموش طبیعت والی لڑکی تھی...... بچپن ہی سے اکیلی کھیلا کرتی تھی۔ مٹی کی گڑیا، بناتی اور اس سے باتیں کرتی۔ انہیں تنکوں کی رسوئی میں بٹھا دیتی اور خود اپنے ہاتھ سے کھیلا کرتی۔ جب کوئی دوسری لڑکی اس کے قریب آتی تو گڑیوں سے باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتی۔ جب کوئی شریر بچہ اس کا گھروندا بگاڑ دیتا تو خاموشی سے رونے لگ جاتی۔ رو کر خود ہی چپ جاتی اور تھوڑی دیر کے بعد دوسرا گھروندا بنانے لگتی۔

کالج میں بھی اس کی سہیلیاں اور دوست بہت کم تھے۔ وہ شرمیلی طبیعت ابھی تک اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ جیسے اس کے ماں باپ کی غریبی نے بڑھاوا دے دیا ہو۔ اس کا باپ جیون رام ناتھ مل واچ مرچنٹ کے یہاں چاندنی چوک کی دوکان پر تیس سال سے سیلز مین چلا آرہا تھا۔ اس کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو کالج کی تعلیم دے سکے۔ اس پر بھی جو اس نے اپنی بیٹی کو کالج میں بھیجا تھا، محض اسی خیال سے کہ شاید اس طریقے سے اس لڑکی کو کوئی اچھا خاوند مل جائے گا۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خیال بھی آتا تھا، ممکن ہے کالج کا کوئی اچھا لڑکا

ہی اس پر عاشق ہو جائے۔ مگر جب وہ سدھا کی صورت دیکھتا، جھکی ہوئی گردن، سکڑا ہوا سینہ، خاموش نگاہیں...... اوراس کی کم گوئی کا اندازہ کرتا تو ایک آہ بھر کر رہ جاتا اور اپنا حقہ گڑ گڑانے لگتا۔

''سدھا کیلئے کوئی بر گھیر گھار کر ہی لانا ہوگا'' مگر مصیبت یہ ہے کہ اس طرح بڑا بڑا جہیز مانگتے تھے اوراس کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ بڑا تو کیا چھوٹا سا بھی جہیز دے سکے۔ ذہن کے بہاؤ میں بہتے بہتے اس نے یہ بھی سوچا کہ آج کل محبت کی شادی بڑی سستی رہتی ہے۔ اب مالک رام کی بیٹی گوپی ہی کو دیکھا، باپ ہیلتھ منسٹری میں تیسرے درجے کا کلرک ہے۔ مگر بیٹی نے ایک لکھ پتی ٹھیکیدار سے شادی کر لی ہے۔ جو اس کیساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ باپ کوارٹروں میں رہتا ہے۔ مگر لڑکی ایئر کنڈیشنڈ موٹر کار میں بیٹھ کر اپنے میکے والوں سے ملنے آتی ہے۔ ہاں مگر گوپی تو بہت خوبصورت ہے اور ہماری سدھا تو بس ایسی ہے جیسے اس کی ماں......

''اس کیلئے تو کسی بر کو گھیرنا ہی پڑے گا۔ جس طرح سدھا کی ماں اوراس کے رشتہ داروں نے مجھے گھیرا تھا''۔

دو تین جگہ سدھا کی ماں نے بات چلائی۔ مگر بات آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر ایک بار تو اس نے بندا اتنا مضبوط باندھا کہ لڑکا خود چل کر سدھا کو دیکھنے آ گیا۔ مگر سدھا اسے پسند نہ آئی۔ لڑکا خود بھی کون سا اچھا تھا؟ موا چیچک کا مارا، ٹھگنا سا، اس پر ہکلاتا تھا، جامن سا رنگ، مگر لڑکی گوری چاہتا تھا اور جہیز میں اسکوٹر مانگتا تھا۔ یہاں سدھا کا باپ ایک سائیکل تک نہ دے سکتا تھا۔ اس لیے معاملہ آگے چلتا بھی تو کیسے چلتا؟

مگر یہ سدھا کے باپ کو معلوم نہ تھا کہ اس بدصورت ٹھگنے کے انکار پر خود سدھا کتنی خوش ہوئی تھی؟ وہ اوراس کے بعد بھی دو برسوں میں جو دو لڑکے اسے دیکھنے آئے وہ انکار کر کے چلے گئے۔ ان سب کی سدھا کس قدر دل ہی دل میں شکر گزار تھی۔ وہ اوپر سے جتنی ٹھنڈی تھی، اندر سے اتنی ہی لاوا تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سدھا کے تخیل کی اڑان کتنی اونچی اور وسیع ہے۔ اپنی تنگ و تاریک سی دنیا سے باہر نکل کر اس کی کلپنا کیسی کیسی سندر جگہوں پر اسے لے جاتی

تھی؟ اس بات کو تو اس کا باپ جیون رام جانتا تھا نہ اس کی ماں مگھی جانتی تھی کہ سدھا کتنی عجیب لڑکی ہے۔ وہ باہر سے معمولی رنگ روپ کی لڑکی تھی، مگر اس نے اپنے دل کے اندر ایک چمکتی ہوئی زندگی چھپا رکھی تھی۔ جس طرح لعل گدڑی میں چھپا رہتا ہے۔ اور یہ تو ہماری روایت ہے کیونکہ ایک میلے کچیلے بنئے کو دیکھ کر کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس آدمی کے پاس اتنا سونا ہوگا۔ اسی لئے تو وہ شرمیلی تھی وہ اپنا بھید کسی کو کیوں بتائے؟ شاید لوگ اس پر ہنسیں گے اور جو کچھ وہ سوچتی تھی وہ سب کتنا عجیب ہوتا تھا، یہ کالج کی سندر سجیلی لڑکیاں اگر اس کے حسن کی موہنی دیکھ لیں تو دھک سے رہ جائیں اور یہ لمبی لمبی کاروں والے دیوتاؤں کی طرح اٹھلاتے ہوئے نوجوان اگر اس کے دل کے راکٹ جہاز دیکھ لیں تو کیا حیرت میں نہ کھو جائیں؟......وہ میری طرف دیکھتے بھی نہیں اور ٹھیک بھی ہے......گھر کی دھلی ہوئی شلوار اور سلوٹوں والی سیاہ قمیض پہننے والی ایسی لڑکی وہ بھلا کیوں دیکھیں گے......تو......میں بھی انہیں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں؟

''تو نے کیسی لڑکی جنی ہے؟'' جیون رام کبھی کبھی مگھی کو ستانے لگتا'' ہر وقت چپ رہتی ہے۔ ہر وقت نیچی نگاہ رکھتی ہے۔ ہر وقت کام میں جٹی رہتی ہے۔ اس کے منہ پر کبھی ہنسی نہیں دیکھی۔ اب کپور صاحب کی لڑکیوں کو دیکھو، ہر وقت پھولوں کی طرح مہکتی ہیں۔ ہر وقت گھر کو گلزار بنائے رکھتی ہیں اور ایک یہ سدھا......'' جیون رام اخبار پٹک کر چپ ہو جاتا۔

مگھی بارہ آنے سیر والا بھات اور چنے کی پتلی دال اس کے سامنے رکھتی ہوئی کہتی۔

''ان بچیوں کی بات مت کرو۔ ان بچیوں کا باپ سپرنٹنڈنٹ ہے۔ چار سو روپے گھر لاتا ہے۔ میری بچی کے پاس صرف دو قمیضیں ہیں اور کپور صاحب کی لڑکیاں دن میں دو دو سوٹ بدلتی ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچا تم نے......؟''

جیون رام دانت پیس کر چپ ہو جاتا۔ اس کے دل میں بہت سے سوالات ابھرتے، یہ چاول اتنے موٹے کیوں ہیں؟...... یہ دال اتنی پتلی کیوں ہے؟ اس کی بیوی ہر وقت نیچی گھسٹی سی کیوں نظر آتی ہے؟......اس کی بچی ہر وقت چپ کیوں رہتی ہے؟......لوگ

جہیز میں اسکوٹر کیوں مانگتے ہیں......؟ بہت سے سوال پتلی دال کے دل چنوں کی طرح اس کے دماغ میں پھد کنے لگتے......مگر جب ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملے تو انہیں پتلی دال کی طرح پی جانا چاہیے۔

ایف، اے پاس کرا کے جیون رام نے سدھا کو کالج سے اٹھالیا، میں افورڈ نہیں کر سکتا، اس نے اپنے ساتھی طوطا رام سے کہا۔ جو سیوا مل وول کلاتھ مرچنٹ کے یہاں نوکر تھا۔ وہ بڑی آسانی سے یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ کالج میں پڑھانے کی میری حیثیت نہیں۔ مگر حیثیت کا لفظ کتنا صاف اور کھلا ہے، جیسے کسی نے سات جوتے مار دیئے ہوں اور ''افورڈ'' میں کتنی گنجائش ہے۔ ویسے اپنی زبان میں کبھی کبھی بدیسی اور اجنبی الفاظ بھی استعمال کر لینے میں کتنی پردہ پوشی ہو جاتی ہے۔ جیسے گھر میں کوئی اجنبی آ جائے تو گھر کے لڑائی جھگڑے پر اسی وقت پردہ پڑ جاتا ہے......'' تمہاری بیلا تو ابھی کالج میں پڑھتی ہے نا؟''

اس نے طوطا رام سے پوچھا۔

''ہاں'' طوطا رام من کی خوشی سے چہکتا ہوا بولا ''اگلی سردیوں میں اس کی شادی ہونے والی ہے''۔

''لڑکا ڈھونڈ لیا؟'' جیون رام نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ہاں'' طوطا رام کوئل کی طرح کوکتے ہوئے بولا۔ ''اس نے خود ہی اپنا بر پسند کر لیا، کالج میں، لڑکا بڑا امیر ہے''۔

جب طوطا رام چلا گیا تو جیون رام نے برا سا منہ بنایا اور طوطا رام کی پتلی آواز کی نقل کرتے ہوئے بولا ''اس نے خود ہی اپنا بر پسند کر لیا؟'' پھر وہ زور سے فرش پر تھوکتے ہوئے بولا ''حرام زادہ......''

دو سال گزر گئے۔ سدھا آصف علی روڈ کی ایک فرم میں ٹائپسٹ تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ خاموش، باوقار اور محنتی ہو گئی تھی۔ گھر کی حالت بھی اچھی ہو گئی کیونکہ سدھا گھر میں سو روپے لاتی تھی۔ دفتر کے کام سے فارغ ہو کر وہ اسٹینو کا کام سیکھنے جاتی تھی۔ بی اے کرنے کا

ارادہ بھی رکھتی تھی۔

گھر کی حالت ذرا بہتر ہونے پر جیون رام اور مکھی نے سدھا کیلئے زیادہ اعتماد سے کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ سدھا کی تنخواہ میں بہت کم خرچ کرتے تھے اور اسکوٹر کیلئے پیسے جمع کر رہے تھے۔

بہت دنوں بعد جیون رام ایک لڑکے کے والدین کو اسکوٹر کا لالچ دے کر گھیرنے میں کامیاب ہوا۔ منگنی کی رسم، بیاہ کا جہیز اور جہیز کی نقدی، جہیز کا سونا، ساری ہی ضروری باتیں طے ہو گئیں تو موتی جو لڑکے کا نام تھا اور واقعی شکل وصورت سے موتی کی طرح اجلا اور خوبصورت تھا۔ اپنے ہونے والی بیوی کو دیکھنے آیا۔

موتی نے گہرے براؤن رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی سنہری رنگت پر اس کے سیاہ گھنگھریالے بال بے حد خوبصورت لگتے تھے۔ اور جب وہ سجی سجائی سدھا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو اندر ہی اندر اس معصوم لڑکی دل پگھل گیا اور چائے کی پیالی اس کے ہاتھوں میں بجنے لگ اور بڑی مشکل سے وہ چائے کی پیالی موتی کو پیش کر سکی۔

موتی چائے پی کر شکریہ ادا کر کے بڑی سعادت مندی سے رخصت ہو گیا۔ اپنی بہنوں کے ساتھ۔ دوسرے دن اس کی بہنوں نے کہلا بھیجا ''لڑکی پسند نہیں''۔ اس رات سدھا سو نہ سکی۔ رات بھر اس کی آنکھوں میں موتی کا خوبصورت چہرہ اور اس کا باوقار جسم ڈولتا رہا تھا اور رات بھر موتی کے ہاتھوں کا خفیف سا لمس اس کی روح کو گدگداتا رہا۔

''لڑکی پسند نہیں۔ اونہہ''، مکھی غصے سے ساگ کو کڑھائی میں بھونتے ہوئے بولی۔ ''اور خود بڑا یوسف ہے۔ اپنی رنگت پر بڑا اتراتا ہے۔ مگر اپنی پکوڑا ایسی ناک نہیں دیکھتا؟ اور حبشیوں ایسے گھنگھریالے بال نہیں دیکھتا۔ اپنی بہنوں کو نہیں دیکھتا؟ ایک تو بھینگی، صفا بھینگی، دوسری سرخی پوڈر کی ماری، صورت سے چوہیا لگتی تھی۔ تیسری کے بال دیکھے تھے تم نے؟ جیسے بنیئے کی بوری کے پھوسڑے!'' ''اونہہ لڑکی پسند نہیں'' ...... یہ کہہ کر اس نے اتنے زور سے کڑھائی میں کرچھی چلائی، جیسے وہ ساگ کے بجائے اس لڑکے کو بھون رہی ہو۔

سدھا نے محسوس کیا کہ اس کے گھر والوں بلکہ گھر سے باہر محلے والوں اور شاید دفتر والوں کا بھی خیال یہ تھا کہ سدھا کچھ محسوس نہیں کرتی۔ بلکہ دفتر کے کام کیلئے نہایت مناسب لڑکی ہے۔ نہ کسی سے عشق کرے نہ کسی کو عشق کی ترغیب دے۔ دن بہ دن اس کی آنکھیں میلی، ہونٹ سکڑے ہوئے اور چہرے دھواں دھواں ہوتا جارہا تھا۔ اس کی صورت ایسی ٹھنڈی اور ٹھس نکل آئی تھی کہ اسے دیکھ کر برف خانے کا امکان ہونے لگا تھا۔ کلرک آپس میں چہ مگوئیاں کرتے ہوئے کہتے۔ ''جو آدمی سدھا سے شادی کرے گا اسے پہاڑ پر جانے کی ضرورت نہ ہو گی''۔

اس لیے موتی کے انکار کے بعد سدھا کے دل پر کیا بیتی یہ تو کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ پہلی بار زندگی میں کسی کو دل دیا تھا اور یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ ہوتا بھی کیسے؟ اور کہتی بھی کیا کسی سے ؟ کہ جسے میں نے چاہا وہ مجھے دیکھنے آیا تھا اور ناپسند کر کے چلا گیا۔ لوگ تو عشق میں روتے ہیں وہ بے چاری کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی۔

اس دن اس نے دفتر میں اوور ٹائم کیا اور جب اندھیرا خاصا بڑھ گیا تو وہ دفتر سے باہر نکلی اور اپنا بھورے رنگ کا پرس جھلاتی ہوئی سامنے کے آصف علی پارک میں چلی گئی اور ایک بینچ پر تنہا بیٹھ گئی۔ یہ پارک دہلی گیٹ کے سامنے ایک چھوٹا سا خاموش گوشہ تھا۔ چند پیڑ تھے چند بنچیں تھیں، چند قطعے تھے گھاس کے...... ان کے چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا۔ مگر آج نسبتاً خاموشی تھی۔ سدھا ہر روز آتی تھی اور آدھ پون گھنٹہ اکیلے بیٹھ کر تازہ دم ہوتی تھی۔ تھوڑی عرصے کیلئے اپنے خیالوں کی لہروں پر دور تک تیرتی ہوئی نکل جاتی...... اسے تنہائی سے ڈر نہ لگتا تھا۔ تنہائی اس کا واحد سہارا تھی۔ اندھیرے سے اسے ڈر نہ لگتا تھا بلکہ اندھیرا اس کا دوست تھا۔ غنڈوں سے اسے ڈر نہ لگتا تھا، جانے اس کی شخصیت میں کون سی ایسی بات تھی کہ غنڈے بھی اسے دور ہی سے سونگھ کر چل دیتے تھے، کترا کر نکل جاتے تھے۔

آج اندھیرا گہرا تھا اور پیڑ کے نیچے گہری خاموشی، پتھر کا بنچ بھی خوب ٹھنڈا تھا، چند منٹ تک خاموشی سے اس بنچ پر بیٹھی رہی۔ مگر جب اس کی تکان نہ گئی تو وہ اٹھ کر پیڑ کے نیچے

چلی گئی اور تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

یکا یک کسی نے اس سے کہا ''تم یہاں بیٹھی ہو؟ اکیلی؟''

سدھا نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے موتی مسکرا رہا تھا۔ وہی خوبصورت براؤن سوٹ پہنے، وہی سپید دانتوں والی جگمگاتی مسکراہٹ لئے...... اس کے ہاتھ اتنے خوبصورت تھے...... سدھا کے حلق میں کوئی چیز آ کے رکنے لگی۔ وہ بول نہ سکی۔

موتی اس کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ اتنا قریب کہ اس کی پتلون اس کی ساری سے مس ہو رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمہیں میرے انکار پر غصہ آ رہا ہے نا؟''

سدھا نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بہت برا لگ رہا ہے نا؟''

سدھا نے ہاں کے انداز میں آہستہ سے سر ہلا دیا۔ اور آنسو چھلک کر اس کے گال پر آ گئے اور وہ رونے لگی......

موتی نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے رومال نکالا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ ہر انسان کو اپنی پسند یا ناپسند کا حق ہے۔ بتاؤ حق ہے کہ نہیں؟''

''مگر تم نے کیا دیکھا تھا میرا؟ جو تم نے ناپسند کر دیا۔ کیا تم نے میرے ہاتھ کا پھلکا کھایا تھا؟ میرا مٹر پلاؤ چکھا تھا؟ کیا تم نے میرے دل کا درد دیکھا تھا؟ اور وہ بچہ جو تمہیں دیکھتے ہی میر کوکھ میں ہمک کر آ گیا تھا......؟ تم نے میرے چہرے کا صرف سپاٹ پن دیکھا۔ میرے بچے کا حسن کیوں نہیں دیکھا...... تم نے وہ ہاتھ کیوں نہیں دیکھے جو زندگی بھر تمہارے پاؤں دھوتے اور بٹن جو تمہاری قمیض پر کاڑھنے والی تھی، تم میرے جسم کی رنگت سے ڈر گئے۔ تم نے اس سوئیٹر کا اجلا رنگ نہ دیکھا جو میں تمہارے لئے بننا چاہتی تھی۔ موتی تم نے میری ہنسی نہیں

سنی ۔ میرے آنسو نہیں دیکھے، میری انگلیوں کے لمس کو اپنے خوبصورت بالوں میں محسوس نہیں کیا۔ میرے کنوارے جسم کو اپنے ہاتھوں میں لرزتے ہوئے نہیں دیکھا تو پھر تم نے کس طرح مجھے ناپسند کر دیا تھا؟''

ارے......اتنی لمبی تقریر وہ کیسے کر گئی؟ اتنا سب کچھ وہ کیسے کہہ گئی؟ بس اسے اتنا معلوم تھا کہ وہ رو رہی ہے اور کہتی جا رہی تھی اور اس کا سر موتی کے کندھے پر تھا اور موتی اپنی غلطی پر نادم اس کے شانوں کو ہولے ہولے تھپک رہا تھا۔

اس دن وہ بہت دیر سے گھر پہنچی اور جب اس کی ماں نے اس سے پوچھا تو اس نے کمال لاپروائی سے کہہ دیا۔ ''دفتر میں دیر ہو گئی''۔ پھر پرس کو زور سے جھلا کر پلنگ پر پھینک دیا اور اس اعتماد سے کھانا مانگنے لگی کہ اس کی ماں چونک گئی۔ اس کا باپ چونک گیا۔ آج سدھا کی روئی ہوئی آنکھوں کی تہہ میں خوشی کی ہلکی سی لکیر تھی، جیسے گہرے بادلوں میں کبھی کبھی بجلی کوند جاتی ہے۔

مکھی اپنے ہونٹ چبا کر چالاک نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا، جیسے اس نے اپنی بیٹی کا راز بھانپ لیا ہو......جیون رام نے بھی ایک پل کیلئے مسرور نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، پھر اپنی تھالی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ضرور کوئی بات ہے......اور سدھا چونکہ عورت ہے، اس لیے اس بات کی تہہ میں ضرور کوئی مرد ہے۔ ایسا دونوں میاں بیوی نے اسی لمحہ سوچ لیا۔ آٹھ دس روز کے بعد اس شبہ کو اور تقویت پہنچی، جب ایک لڑکا اپنی ماں کے ساتھ سدھا کو دیکھنے کیلئے آیا، اس لڑکے کی ماں مکھی کی بچپن کی سہیلی تھی۔ اور کیسے کیسے جتن سے اور کس کس طرح کے واسطے دے کر مکھی نے اسے شیشے میں اتارا تھا۔ یہ صرف مکھی ہی جانتی تھی۔ اس لیے جب اس موقع پر لڑکے کی بجائے سدھا نے شادی سے انکار کر دیا تھا تو پہلے مکھی اچنبھے میں رہ گئی۔ پھر اس کے دل میں شبہ اور تقویت پکڑتا چلا گیا......ضرور کوئی ہے......

وہ چپکے چپکے اپنی بیٹی کیلئے جہیز کا سامان تیار کرنے لگی اور جیون رام حقہ پیتے پیتے اس

دن کا انتظار کرنے لگا جب سدھا چپکے سے آ کر مکھی سے بات کہہ دے گی اور بڈھا جیون رام پہلے تو لال پیلی آنکھیں نکال کر سدھا کو گھورے گا۔ ''تیری یہ ہمت! کہ تو نے ہم سے بالا بالا ہی اپنے لیے پسند کرلیا؟ نکال دوں گا گھر سے اور چٹیا کاٹ کر پھینک دوں گا ہمارے خاندان کی ناک کٹانے والی...... پھر وہ مکھی کے سمجھانے بجھانے پر خود ہی نرم پڑ جائے گا۔ اور آخر میں حقہ گڑگڑاتے ہوئے پوچھے گا۔ ''مگر کون ہے وہ......؟''

اور اب کوئی بھی ہو، وہ سدھا کے بتاتے ہی جلد سے جلد اس کے ہاتھ پیلے کر دے گا۔ پچیس برس کی جوان لڑکی کو گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔

مگر دن گزرتے گئے۔ سال گزرتے گئے، مگر سدھا نے کچھ نہ بتایا۔ اس کی ماں انتظار کرتی رہی، مگر وہ جنم جلی کبھی منہ سے نہ پھوٹی۔ تھک ہار کے اس کے ماں باپ نے پھر دو تین بر ڈھونڈے۔ مگر سدھا نے صاف انکار کر دیا۔ آخری بر، جو اس کے باپ نے ڈھونڈا، وہ ایک رنڈوے حلوائی کا تھا۔ جس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔

اس روز شفق کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں گلابی انگلیوں والی مہکتی ہوئی شام میں سدھا نے موتی کو بتایا۔ ''وہ لوگ آج میرے لئے ایک بڈھا حلوائی ڈھونڈ کے لائے تھے''۔

''پھر؟'' موتی نے ہنس کر پوچھا۔

''میں نے صاف انکار کر دیا''۔

''تو انکار کیوں کر دیا پگلی۔ شادی کر لیتی، تو زندگی بھر آرام سے بیٹھی مٹھائی کھاتی''۔

''اور تمھیں چھوڑ دیتی'' سدھا نے پیار بھرے غصے سے موتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں نے تم سے شادی نہیں کی؟'' موتی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا؟'' سدھا اس کے گال کو اپنے گال سے سہلاتی ہوئی بولی ''تم میرے پاس تو ہو، شادی سے بھی زیادہ میرے پاس...... ہر وقت میری مٹھی میں گویا......''

موتی ہنس کر بولا۔ ''ہاں یہ تو صحیح ہے، میں بالکل تمہاری مٹھی میں ہوں، جب چاہو بلا لو۔

''شروع میں تو تم ایسے نہ تھے''، سدھا، موتی کی طرف چنچل نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔شروع میں تو تم بڑی مشکل سے میرے پاس آیا کرتے تھے''......

''شروع میں ایسا پیار بھی تو نہ تھا۔اور کسی کے دل کو بھی سمجھتے ہوئے دیر لگتی ہے......''

موتی نے سدھا کے کانوں میں سرگوشی کی اور سدھا کی آنکھیں شدتِ احساس سے بند ہونے لگیں اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے موتی کی تیز تیز سانسوں کی آنچ اپنے چہرے پر محسوس کی اور اپنی گردن اور رخساروں پر اس کے بوسے برستے محسوس کئے......''

''کل کہاں ملو گے؟''

''جہاں تم کہو......لورز لین میں؟''

''اونہوں!''

''کوٹلے میں گھوڑوں کی نمائش ہو رہی ہے''

''میں کیا گھوڑے خرید کر پالوں گی؟'' سدھا ہنسی

''اولڈ ہال میں ادیبوں کی نمائش ہے''۔

''نا بابا'' سدھا نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

موتی خاموش ہو گیا۔

پھر سدھا خود ہی بولی ''کل پکچر دیکھیں گے، بسنت سینما میں بہت اچھی لگی ہے، میں دو ٹکٹ خرید رکھوں گی، تم ٹھیک پونے چھ بجے وہاں پہنچ جانا۔

''ٹکٹ میں خرید لوں گا''

''نہیں پکچر میں دکھاؤں گی، تم کوئی دوسری دکھا دینا۔ میں کب منع کرتی ہوں......مگر بھولنا نہیں، کل شام پونے چھ بجے، بسنت سینما کے باہر''۔

بسنت سینما میں بہت بھیڑ تھی۔ سدھا نے دو ٹکٹ خرید لئے تھے اور اب وہ موتی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے احتیاطاً آدھ پاؤ چلغوزے اور ایک چھٹانک کشمش بھی لے لی سنیما دیکھتے دیکھتے کھانے کا اسے ہوکا سا تھا۔

پونے چھ ہو گئے، چھ ہو گئے، پچھلے شو کے چھوٹنے کے بعد لوگ چلے گئے، نئے لوگ شو دیکھنے آنے لگے۔ موتی نہیں آیا۔ چاروں طرف روشنیاں تھیں، لوگوں کی بھیڑ تھی، خوانچے والوں کی آوازیں تھیں۔ تانگے، موٹروں اور رکشاؤں کا ہجوم تھا اور موتی ہجوم کو پسند نہیں کرتا تھا۔ شور کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور اب وہ اس کی طبیعت سمجھ گئی تھی، اسے خاموشی پسند تھی۔ اندھیرا پسند تھا، تنہائی پسند تھی......موتی بے حد حساس اور نفاست پسند تھا۔

سوا چھے بجے کے قریب وہ سینما ہال میں جا بیٹھی۔ اس نے اپنے ساتھ والی سیٹ پر اپنا رومال رکھ دیا، چلغوزوں اور کشمش کے لفافے بھی۔ ہولے ہولے ہال بھر گیا۔ مگر موتی نہیں آیا۔ پر جب ہال کی روشنیاں گل ہو گئیں اور پکچر شروع ہو گئی تو سدھا نے موتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر محسوس کیا۔ وہ اندھیرے میں چپکے سے آ کر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا سدھا نے اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا۔

''بڑی راہ دکھاتے ہو''

''سوری''موتی کے لہجے میں بے حد ملائمت تھی۔

''میں تمہارے لیے چلغوزے اور کشمش لائی ہوں کھاؤ......''

موتی نے کشمش کے چند دانے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیے اور سدھا مسرت کا گہرا سانس لے کر تصویر دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ اب باتیں کرنے کا لمحہ نہ تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ موتی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے وہ اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیتی۔ موتی سرگوشی میں کہتا۔

''میرے کندھے پر سر کر دینے سے تمہیں کیا نظر آتا ہے؟ تصویر تو نظر آتی نہ ہو گی''؟

''وہ تصویر نظر آتی ہے جو اس ہال میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی نہیں دیکھ سکتا''۔ سدھا نے بڑی گہری مسرت سے کہا۔

آہستہ آہستہ ہر شخص نے تبدیلی محسوس کی۔ سدھا کی میلی میلی آنکھیں اجلی ہوتی گئیں اور پھر ان آنکھوں میں کاجل لگا کر اس نے دنبالہ کھینچا تو وہی اجلی آنکھیں نشیلی ہو گئیں

اور چال میں کولھوں کا مدھر بہاؤ شامل ہوتا گیا۔ وہ دن بدن حسین اور دلکش ہوتی گئی۔ اب اس کے کپڑے انتہائی صاف ستھرے ہوتے تھے۔ کم قیمت کے، مگر بے حد عمدہ سلے ہوئے ہوتے تھے۔ سدھا کو یہ توفیق نہ تھی کہ وہ کسی اچھے درزی کے پاس جا سکے۔ مگر خود ہی اس نے درزی کا کام سیکھ لیا تھا اور بہت کم لڑکیاں کٹائی اور نئے لباس کی تراش اور ڈیزائن میں اس کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ وہ یہ کپڑے خود اپنے ہاتھ سے کاٹ کر تیار کرتی ہے۔ اس کے دفتر کی جب کوئی دوسری لڑکی اس کے لباس کی تعریف کرتی تو سدھا جھٹ کسی مہنگے درزی کا نام بتا دیتی۔ جہاں صرف امیر ترین فیشن ایبل عورتوں کے کپڑے تیار ہوتے تھے اور اس کے دفتر کی لڑکیاں جل کر خاک ہو جاتیں اور سدھا سے رشک اور حسد کے ملے جلے انداز میں پوچھتیں۔

''کیسا ہے وہ تیرا؟''

''گورا رنگ ہے، بال گھنگھریالے ہیں۔ ہنستا ہے تو موتی جھڑتے ہیں۔ سدھا جواب دیتی۔

''کیا تنخواہ لیتا ہے؟''

''بارہ سو''

''بارہ سو؟'' لڑکیاں چیخ کر پوچھتیں۔ بارہ سو تو ہمارے فرم کے منیجر کی تنخواہ ہے''۔

''وہ بھی ایک فرم میں منیجر ہے''۔ سدھا جواب دیتی۔

''اری ہمیں دکھائے گی نہیں؟ بس ایک بار دکھا...... ہم دیکھ تو لیں کیسا ہے تمہارا وہ؟''

''دکھا بھی دوں گی۔ کہو تو دفتر میں بلا کے دکھا دوں''

یہ تو اس نے یونہی کہہ دیا تھا۔ ورنہ سدھا کہاں موتی کو دکھانے والی تھی۔ وہ مر جاتی مگر اپنے موتی کو نہ دکھاتی۔ ان لونڈیوں کا کیا بھروسا......؟ مگر سدھا نے دفتر میں بلانے کی دھمکی اس کامل اعتماد سے دی تھی اس سے آگے پوچھنے کی ہمت لڑکیوں کو نہ ہوئی اور وہ جل کر

خاموش رہ گئیں۔

سدھا کا بوڑھا باپ کڑھ کڑھ کر مر گیا، کیونکہ سدھا شادی نہ کرتی تھی اور محلے والے طرح طرح کی چہ مگوئیاں کرتے تھے۔اور سدھا کا باپ اپنی بیٹی کو کچھ نہ کہہ سکتا تھا کیونکہ سدھا جوان اور بالغ اور خودمختار تھی۔اب وہ گھر میں دوسو روپے لاتی......سدھا کا باپ مر گیا۔اور اسکے مرنے کے بعد اگلے چند سالوں میں سدھا کے بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں اور وہ لوگ اپنی اپنی بیویاں لے کر اپنی اپنی ملازمتوں کے ٹھکانوں پر چلے گئے۔پھر اس کی چھوٹی بہن وجے کی بھی شادی ہوگئی۔پھر اس کی ماں بھی اپنی بیٹی کے کنوارے پنے کے غم میں سلگ سلگ کر مر گئی اور سدھا اس غم میں اکیلی رہ گئی۔چند ماہ بعد اس نے وہ گھر چھوڑ دیا اور سول لائنز میں ایک عمدہ مکان کی دوسری منزل میں دو کمرے لے کر پے انگ گیسٹ(Paying Guest) کے طور پر رہنے لگی۔اس کے رہنے کے حصے کا دروازہ الگ سے باہر نکلتا تھا اور اب وہ اپنی نقل وحرکت میں مکمل خودمختار تھی۔اب وہ پینتیس برس کی ہو چکی تھی۔مگر مشکل سے تیس برس کی معلوم ہوتی تھی۔اس کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھلی رہتی اور آنکھوں میں خوشیوں کے سائے ناچتے رہتے۔وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور باوقار ہوگئی تھی۔وہ اسٹینو ہوگئی تھی۔اس نے بی اے بھی کرلیا تھا۔اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور کتابیں پڑھنے کا شوق بھی......

اب وہ خوش حال اور آرام دہ اور سکون آمیز زندگی بسر کر رہی تھی۔کئی سال سے وہ اپنی مانگ میں سیندور بھر رہی تھی اور ماتھے پر سہاگ کی بندیا سجاتی تھی۔اور لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی شادی کہاں ہوئی ہے؟ اور کون اس کا خاوند ہے؟ مگر لوگ اتنا جانتے تھے کہ کوئی اس کا ہے،جس کے ساتھ وہ اپنی شامیں گزارتی ہے بلکہ لوگ تو یہاں تک کہتے سنے گئے کہ جو کوئی بھی وہ ہے،اس کی اپنی کچھ وجوہ ہیں،جن کی وجہ سے ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی۔مگر وہ دونوں ہر شام کی تنہائی میں ملتے ہیں اور جب دنیا سو جاتی ہے اور جب کوئی کسی کو نہیں دیکھتا۔جب چاروں طرف نیند غالب آجاتی ہے ان غنودگی سے لبریز لمحوں میں کوئی سدھا کے یہاں آتا ہے۔ہولے سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور خاموشی سے اندر آجاتا ہے......لوگوں نے اسے دیکھا

نہیں تھا۔ مگر لوگوں کا خیال یہی تھا۔ وہ سدھا سے کچھ کہتے نہیں تھے۔ کیونکہ سدھا اب ایک سنجیدہ اور باوقار عورت بن چکی تھی اور جس کے ماتھے پر سیندور کا بڑا سا ٹیکا جگمگاتا ہو، اسے کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟

وہ شام سدھا کی چالیسویں سالگرہ کی شام تھی اور وہ شام کئی وجوہ سے سدھا کو کبھی نہیں بھولتی۔ سدھا، موتی کو متھرا روڈ کے جاپانی گارڈن میں لے گئی تھی جس پر باغ کی بجائے کسی خوبصورت منظر کا شبہ ہوتا تھا۔ شفق نے چوٹ کھائی ہوئی عورت کی طرح اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ اور رات نے سانولی زلفیں افق پر بکھیر دی تھیں۔ ہولے ہولے تارے نمودار ہونے لگے۔ آج سدھا بہت خاموش تھی۔ موتی بھی چپ چاپ سا تھا......

وہ اب بھی اسی طرح خوبصورت تھا جیسے جوانی میں تھا۔ اب بھی وہ ہر روز اسی براؤن سوٹ میں آ کر سدھا سے ملتا تھا کہ سدھا کا حکم یہی تھا۔ اسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ موتی پر زندگی کے بہاؤ نے اور وقت کے گھاؤ نے زیادہ نشان نہیں چھوڑے۔ صرف کنپٹیوں پر سفید بال آ گئے ہیں جو اس کی صورت اور بھی باوقار اور وجیہہ بناتے تھے اور وہ ایک چھڑی لے کر چلتا تھا جو اس کی پچاسویں سالگرہ پر خود سدھا نے اسے تحفے میں دی تھی۔ ورنہ اس کے علاوہ اس کی صورت میں، کردار اور گفتار میں کسی طرح فرق نہ آیا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح اتنا حسین، دل کش اور دل نواز تھا کہ اسے دیکھتے سدھا کے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد آج اسے دیکھ کر سدھا کا دل اتنے زور سے دھک دھک کرنے لگا تھا جتنا پہلے روز......

موتی نے آہستہ سے پوچھا ''تم نے مجھ سے شادی کیوں نہیں کی؟''

''ایک دفعہ انکار کرنے کے بعد......؟ سدھا نے ہولے سے کہا ''تم سے شادی نہیں کی جا سکتی تھی......اب تم یہ کیسے جان سکو گے کہ جس دن تم نے انکار کیا تھا اسی دن تم میرے ہو گئے تھے......اتنا جاننے کیلئے عورت کا دل چاہیے۔

موتی خاموش رہا۔ بہت دیر بعد بولا ''آج تو تم چالیس سال کی ہو چکی ہو، کیا تمہیں افسوس نہیں ہوتا کہ تم نے مجھ سے شادی نہیں کی......''

یہ سن کر سدھا بھی خاموش ہوگئی، اتنی دیر خاموش رہی کہ موتی کو گمان گزرا کہ کہیں سدھا اندر اندر رو رہی ہے۔

''سدھا'' اس نے آہستہ سے اس کا شانہ ہلایا۔

''میں سوچ رہی تھی'' سدھا ہولے سے بولی..... تم سے شادی نہ کر کے میں نے کیا کھویا ہے..... کیا کوئی شام ایسی تھی؟ جو میں نے تمہارے ساتھ نہ گزاری ہو۔ سوچو تو کہاں کہاں ہم نہیں گئے؟ جہاں جہاں میں نے تمہیں بلایا، کیا تم وہاں نہیں پہنچے؟ اور جس وقت بھی بلایا، اسی وقت سب کام چھوڑ کر تم نہیں آئے؟ اگر شادی کا نام رفاقت ہے تو وہ مجھے حاصل ہے'' .....

''پھر یہ بھی تو سوچو کہ اس طویل رفاقت میں میرا تمہارا ایک بار بھی جھگڑا نہیں ہوا۔ میں نے تمہیں ہمیشہ مہربان اور مسکراتے ہوئے پایا۔ سالہا سال جب میرے ہاتھوں کو تمہارے ہاتھوں کی ضرورت ہوئی، ان کے لمس کی گرمی میں نے اپنے جسم کے روئیں روئیں میں محسوس کی..... تمہارے پھول میری زلفوں میں رہے۔ تمہارے بوسے میرے ہونٹوں پر۔ تمہاری وفا میری دل میں..... کیا کوئی عورت محبت میں اس سے زیادہ پا سکتی ہے؟

سدھا نے ایک گہری مسرت سے اپنے آپ کو موتی کے بازوؤں میں ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا کہ موتی کے دو بازو نہیں بلکہ چار بازو ہیں بلکہ شاید چھ بازو ہیں، آٹھ بازو ہیں اور وہ اپنے جسم و جاں کے رگ و ریشے میں اس کے بازوؤں کو محسوس کر رہی تھی۔ جو اسے بھینچ کر سینے سے لگا رہے تھے اور سدھا نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کے سپرد کر دیا اور اندر ہی اندر اس طرح کھلتی چلی گئی جیسے چاندنی کے لمس سے کلی کھل کر پھول بن جاتی ہے۔ مدماتے تاروں کے جھرمٹ میں، سبز جھالروں والے پیڑوں کی اوٹ سے چاند ابھر آیا تھا۔ اور اب چاند اس کے بالوں میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے ہونٹوں میں تھا۔ اس کے دل میں تھا۔ اور لہر در لہر اس کی جوئے خوں میں رواں تھا۔ ہائے میرے موتی چور..... میرے موتی چور..... میرے میٹھے لڈو..... میں تو مر گئی تیرے لیے.....

تھوڑی دیر کے بعد جب سدھا نے آنکھیں کھولیں تو اس کا پرمسرت غنودگی آمیز چہرہ بتا رہا تھا کہ اس سے ابھی محبت کی گئی ہے......!

وہ شام، وہ رات سدھا کو کبھی نہیں بھولے گی، کیونکہ وہ رات مکمل تھی اور ان دونوں کی زندگیاں مکمل تھیں۔ جیسے وقت اور عمر، چاند اور آرزو سب ایک ساتھ دائرے میں مکمل ہو جائیں۔ اور جذبے کی ایک بوند بھی چھلک کر باہر جانے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔ ایسے لمحے کب کسی کی زندگی میں آتے ہیں اور جب آتے ہیں تو اس شدت سے اپنا تاثر چھوڑ کر جاتے ہیں کہ انسان محسوس کرتا ہے...... کہ شاید میں اب تک جیا ہی اس لمحے کیلئے تھا۔ شاید کچھ اسی طرح سدھا نے اس لمحہ میں محسوس کیا اور پھر کبھی اس طرح محسوس نہ کیا۔ کیونکہ اس واقعہ کے چند دن بعد، اس کے دفتر کا منیجر تبدیل ہو گیا اور جو منیجر اس کی جگہ آیا۔ اس کو سدھا سخت ناپسند کرنے لگی۔ ایک تو وہ بدصورت تھا، کسی زمانے میں اس کا رنگ گورا ضرور رہا ہوگا۔ مگر اب تو پرانے تانبے کا سا تھا۔ اور موٹی ناک پر مسلسل شراب نوشی سے نیلی وریدوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا اور سدھا کو اپنے منیجر کی ناک دیکھ کر ہمیشہ گمان ہوتا کہ یہ ناک نہیں انجیر ہے جو ابھی باتیں کرتے کرتے اس کے سامنے پھٹ جائے گا۔ اس کے گال جبڑوں پر لٹک گئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ سر کے بال اڑ گئے تھے اور جب وہ بات کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مینڈک کسی کائی سے بھرے تالاب کے اندر سے بول رہا ہو۔ عجب سی گھن آتی تھی سدھا کو اس سے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اب دفتر میں اتنے سال کام کرتے کرتے وہ ہیڈ اسٹینو بن چکی تھی اور اسے دن بھر منیجر کے کمرے میں رہنا پڑتا تھا اور اس سے اسے انتہائی کوفت ہوتی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ کوفت یہ سوچ کر ہوتی تھی کہ اس نے اس بدصورت انسان کو اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ جیسے یہ صورت جانی پہچانی ہو، مگر کہاں؟ ذہن اور حافظے پر زور دینے سے بھی اس کی یاد نہ آتی تھی۔

''اونہہ دیکھا ہوگا، اس مرگھلے کو کناٹ پیلس میں چکر کاٹتے ہوئے کہیں''۔ سدھا اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہتی۔ مگر پھر اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہتی۔ مگر پھر کبھی وہ منیجر کسی

فائل کو خود اٹھا کر سدھا کی میز پر رکھتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ایسی جنبش کرتا کہ سدھا کا ذہن بے چین ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتی۔ کون تھا وہ؟ کس سے اس کی یہ حرکت ملتی ہے۔ کیا میرے مرحوم باپ سے؟ میرے کسی بھائی سے؟ جیسے یہ حرکت مجھے کچھ...... یاد دلاتی ہو......؟ مگر کیا......؟ غور کرنے سے بھی وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکتی......اور پھر اپنا کام کرنے لگتی۔ مگر دن بھر اس کے دل میں ایک خلش سی ہوتی رہتی......!

پہلی تاریخ جب تنخواہ بٹ چکی تو اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو نئے منیجر نے سدھا کو کسی کام سے روک لیا اور اپنی میز کے سامنے کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر اس نے ایک کیبنٹ کھول کر اس میں سے ایک گلاس نکالا اور وہسکی کی بوتل اور سوڈا......اور پہلا پیگ وہ غٹا غٹ چڑھا گیا۔ سدھا اسے حیرت سے دیکھنے لگی اور غصے سے اٹھ کر جانے لگی کہ منیجر نے نہایت نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جانے سے باز رکھا اور بولا۔

''آج جب تمہاری ترقی کی فائل میرے سامنے آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس دفتر میں سب سے پرانی ملازم تم ہو، بڑی خوشی کی بات ہے''۔

سدھا چپ رہی۔

''تمہارا نام سدھا ہے نا......؟ منیجر بڑی بے چینی سے بولا۔

سدھا بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنے دن سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے، کیا یہ میرا نام بھی نہیں جانتا؟ آخر اسے ہوا کیا ہے؟

''میرا مطلب ہے''......منیجر دوسرے پیگ کا ایک بڑا سا گھونٹ پی کر بولا ''تم وہی سدھا ہو نا، جس کے باپ کا نام جیون رام ہے......؟''

سدھا بڑی ترش روئی سے بولی ''ہاں میرے باپ کا نام بھی فائل میں لکھا ہے۔ پھر مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے؟'' وہ تقریباً اٹھتے اٹھتے بولی۔

''بیٹھو بیٹھو......'' منیجر نے پھر اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے پہچانا نہیں؟'' وہ اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''نہیں......'' وہ غصے سے بولی۔

''تم اپنے باپ کے ساتھ محلّہ چنداں میں رہتی تھیں نا؟''

''ہاں''

''میں ایک روز تمہارے گھر آیا تھا۔ تمہیں دیکھا تھا، تم سے باتیں بھی کی تھیں''۔ بڑھے منیجر نے سدھا سے کہا۔ ''اب تم ایک خوبصورت عورت بن چکی ہو، مگر جب تم ایسی نہ تھیں۔ جب تم ایک معمولی لڑکی تھیں اور میں نے تمہیں دیکھا تھا اور تم سے باتیں بھی کی تھیں۔

''کب......؟ کب......؟'' سدھا بے چینی سے بولی۔

بڑھا منیجر دیر تک سدھا کو دیکھتا رہا۔ آخر آہستہ سے بولا۔

''میں موتی ہوں''......

سدھا سناٹے میں آ گئی۔

''میں بڑا...... میں بڑا بدنصیب تھا جو تم سے شادی نہ کی...... میں تمہیں اچھی طرح سے دیکھ نہ سکا تھا۔ ان چند لمحوں میں کوئی کیا جان سکتا ہے۔ کیونکہ ایک صورت جلد کے اندر بھی پوشیدہ رہتی ہے...... میں نوجوان تھا۔ دولت اور گورے رنگ کا لالچی۔ جو بیوی مجھے ملی، وہ دولت بھی لائی تھی اور سفید چمڑا بھی، اور اس کے ساتھ ایک مغرور، بدمزاج، ظالم اور بے وفا طبیعت بھی لائی تھی۔ چند سالوں ہی میں میرے پانچ بچے ہو گئے۔ ان میں کتنے میرے تھے؟ میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے اور میں سنتا تھا اور پیتا تھا اور دوسری عورتوں کے پاس جاتا تھا...... پھر زہر...... بیماری کا، اور شراب کا، اور ناکامی کا، اور بے مہری کا، میرے رگ رگ میں پھیل گیا اور میں وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا۔ اور بجھ گیا...... اب وہ مر چکی ہے۔ اس لیے میں اسے کچھ نہ کہوں گا اور کہوں بھی تو کیا......؟ قصور تو میرا ہے۔ میری ان آنکھوں کا جو تمہیں پہچان نہ سکیں...... میری آنکھوں نے ایک ہیرا دیکھا اور پتھر سمجھ کر پھینک دیا...... کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتی؟ میری عمر زیادہ نہیں ہے، مجھے تو محبت بھی نہیں ملی...... جس کیلئے میں ساری عمر ترستا رہا''۔

وہ کہے جا رہا تھا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کا جی چاہتا تھا

کہ وہ اس سے کہے "اب تم آئے ہو؟ بوڑھے بدصورت اور گنجے ہو کر، خوفناک بیماریوں کا شکار ہو کر......اب تم مجھ سے شادی کیلئے کہہ رہے ہو؟ مگر میں نے تو اپنی ساری زندگی تمہیں دے دی اور تمہیں معلوم تک نہ ہوا کہ میں اپنی ساری جوانی تمہارے تصور میں کھو دی۔ اور زندگی کی ہر بہار تمہارے خیال میں گنوا دی اور شباب کی ہر مچلتی ہوئی آرزو تمہاری ایک نگاہ کیلئے لٹا دی۔ زندگی بھر سڑکوں پر اکیلی چلتی رہی، تمہارے سائے کے ساتھ، اندھیرے پارکوں میں بیٹھی رہی تمہارے تصور کے ساتھ، میں نے خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر کے تم سے ساڑھیوں کے تحفے لئے، تمہارا زیور پہنا اپنی محبت کا خون کر کے سینما دیکھا اور اپنے ساتھ کی سیٹ خالی رکھ کر۔ میرا باپ مر گیا۔ میری ماں مر گئی۔ تمہارے خیال کو حرز جان بنائے ہوئے اپنے کنوارپن کے چالیس سال، آنکھیں، کان اور ہونٹ بند کر کے تمہاری آرزو میں بتا دیئے تھے...... میں کتنی خوش تھی؟ کتنی مگن تھی؟ میں نے تو تم سے کبھی کچھ نہ مانگا تھا نہ شادی کے پھیرے، نہ سہاگ کی رات، نہ بچے کا تبسم! بس......صرف ایک تصور، ایک جھلک، ایک عکس رخ یار ہی تم سے مستعار لیا تھا اور تم آج اسے بھی جہنم کی چتا میں جلانے کیلئے میرے شہر میں چلے آئے ہو......"

مگر سدھا موتی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور جب موتی نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ غصے سے جھنجھلا گئی اور اس کا ہاتھ جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر نکل کر سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ موتی اسے بلاتا ہی رہا۔ وہ بھاگ کر سڑک پر جا پہنچی۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی بجلی کی بتیوں کی اتنی روشنی تھی کہ لوگ اس کے آنسو دیکھ لیتے۔ مگر اس نے کسی کی پروا نہ کی اور وہ روتے روتے آگے بڑھ گئی۔ آصف پارک کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹکی۔ ایک لمحے کیلئے اسے خیال آیا کہ وہ پارک کے اندر جا کر، کسی پیڑ کے تنے سے سر ٹیک کر بیٹھ جائے، مگر پھر اس نے سوچا "بے سود ہے، سب بے سود ہے، میرے خیالوں کا شہزادہ اب وہاں نہ آئے گا۔ اب وہ کبھی میرے پاس نہ آئے گا"۔

جب وہ یہ سب سوچ رہی تھی تو اس نے اپنی مانگ کا سیندور مٹا ڈالا اور سہاگ بندیا کھرچ لی اور پارک کی ریلنگ سے اپنی ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب وہ ساری عمر کیلئے بیوہ ہو چکی ہے۔

◆◆◆

تالاب کی حسینہ

پہاڑی کے اوپر تالاب تھا۔ یہاں سے شہر کا منظر بہت دلفریب معلوم ہوتا۔ چھوٹا سا خوبصورت کوہستانی شہر، اس کے مکانوں کی ٹین کی چھتیں، دھوپ میں چاندنی کے تختوں کی طرح چمکتی ہوئی، شوالوں کے رنگین اور روپہلے کلس، سڑکیں جن پر اودے رنگ کی بجری بچھی ہوئی تھی اور جن کے گرد دورویہ شمشاد اور سرو کے درخت ایستادہ تھے۔ اس کے باغات جو آڑو، پلم اور خوبانیوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان سب نے مل کر اس چھوٹی سی وادی کے حسن کو فروزاں تر کر دیا تھا۔ یہ شمال مغرب کے سلسلہ ہائے کوہ پر ایک سپید دھند کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ پہاڑی کے قدموں میں یوکلپٹس کے درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ ایک لمبے سے کھیت پر سایہ کر رہا تھا کھیت کے درمیان ہل میں جتے ہوئے دو بیل تھے اور اتنی بلندی سے دو خوبصورت کھلونوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

میں نے ان دو بیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے تالاب کے چوکیدار سے کہا۔ ''فیروز بہت افسوس ہے، بہت افسوس ہے، جب ہم نے منحوس خبر سنی جب...... ہاں پرسوں شام کو ڈاکٹر ساجد کے ہاں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ فیروز کا لڑکا تالاب میں ڈوب کر مر گیا۔ کیا بتاؤں یہ سن کر کتنا رنج ہوا، اسی وجہ سے ہم سب (اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے) کل یہاں تیرنے کو نہیں آئے تھے۔ ایک دو بار جی میں آیا کہ چلو چلیں، شاید ہماری چند رسمی باتوں

سے تمہارے دل کو کچھ تسکین پہنچ سکے، مگر ہماری طبیعتیں ہی کچھ اس طرح افسردہ اور رنجور سی ہو گئی تھیں کہ ادھر پاؤں ہی نہ اٹھ سکے''۔

فیروز نے چنار کی ایک ٹہنی کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔''ٹھیک کہتے ہو بابو جی کل میں سوچتا تھا کہ بابو جی کیوں نہیں آئے، میں غریب تو ہوں، مگر پھر بھی مجھے امید تھی کہ آپ ضرور افسوس ظاہر کرنے آئیں گے اور میری ڈھارس بندھائیں گے''۔

جگدیش بولا،''بس یہی بات تھی (میری طرف اشارہ کرکے) جو انہوں نے بیان کر دی''۔

دت نے کہا۔''ہاں ہاں، بھلا نہ آنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی تھی''۔

سرجیت نے پوچھا۔''مگر یہ ہوا کیسے؟''

فیروز نے ایک آہ بھر کر کہا۔''یہ کیوں کر بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا؟ کس طرح میرا ننھا منا لال آنکھوں دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کیلئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں ابھی تک اس امر کو سمجھ نہیں سکا کہ اسے موت کیونکر آ گئی، بھلا یہ بھی کوئی موت ہے، اگر اسے مرنا ہی تھا تو پہلے بیمار ہوتا، میں اس کا علاج کرتا، اسے ڈاکٹروں، حکیموں، عطائیوں، پنساریوں کے پاس اٹھائے پھرتا۔ ان سے ہاتھ باندھ کر عرض کرتا، خدارا میرے بچے کا اچھی طرح علاج کرو۔ ہم دونوں میاں بیوی بیماری کی راتیں جاگ جاگ کر کاٹتے۔ سارا دن اس کے سرہانے بیٹھے رہتے، اس کی ذرا ذرا سی فرمائش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے، وہ کتنے ہی دنوں سے ربڑ کا کھلونا مانگ رہا تھا۔ ہائے میں نے اسے کیوں نہ لا کر دیا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگلی تنخواہ کے آنے پر تجھے لا دوں گا۔ کیا پتہ تھا کہ جب اگلی تنخواہ آئے گی میرا بیٹا کھلونا مانگنے کیلئے یہاں موجود نہ ہوگا۔ دل چاہتا ہے، میں ربڑ کا کھلونا جو اسے اس قدر پسند تھا۔ خرید لوں اور اپنے بیٹے کی قبر پر جا کر رکھ دوں اور اس سے کہوں اٹھو، بیٹا منظور، تمہارا باپ تمہارے لئے ربڑ کا پیارا سا کھلونا لایا ہے۔ کیا وہ میری بات سنے گا بابو جی؟''

سرجیت بولا،''کتنے سال کا تھا منظور، دو ڈھائی، تین سال کا ہوگا، چھوٹا سا تو تھا ہی''

فیروز بولا۔ ''ہاں بابو جی، بس اتنی عمر کا ہوگا، مگر کتنا پیارا بچہ تھا، آپ نے دیکھا تھا نا سانولا رنگ، موٹے موٹے ہاتھ پاؤں، اس کی ماں سعیدہ نے اسے کتنی تکلیفوں سے پایا تھا، کتنے ہی پیروں، فقیروں سے گنڈے تعویذ لیے، منتیں مانی، تب جا کر گھر کا لال ہاتھ آیا۔ یہ پتہ نہ تھا اتنی جلدی ہمیں جدائی کا داغ دے جائے گا، بس حیرت ہے تو یہی، ایمان سے کہتا ہوں، بابو جی میرے کلیجے میں بس یہی ناسور ہے، وہ بیمار ہوتا، میری آنکھوں کے سامنے کمزور ہوتا، میرے آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کی جھولی میں جان دیتا۔ پھر میں اسے کفناتا، دفناتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا مگر یہ کیا ہوا کہ میں یہاں (تالاب کے عین اوپر ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے) اپنے مکان کے صحن میں کھڑا دور نیچے پگڈنڈی پر جاتے ہوئے ان خوش باش بےفکر نوجوانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جوگاتے، ناچتے ہوئے بساکھی کے میلہ پر جا رہے تھے۔ یہاں تالاب میں غربی سمت پر چند لڑکے نہا رہے تے، ادھر دوسری طرف چند عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں۔ منظور کی ماں سعیدہ صحن میں چولہے پر مکی کی روٹیاں پکا رہی تھی۔ منظور اسی کے پاس کھڑا توتلی آواز میں کہہ رہا تھا، اما آنی، اما اوتی، سعیدہ کی ماں کھاٹ پر چائے پی رہی تھی، پھر پتہ نہیں کس وقت منظور اپنی ماں کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ کپڑے دھوتی ہوئی عورتوں کی چھوا چھو، نہاتے ہوئے سکھ لڑکوں کے قہقہے، بساکھی کے میلہ کو جاتے ہوئے جاتریوں کا شور وغل بس ہم نے ان چند منٹوں کیلئے منظور کو اپنے دل سے بھلا دیا، کچھ دیر بعد میں تالاب کے کنارے سے کسی کو کہتے ہوئے سنا، وہ لکڑی سی کیسی تیر رہی ہے، میں بھاگتا ہوا کنارے کی طرف گیا۔ کسی نے ہاتھ پاؤں چھو کر کہا ''مر گیا'' (چھاتی پر دو ہتڑ مار کر) ہائے'' [جگدیش، صبر کرو فیروز صبر کرو!]

فیروز، بابو جی صبر کروں تو کیسے، آنکھوں کے آگے اس کی بھولی بھالی صورت ہے۔ اب ہمارے لیے اس کی یاد کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ (جیب میں ہاتھ ڈال دیتا ہے) اور یا یہ...... (جیب سے ہاتھ نکال کر...... یہ تیلی سی مسواک۔ یہ مسواک اور ایک چھوٹی سی مٹی کی پیالی، میں نے دونوں چیزیں اس چھوٹی سی نہر کے کنارے پائیں جو اس تالاب کو پانی مہیا کرتی ہے۔ وہ

صحن سے اتر کر نہر کی ان سیڑھیوں کی طرف آیا ہوگا۔ آہستہ آہستہ اس نے جھک کر مٹی کی پیالی میں پانی بھرا ہوگا۔ مسواک کو زمین پر رکھ کر اس نہر میں ہاتھ ڈال کر پانی سے کلی کرنے کی کوشش کی ہوگی، پھر وہ یکا یک پھسل گیا ہوگا۔ پانی میں ہلکا شور بھی پیدا ہوا ہوگا۔ اس نے چیخنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ تالاب کے کنارے تک جاتے جاتے اس نے ہاتھ پاؤں بھی مارے ہوں گے، مگر آہ میری آنکھوں نے کچھ نہ دیکھا۔ نہ کانوں نے کچھ سنا، سوان گیتوں کے جورا ہگیر گا رہے تھے، سعیدہ روٹی پکاتی رہی، بڑی اماں کھاٹ پر چائے پیتی رہی اور اس نہر کے کنارے ہمارے آنکھوں کے سامنے...... ہائے...... بابو جی، صبر کیسے آئے؟

سرجیت۔ یہ مشیت ایزدی تھی، اس میں کسی کا کیا دخل، خدا نے تمہیں دیا، اسی نے لے لیا۔ تمہارا اس میں اتنا ہی حق تھا۔

فیروز۔ سچ ہے، انسان کیا کر سکتا ہے؟

دت۔ کیسا پیارا بچہ تھا، جگدیش، تمہیں یاد ہے وہ دن، وہ اس نہر کے کنارے اپنی چھوٹی سی قمیض دھو رہا تھا، کتنا پیارا معلوم ہوتا تھا، یاد ہے میں نے تم سے کہا تھا، اس وقت کیمرہ ہوتا تو اس کی تصویر کھینچ لیتے اور انعامی مقابلے کیلئے بھیجتے۔

سعیدہ جواب تک پاس کھڑی چپ چاپ سب باتیں سن رہی تھیں اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بابو جی، کنور لوگ ناتھ سنگھ جی جو ڈاک بنگلے کے قریب ایک کوٹھی میں رہتے ہیں انہوں نے ایک بار منظور کی تصویر کھینچی تھی۔ ہم نے کئی بار ان سے وہ تصویر مانگی ہے مگر وہ دیتے نہیں اگر آپ ان سے کہیں تو......''

جگدیش بولا۔ بہت اچھا سعیدہ، میں ضرور ان سے کہوں گا، امید ہے وہ تصویر دے دیں گے۔

اب ہم غسل کا لباس پہن کر تالاب کے کنارے پر پہنچ چکے تھے، تالاب کی وسیع چادر آب ہمارے سامنے تھی۔ جس پر کہیں نیلوفر کے پھول کھلے ہوئے تھے، میں ہاتھ پھیلا کر ایڑیاں اٹھا کر غوطہ زن ہونے کو تھا کہ سرجیت نے آہستہ سے میرے کان میں انگریزی زبان

میں کہا ’’پیچھے دیکھو‘‘۔

میں نے مڑ کر دیکھا، چنار کے درخت کے قریب، جنگلی گلاب کی بیلوں کے درمیان ایک لڑکی کھڑی تھی۔ سرو کی طرح خوش قامت اور جنگلی گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت اور نازک اندام، اس کی دونوں کلائیاں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور سر پر رکھی ہوئی مٹی کی گاگر کو تھامے ہوئے تھے۔ سعیدہ اس کے پاس کھڑی اشاروں میں اسے کچھ کہہ رہی تھی وہ کتنی نازک کتنی خوبصورت تھی۔ بانکے، ترچھے، دلآویز نقش، کیا ایک عورت بھی اس قدر خوبصورت ہوسکتی ہے۔ مجھے احساس ہوا، یہ عورت نہیں چغتائی کی ایک تصویر ہے۔

میں نے سرجیت سے پوچھا ’’یہ کون ہے؟‘‘

سرجیت نے استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم نہیں جانتے، یہ کون ہے؟ حیرت ہے یہ ایک کمہاری ہے اوپر تالاب کے اس پار (انگلی سے اشارہ کرکے) وہ جو گھر ہے نا، کچا سا، وہاں رہتی ہے۔ سب جج صاحب کا لڑکا جو یہاں نہانے کیلئے آیا کرتا ہے۔ اس نے اس کا نام ’’تالاب کی حسینہ‘‘ رکھ دیا ہے۔

’’تالاب کی حسینہ......تالاب کی حسینہ......‘‘ میں نے دہراتے ہوئے کہا۔

’’اچھا تو یہ سعیدہ اسے کیسے اشارے کر رہی ہے‘‘

’’بچاری غریب لڑکی گونگی ہے نا‘‘

’’اوہ‘‘......میں نے آہستہ سے کہا۔ ’’یکا یک میرے دل میں خیال آیا، یہ لڑکی گونگی ہے تو بہت ہی اچھا ہے، کیا کسی نے چغتائی کی تصویر کو بولتے دیکھا ہے۔ اگر تصویر، خاموش تصویر بول اٹھے تو اس کی آدھی شعریت رنگینی اور سحر پروری فنا ہو جائے، کاش دنیا کی تمام حسین عورتیں گونگی ہوتیں‘‘۔

ہم سب کی نظریں اپنی طرف گڑی دیکھ کر وہ لڑکی حیران ہو گئی، اس نے اپنی بڑی بڑی وحشی ہرنیوں والی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا، وہ گھبرا کر ٹھٹک سی گئی، اس نے اپنا رخ ہماری طرف سے پھیر لیا۔ کانوں میں پڑے ہوئے موتیا کے آویزے یکا یک سورج کی کرنوں میں چمک اٹھے۔ اس نے سعیدہ کی طرف دیکھ کر سر کو خفیف سی جنبش دی، مٹی کی گاگر میں ایک

خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا۔ پاؤں کی جھانجنیں بجنے لگیں۔ ساکن تصویر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر سے نیچے اترنے لگی۔

میں نے یکا یک کہا۔ ''تم جانتے ہو سرجیت! ہندوستانی رقص کی ایجاد کیسے ہوئی؟''

''نہیں، کیوں؟''

میں نے پگڈنڈی پر سے نیچے اتری ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا ''وہ دیکھو، ایک مٹی کی گاگر اٹھائے، دوشیزہ اور ٹخنوں پر بجتی ہوئی روپہلی جھانجنیں، یہی ہندوستانی رقص کی ابتدا اور انتہا ہے''۔

جگدیش نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم اس غریب لڑکی کو نگاہوں سے نگل جاؤ گے، کیسے گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہو، اب نہاتے بھی ہو کہ دوں میں تمہیں پانی میں ایک غوطہ''۔

اتنا کہہ کر جگدیش نے شانے پھیلا کر، ایڑیاں اٹھا کر، ہوا میں ابابیل کی طرح ایک زقند بھری اور دوسرے لمحے وہ پانی میں دھم سے غوطہ زن ہو گیا۔

اس کے بعد دھم، دھم، دھم، ہم سب اس میں کود پڑے اور فضا بلند قہقہوں سے معمور ہو گئی۔ سطح آب پر بازوؤں کے تیز تیز چپو چل رہے تھے، ایک دوسرے پر پانی اچھالا جا رہا تھا، نیلوفر کے پھول توڑ توڑ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکے جا رہے تھے۔ دت بار بار منہ میں پانی بھر کر زور سے کلیاں کرتا تھا، سرجیت کو تیرنا کم آتا تھا۔ اس لیے وہ سب سے الگ تھلگ آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں مار کر تیرے کی مشق بہم پہنچا رہا تھا، جگدیش اس کے قریب گیا اور اس کے سر کو اپنے بازوؤں میں تھام ک پیار سے بولا۔ ''وایں دفتر بے معنی (ایک ڈبکی لے کر غرق مے ناب اولے'' سرجیت چلانے لگا۔ کنارے پر فیروز کھڑا افسردہ نگاہوں سے تالاب کے پانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فیروز کی اداس نگاہیں میرے دل میں ایک عجیب خلش پیدا کر رہی تھیں، تیرتے تیرتے میں نے سوچا کہ اس زندگی کے بے پایاں تالاب میں ہمیشہ یونہی ہوتا رہے گا۔ یہاں ہنسی کی لہریں ہیں اور موت کے چھینٹے بھی اور پھر کبھی کبھی کوئی خوبصورت کمہاری......

◆◆◆

چڑیا کا غلام

اس کے لانبے قد سے نہ صرف اس کی بیوی کو کوفت ہوتی تھی، بلکہ شہر کے مکان، چھتیں، دروازے تک اس سے نالاں تھے۔ اگر اس لانبے قد کے ساتھ اس کا جسم بھی متناسب ہوتا تو خیر ایک بات تھی۔ لیکن اس کے جسم میں گوشت پوست ہڈیاں وغیرہ یعنی انسان کے دیگر اجزائے ترکیبی مقدار میں اس قدر کم تھے کہ چلتے وقت وہ بانس کی ایک لمبی پتلی شاخ نظر آتا جس کے سر پر دو آنکھیں بندھی ہوئی ہوں۔

اسے اپنی آنکھوں پر بڑا ناز تھا۔ بڑی بڑی لونگی آنکھیں، لیکن اس کے جسم کو دیکھ کر اس کے متناسب اعضاء کا جائزہ لیتے ہوئے ہر فرد کو یہی گمان ہوتا تھا کہ ہو نہ ہو اس شخص نے کسی کی آنکھیں چرا کر اپنے چہرے پر لگالی ہیں۔ کسی قدر عجیب معلوم ہوتی تھی وہ آنکھیں۔

آج اس نے اپنی آنکھوں میں سرمہ لگایا تھا۔ سفید ڈک کی پتلون پہنی ہوئی تھی اور اس کے جسم کی چوٹی پر ایک سیاہ ہیٹ نمایاں تھی۔ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بجلی کے کھمبے پر کوا بیٹھا ہے۔ اس ہیئت کذائی میں جس کی بوالعجبی کا اسے مطلق احساس نہ تھا وہ اپنی اینگلو انڈین محبوبہ کے مکان پر گیا جو مان اسٹریٹ کے جنوبی چوک میں دائیں سڑک کی پہلی بائیں گلی کے دوسرے دائے گھر میں رہتی تھی (اب بھی وہیں رہتی ہے اس لیے میں نے پورا پتہ لکھ دیا ہے کہ شاید کبھی آپ......) جینی جوانی کی حدود سے گزر کر ادھیڑ پنے میں جا رہی تھی اور

پھر ہندوستانی عاشق اس کے گھر آتا تھا۔ محلے کی کرسٹان کالی کلوٹی چھوکریاں اسے تین چار دن تک بہت پریشان کیا کرتی۔ جینی تمہارے نیٹیو محبوب کا کیا حال ہے؟ کیا ہے وہ۔

وہ آج بہت خوش تھا، پہلی تاریخ تھی، جیب میں سکے کھنکنا رہے تھے اور دس روپوں کے نئے نوٹ اپنی مخصوص خوش آئند آواز پیدا کر رہے تھے، وہ آج اپنی محبوبہ کے ساتھ کسی ٹول میں پکچر دیکھے گا...... ہر عشقیہ سین پر اس کا بوسہ لے گا......اور اتنے ہی بوسے لے گا جتنے اس تصویر میں ہوں گے۔ اس کے بعد وہ پی کنگ چینی رسٹوران میں دھنیا، پیاز، گاجر اور کیڑوں مکوڑوں کی ملی جلی بھجیا اڑائیں گے...... پران وافوفو......اور پھر...... پائزوی لوکان......چینی باورچی کتنے ہوشیار ہوتے ہیں جو اشیاء خوردنی ہم نکمی سمجھ کر پھینک دیتے ہیں، انہی چیزوں سے یہ ایسی خوبصورت، خوش ذائقہ پکوان تیار کرتے ہیں کہ چوگنے دام دینے پر بھی متلی نہیں ہوتی......جی بالکل نہیں گھبراتا......وہ جب اس طرح اپنے حسین سپنوں سے کھیلتا ہوا، آپ ہی مسکراتا ہوا گلی کے اندر گھوم کر دوسرے دائیں گھر میں داخل ہوا تو اس نے دو کرسٹان چھوکریوں کے قہقہوں کی آواز سنی، وہ دو ٹامیوں کے بازوؤں سے لگی ہوئی چلی جا رہی تھیں، کالے کالے پاؤں، اونچی ایڑی کے سفید جوتے کیا بھلے معلوم ہوتے تھے......اسے دیکھ کر بولیں......جینی کا نیٹیو ہی ہی ہی......جینی......

جینی نے یہ آوازے سن لیے۔ وہ پی رہی تھی اور غصے میں تھی، یہ نوجوان لڑکیاں پیارے پیارے سرخ و سپید ٹامیوں کو لیے ہوئے چلی جا رہی تھیں اور آج اس کی قسمت میں......

''جینی'' بانس کی شاخ نے نہایت پیار سے کہا۔

جینی رخصت لیے ہوئے تھی، آنکھیں، لال، چہرہ سوجا سوجا سا۔

وہ حیران رہ گیا......جینی کیا بات ہے؟

ہٹ جاؤ۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

اس نے جیب میں سے روپے نکالے مسکرا کر کہنے لگا......بھول گئیں؟ آج پہلی

تاریخ ہے، پکچر، پی کنگ...... پھر بندگارڈن کی سیر اور......

جینی نے روپے اور نوٹ اٹھا کر اپنے بلاوز میں ڈال لیے، بولی ''دفع ہو جاؤ، آج میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی''۔

کیوں ڈارلنگ؟

وہ اس کی بلائیں لینے لگا۔

اچھا دیکھو ڈارلنگ...... یکا یک جینی نے نہایت مسکین لہجے میں کہا۔ تم گھر چلے جاؤ۔ یہ آنکھوں کا سرمہ دھوڈالو...... یہ سپیدڈک کی پتلون تبدیل کر آؤ اور یہ کالی ہیٹ بھی...... اس......اس لباس میں......تم بالکل چڑیا کے غلام معلوم ہوتے ہو۔

یہ کہہ کر جینی نے دونوں ہاتھ اپنے کولہو پر رکھ لیے اور بے تحاشا ہنسنے لگی۔

مان اسٹریٹ میں کینسر وانیڈ کینسر وکی دکان میں نئے کھلونے آئے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے لڑکے نمائشی دریچے کے شیشے سے اپنا چہرہ لگائے حیرت سے اس کھلونے کی طرف دیکھ رہے تھے جو دریشے کے اندر ایک لکڑی کے اسٹول پر کھڑا دائیں بائیں سر ہلاتا جاتا تھا اور مسکراتا جاتا تھا۔

ایک لڑکے نے کہا...... یہ کھلونا میں لوں گا۔

دوسرا بولا......نہیں، یہ کھلونا میں لوں گا۔

پہلے لڑکے نے کہا......تم کیسے لوگے؟ کیا تمہارے پاس سات رنگوں والا بنٹا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب میں سے وہ بنٹا نکالا اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے لڑکے کو دکھانے لگا۔

دوسرے لڑکے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر اس کی آنکھوں کے قریب لے جا کر اپنی مٹھی کھول دی، اور اسی ہتھیلی پر بالکل ایک ایسا ہی خوبصورت بنٹا چمک رہا تھا۔

پہلا لڑکا بولا...... میرے پاس لوہے کی چھ انچ لمبی کیل ہے، یہ دیکھو......

دوسرے لڑکے نے کہا...... میرے پاس سیب چاقو ہے۔ یہ دیکھو۔

پہلے لڑکے نے کہا...... تمہارے باپ کی ناک ٹیڑھی ھے۔

دوسرے لڑکے نے کہا...... تمہارا باپ گلی کا مہتر معلوم ہوتا ہے...... اور ان دونوں نے وہیں لڑنا شروع کر دیا۔

وہ چیخنے چلانے اور رونے لگے۔ لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ اتنے میں ان لڑکوں کی مائیں بغل کی دکان سے نکل آئیں اور ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگیں۔ تیرے لڑکے نے میرے لڑکے کو پیٹا۔ نہیں تیرے لڑکے نے میرے لڑکے کو گھونسا دکھایا...... تو کہاں کی نواب زادی بن کر آئی ہے؟ دونوں عورتوں نے وہ شور مچایا، وہ شور چمایا کہ سارا راستہ بند ہو گیا۔ پولیس کا سپاہی یہ جھگڑا چکانے آ رہا تھا، راستے میں ایک ملٹری کے سپاہی سے الجھ پڑا۔ ملٹری کے سپاہی نے اسے ایک بھرپور گالی دی۔ پولیس والے نے ڈنڈے کا ایک بھرپور وار اس کے سر پر رسید کیا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ٹانگے، موٹریں لاریاں دونوں طرف رک گئیں۔

ایک پے کارڈ والا۔ ارے اپنے اس سالے شورلے کے چھکڑے کو آگے نکال۔

دوسرا ڈرائیور۔ ابے دیکھتا نہیں، راستہ بند ہے، آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ نئی گاڑی کو چھکڑا کہتا ہے اور اپنے اس پرانے نکمے ماڈل کو نہیں دیکھتا پتہ نہیں کس کباڑیئے سے پرانے پرزے لے کر موٹر کھڑی کر لی ہے؟

تجھے موٹر کھڑی کرنے کا مزہ چکھاؤں؟ پے کارڈ والا بولا۔

ہاتھ تو لگا، ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ سالا سرمایہ دار ہوگا، اپنے گھر ہوگا، دوسرے نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ سالے۔

حرام زادے۔

وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے، ان دونوں کو لڑتے دیکھ کر دو تین آدمی لڑائی بند کرانے کیلئے آگے بڑھے لیکن پھر فطری طریق پر خود آپس ہی میں الجھ پڑے۔ گھونسے، طمانچے، تو تو، میں میں، شور غل، ہاتھ پائی۔

سڑک کے کنارے پان والے کی دکان کے قریب ایک ٹھگنا، موٹا آدمی ایک لمبا سا

سگار منہ میں لیے نہایت اطمینان سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک نہایت دبلا پتلا بدصورت آدمی اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سفید پتلون پہنی ہوئی تھی اور کالی ہیٹ اس کے سر پر رکھی ہوئی تھی۔ سگار والے خوش پوش آدمی نے ایک لمحے کیلئے اس کی طرف دیکھا اور پھر بہ انداز تنفر اپنی توند دوسری طرف پھیر لی۔

چند لمحوں تک وہ دونوں وہیں چپ چاپ کھڑے رہے اور شور وغل بڑھتا گیا، پھر یکا یک ایک تیز گھونسا موٹے آدمی کی توند پر پڑا اور اس کا سگار منہ سے نکل کر موری میں جا پڑی موٹے آدمی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ حیرت سے دیکھنے لگا کہ وہی دبلا پتلا آدمی آستین چڑھائے اسے پیٹ رہا ہے اور دانت پیس پیس کر کہہ رہا ہے...... مجھے چڑیا کا غلام کہتا ہے، سالے میں چڑیا کا غلام ہوں اور تو کون ہے بدمعاش، میں تجھے ابھی چڑیا کا غلام......''

کیخسر واینڈ کیخسر و کی دکان کے نمائشی دریچے میں وہ کھلونا......اسٹول پر کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا اور سر ہلا رہا تھا۔ دائیں بائیں......دائیں بائیں......

◆◆◆

نیا خزانہ

میں اپنے بستر پر بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا اور نیم غنودگی کے عالم میں اپنی پرانی کہانی پڑھ رہا تھا جس میں لڑکی بہت خوبصورت تھی، محبت بڑی اداس تھی اور انجام کچھ ایسا تھا اور کچھ ایسا بھی نہیں تھا۔ بڑی ہی نرم نرم، نیم گرم شہد سے بھری کہانی تھی جو شاید نیم بیداری کے عالم میں لکھی گئی تھی۔

اتنے میں میرا لڑکا، عمر چھ سال، قد چھوٹا، نیکر پھٹی ہوئی آنکھیں چمکتی ہوئیں، اچھل کر میرے بستر پر آ گیا اور بڑی بے قراری مگر چاؤ بھرے انداز میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

''میرا خزانہ دیکھو گے؟''

''خزانہ''۔

''ہاں''اس نے کہا''بالکل نیا خزانہ ہے، دیکھو گے؟''

میں نے کہا۔''دکھاؤ، دیکھیں گے۔ لیکن تمہارا پہلا خزانہ کیا ہوا؟''

لڑکے نے کہا:''وہ میں نے مالی کے لڑکے بجو کو دے دیا۔'' اتنا کہہ کر لڑکے نے اپنی بند جھولی میرے سامنے کھول دی۔ سب سے پہلے اس نے ایک ماچس کی ڈبیہ نکالی، اس ڈبیہ کو اس نے یوں کھولا جیسے تماشا شروع ہونے سے پہلے اسٹیج سے پردہ ہٹایا جاتا ہے۔ جب پردہ ہٹ گیا تو میں نے دیکھا کہ ماچس کی ڈبیہ کے اندر کانچ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے چھوٹے

بڑے ٹکڑے اکٹھے کیے ہوئے تھے۔

''یہ کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

لڑکے نے میرے طرف دیکھا گویا اسے میری بے وقوفی پر افسوس ہو رہا ہو۔مگر اس کی نگاہ میں تیکھا پن تھا۔میرا لڑکا مجھے شفقت سے سمجھاتے ہوئے بولا۔''دیکھو یہ موتی ہیں''۔

''موتی ہیں''

''ہاں،ممی کی چوڑیوں سے بنائے ہیں''

اس کے بعد اس نے خزانے کی ڈبیہ کو بند کر دیا اور ایک دوسری ڈبیہ نکالی۔اس ڈبیہ میں بہت سے پرانے نب بھرے ہوئے تھے۔زیڈ انک نب سے میں اکثر اپنی کہانیاں لکھتا ہوں اور اکثر ایک کہانی لکھتے وقت تین چار نب استعمال کرتا ہوں اور پھینکدیتا ہوں۔اصل میں مجھے زیڈ انک نب کی تیز دھار پسند ہے۔لکھتے وقت ایسا لگتا ہے۔گویا نب کہانی کے سینے میں اترتا جا رہا ہے۔ہل کی پھالی کی طرح کسی انجان ان دیکھی دھرتی کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔کسان کی فصل کی طرح کہانی بھی دھیرے دھیرے پکتی ہے، پہلے اس میں کونپلیں پھوٹتی ہیں، پھر پودا اونچا ہوتا ہے۔پھر اسے ہوا اور روشنی ملتی ہے۔پھر آسمان کی طرف دیکھتی ہوئی نوکیلے پتوں پر بالیاں سرسراتی ہیں، تب جا کے کہیں محبت کا ایک دانہ پیدا ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی محبت کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں ہوتا اور ساری دھرتی بنجر رہ جاتی ہے۔اس بنجر کہانی کے گھاؤ کو ایک افسانہ نگار سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا۔

لڑکے کی ڈبیہ انہی پرانے نبوں سے بھری ہوئی تھی جس سے میں نے نئی اور پرانی کہانیاں لکھ دی تھیں۔اچھی اور بری کہانیاں جو ازل کی طرح پرانی تھیں اور آج کے انسان کی مانند نئی تھیں۔محبت میں ڈوبی ہوئی کہانیاں، غیظ و غضب سے بھرپور کہانیاں رنگین بجلی کی مانند چمکتی ہوئی کہانی اور بے رنگ پھیکی سیٹھی کہانیاں جیسے بیج اندر سے سڑ جائے اور کہانی کی کوکھ بانجھ ہو جائے۔لیکن یہ سب اپنی محنت کی کہانیاں تھیں۔ان میں میرے خیالات کا درد اور میرے احساس کا پسینہ شامل تھا۔اس لیے میں نے اپنے لڑکے کے خزانے کے قصے کو بڑی

دلچسپی سے دیکھا اور اس سے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

لڑکے کو اب میری حماقت کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ اس لیے مسکرا کر بولا۔ ''اے بھئی یہ نب ہیں''۔

میں نے پوچھا ''ان سے تم کیا کرتے ہو؟''

وہ بولا، کچھ نہیں کرتا۔ میں ان سے کھیلتا ہوں''

''کیسے؟''

وہ بولا ''یہ نب ہیں اور یہ ان کا باپ ہے''

یہ کہہ کر لڑکے نے ماچس کی تیسری ڈبیہ کھولی اور اس میں سے ایک مقناطیس نکالا۔ مقناطیس نے ایک نب کو اپنے پاس بلا لیا جب ایک نب آتا تو پھر آہستہ آہستہ باقی نب بھی ایک دوسرے کی انگلی پکڑے مقناطیس سے لگ کر لپٹ گئے۔

بچے نے ہنس کر دیکھا؟ یہ ان سب کا باپ ہے، یہ نب اس کے بچے ہیں، ایک دوسرے کی انگلی پکڑے قطار میں کھڑے ہیں، سمجھے؟

یکا یک میں سمجھ گیا۔ اتنی کہانیاں لکھنے کے باوجود جو کچھ نہ سمجھ سکا تھا اب سمجھ گیا۔ یوں تو میں جانتا تھا کہ کہانیاں اچھی ہوتی ہیں اور بری ہوتی ہیں۔ وہ لمبی ہوتی ہیں اور چھوٹی ہوتی ہیں، وہ قسم قسم کی ہوتی ہیں لیکن اب تک یہ نہیں جانتا تھا کہ سب کہانیوں کا ایک ہی مقناطیس ہوتا ہے۔ جس کے سہارے وہ خلا میں کھڑی ہو جاتی ہیں اور وہ مقناطیس ہے، انسان! انسان کے بغیر کوئی کہانی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

مجھے اب بچے کے خزانے میں بہت دلچسپی معلوم ہونے لگی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ''آگے دیکھاؤ اور کیا ہے تمہارے پاس؟''

اب لڑکے نے تصویروں کا ایک بنڈل میرے سامنے رکھ دیا۔ پہلی تصویر کسی مہاراجے کی تھی جس کے گلے میں ہیرے جواہرات کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ میں لڑکے سے

پوچھا۔

''یہ بھلا مانس کون ہے؟''

لڑکے نے کہا ''یہ گوتم بدھ ہے''

لڑکے نے شاید اپنی بہن سے کل ہی گوتم بدھ کا نام سنا تھا۔ یہ نام اسے بڑا ہی عجیب اور نیا لگا۔ اس نے جھٹ اس نام کو اس تصویر کے ساتھ چپکا دیا اور میں سوچتا ہوں کیا برا کیا۔ اس ملک میں بچے کیا بڑے بھی آج تک مہاراجوں کو گوتم بدھ کی طرح ''پاک'' صاف، نیک...... دیوتا کے مانند مقدس، سمجھتے ہیں، مجھے کیا پڑی ہے کہ ایک بچے کی غلط فہمی دور کروں، بڑا ہو کر خود ہی سمجھ جائے گا۔

بچے نے ایک اور تصویر نکالی۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت مراٹھی لڑکی ایک پوسٹ آفس میں خط ڈال رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

لڑکے نے کہا ''یہ عورت لیٹر بکس میں خط ڈال رہی ہے اور اس کا گھر لیٹر بکس کے بہت قریب ہے''۔

میں نے کہا ''تمہیں کیسے معلوم کہ اس عورت کا گھر لیٹر بکس کے بہت قریب ہے؟''

لڑکے نے میرے طرف پھر بے رحم نگاہوں سے دیکھا ''دیکھتے نہیں ہو، اس کے پاؤں ننگے ہیں۔ جبھی تو بس گھر سے نکل کر جلدی سے خط ڈالنے چلی آئی ہے۔ دور جانا ہوتا تو چپل پہن کے نہ جاتی؟''

میں نے اپنی خفت چھپانے کیلئے کہا ''ٹھیک ہے، اب اگلی تصویر نکالو؟''

ننھے شرلاک ہومز نے ایک اور تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ اس تصویر میں ایک پنجرا تھا۔ پنجرے میں طوطا تھا۔ طوطے کے پاس ایک خوبصورت عورت بھڑکیلے کپڑے پہنے اپنے زیورات کا ڈبہ کھولے بیٹھی تھی اور طوطے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا ''یہ عورت اس طوطے کی طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟''

بچے نے کہا ''یہ عورت اس طوطے سے پوچھتی ہے بتا میرا موتی کہاں ہے؟''

''کہاں ہے اس کا موتی؟''

بچے نے غور سے اس تصویر کو دیکھا، موتی پنجرے میں نہیں تھا۔ طوطے نے کوٹ نہیں پہنا ہوا تھا ورنہ موتی اس کی جیب میں ہوتا۔ آخر سوچ سمجھ کر بچے نے کہا ''موتی طوطے کی آنکھ میں ہے۔ طوطے نے موتی کو اپنی آنکھ میں چھپا لیا ہے''۔

اب تک میں نے بہت سی ایسی کہانیاں لکھی تھیں جس میں انسان نے اپنی آنکھ میں آنسو چھپا لیا تھا لیکن اس طوطے کی کہانی اب تک میں نے نہیں لکھی تھی جس نے ایک موتی کو اپنی آنکھ میں چھپا لیا تھا۔ جانے کب یہ کہانی لکھی جائے؟ جانے اور کون اسے لکھے گا؟ لیکن یہ کہانی ایسی ہے کہ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی پرانی نہ ہوگی بلکہ طوطے کی آنکھ کی طرح چمکتی رہے گی۔

بچہ اگلی تصویر دکھانے والا تھا کہ اتنے میں اس کی ماں نے آ کر کہا ''ننھے اٹھو! نو بجنے والے ہیں، تمہیں اسکول جانا ہے''۔

ننھے کو جھٹکا سا لگا، مجھے بھی لگا۔ ہم ایسی خوبصورت دنیا میں تھے جہاں اسکول کا نام لینا بھی گناہ تھا اور سکول بھی کیسا اسکول تنگ کمرے، اندھیرے دالان، غریبی کی تلخ یادوں کا مارا ہوا مفلس ماسٹر اور اس کی نفرت اور غصے پر بھرپور چھڑی...... یہ نفرت جو کہیں دور سے آتی تھی، لیکن اترتی ہمیشہ بچوں پر تھی۔

ننھا سہم گیا۔

میں بھی سہم گیا۔

لیکن کیا کیا جائے، مجبوری تھی، اسکول جانا بھی ضروری تھا۔ بچے نے میری طرف دیکھ کر بے بسی سے کہا۔

''اسکول......اسکول نہ جاؤں تو کیا ہوگا؟''

''ماں نے کہا ''تم اسکول کیوں نہ جاؤ گے؟ آج چھٹی نہیں ہے'' بچے نے پوچھا

''آج کیوں چھٹی نہیں ہے۔ کل بھی چھٹی تھی، پرسوں بھی تھی۔ آج کیوں نہیں ہے؟''

میں نے کہا ''روز روز چھٹی نہیں ہوتی''

وہ بولا ''کیوں نہیں ہوتی؟''

ماں نے اسے میری گود سے اٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا۔

''ہوں...... اب سیدھے اسکول چلے جاؤ...... بہانے نہ بناؤ''

لڑکے نے اپنے سامنے دو بے رحم انسانوں کو دیکھا۔ ہمارے چہروں پر اسے کہیں وہ رنگین تتلی دکھائی نہ دی۔ نہ وہ لمبے لمبے کانوں والا خرگوش، نہ ننگے پاؤں گھومنے والی مراٹھی لڑکی...... اس نے بڑی اداسی سے ہمارے دو چہروں کی بے رحمی کو پڑھ لیا اور مایوس ہو کر اپنا بستہ باندھنے لگا۔ اور اس بستے میں ایسی ہی کتابیں تھیں جو ہمارے چہروں کی طرح سخت اور بے رحم تھیں۔ بچہ بہت کچھ چاہتا ہے، وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن اسے بہت کچھ نہیں ملتا کیونکہ وہ بچوں کی دنیا میں ہے۔ یہ بوڑھوں کی دنیا ہے اور بے ایمان، بدکار، بدمعاش لوگوں کی دنیا ہے جس کے منہ میں دانت ہے نہ پیٹ میں آنت۔ وہ بچہ اپنی تصویروں میں اس دنیا کو ڈھونڈتا جو بچوں کی طرح مسکرا سکے۔ اس لیے بچے نے چپ چاپ بستہ باندھ لیا، بغل میں دبا لیا، اپنے خزانے کی اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا اور ہماری طرف دیکھے بغیر پڑھنے کے لئے چلا گیا۔

بچے کا اسکول گھر کے بہت قریب تھا۔ گھر سے اسکول تک آدھا فرلانگ سے بھی کم سڑک ہو گی۔ جس کے ایک طرف امیر آدمی کے بنگلے کی لمبی چار دیواری چلی جاتی تھی اور دوسری طرف گل مہر کے پیڑوں کی قطار تھی۔ ان دونوں کے بیچ کی سڑک پر میرا لڑکا چپ چاپ سر جھکائے ہوئے اسکول جا رہا تھا کہ میں نے ایک پیڑ کے پیچھے سے نکل کر اس کا راستہ روک لیا۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھ۔ اس سے دھیرے سے کہا ''آؤ اسکول سے بھاگ چلیں''۔

اسکول سے بھاگنے کی بات ابھی تک بچے کے ذہن میں نہ آئی تھی، یکا یک اس کا چہرہ اس خیال کی روشنی سے بھر گیا۔ یہ روشنی اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی۔ اس کے اداس

رخسار پھول کی طرح کھل گئے۔ میں اس کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیرت اور پھر امید اور خوشی سے بھرپور راگ سن رہا تھا۔ بچے کا خاموش چہرہ بھی خوشی کے کیسے کیسے گیت گاتا ہے۔

اس نے اچھل کر میری انگلی پکڑ لی۔ پھر چلتے چلتے یکایک رک گیا، میری طرف سنجیدگی سے دیکھ کر بولا ''ماں سے نہیں کہو گے؟''

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا ''شش......''

ڈھاک کے ایک پیڑ کے آگے جہاں بہت سے بیروں کے جھنڈ تھے وہاں ہم نے بستے کو اچھی طرح چھپا دیا اور پھر ہم گھوم کر ایک تنگ سی پگڈنڈی پر ہو لیے۔ جو جنگل سے دور ناریل کے ایک جنگل میں سے گزرتی تھی۔

اس دن ہم بہت گھومے، وہ صبح بہت صاف اور چمکیلی تھی، جنگل میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ ایک طرف ہلکی ہلکی ہرے رنگ کی ٹھنڈی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ننگے پاؤں دھرتی پر چل رہے تھے، کیونکہ میں بھی مراٹھی لڑکی کی طرح جلدی سے ننگے پاؤں ہی گھر سے بھاگ آیا تھا۔ بہت دنوں بعد آج میرے ننگے پاؤں دھرتی پر چل رہے تھے اور بچپن کے پرانے جانے پہچانے کنکر میرے پاؤں سے گلے مل رہے تھے۔ میرے پاؤں میں ایک عجیب خوشی کا احساس رچتا گیا اور میں اپنے بچے کو ساتھ لیے جنگل میں دوڑتا گیا۔

بچے کو جنگل کی مسرت بخش روشنی بے حد پسند آئی، بولا

''یہاں دن ہے؟''

میں نے کہا ''ہاں دن ہے''

''ہمارے گھر میں بھی دن ہے؟''

میں نے کہا ''ہمارے گھر میں بھی دن ہے اس وقت سب کے گھروں میں دن ہے''۔

اس نے کہا ''دن میں رات نہیں ہوتی؟''

میں نے کہا "بنگلے دن میں رات نہیں ہوتی"

لڑکے نے ضد سے پوچھا "تھوڑی سی بھی نہیں ہوتی؟"

میں نے پریشان ہو کر کہا، کیا فضول سوال کر رہے ہو۔ بھلا دن میں کیسے رات ہو سکتی ہے"۔

لڑکے نے کہا، "اس وقت دن ہے تو ہمارے مالی کے گھر میں رات کیوں ہے؟"

میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور مجھے اپنے بنگلے کے باہر مالی کا جھونپڑا یاد آیا جہاں دن کو بھی رات ہوتی ہے اور دوپہر میں بھی اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور مجھے مالی کا گھر اور بہت سے دوسرے گھر یاد آئے جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا ہے اور پھر مجھے فلک بوس عمارتیں یاد آئیں جہاں رات کو بھی دن ہوتا ہے۔ ایسے گھر جہاں تھوڑا سا دن اور لمبی سی رات ہوتی ہے۔ ایسے گھر جہاں تھوڑی سی رات ہوتی ہے اور لمبا سا دن ہوتا ہے۔ شاید یہ بچہ سماجی تجزیہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر بچہ ارسطو اور افلاطون نہیں ہوتا تو وہ ان فلسفیوں کی طرح بھی نہیں ہوتا جو دن میں رات اور رات میں دن کی عجیب و غریب تاویلیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک بچے کو کسی طرح مطمئن نہیں کر سکتے جو دن میں رات اور رات میں دن دیکھتا ہے اور اس تضاد پر تعجب سے چپ رہ جاتا ہے۔

میں بچے کو سوال کا جواب نہیں دے سکا کیونکہ میرا جواب بہت لمبا تھا اور میرا بچہ بہت چھوٹا تھا اور سامنے اب چھوٹی سی ایک ندی آ گئی تھی اس لئے میں نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اسے ندی کے پار ایک اونچے ٹیلے پر لے گیا جہاں ایک چرواہا بہت سی گائے بھینسوں کو چرا رہا تھا۔ بچے نے ایک دو گائے بھینسیں تو ضرور دیکھی تھیں۔ مگر اتنی ساری گائے بھینسیں آج پہلی بار دیکھی تھیں۔ اس لئے پہلے تو وہ بڑی حیرت سے ان کو تاکتا رہا اور بولا،

"یہ سب گائے بھینسیں ہیں؟"

"ہاں"

"او وہ کیا ہیں؟"

''وہ بکریاں ہیں''؟

''بکریاں''

''ہاں''

''اور وہ کیا ہیں؟''

''وہ بھیڑیں ہیں''

''بھیڑیں؟''

''ہاں''

میں نے بچے کا تعارف دو تین ننھے منے بکری اور بھیڑ کے بچوں سے کرا دیا۔ بچہ ان سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے ایک بچھڑے کو گائے کے تھن سے دودھ پیتے دیکھا، بچہ سمجھ گیا بولا ''یہ ماں کا دودھ پیتا ہے''

میں نے کہا ''ہاں''

بچے نے پوچھا اور جو ہمارے گھر دودھ آتا ہے، وہ کہاں سے آتا ہے؟''

''انہیں گائے بھینسوں کا دودھ ہوتا ہے''۔

اس دودھ کو یہ لوگ بچھڑے کے منہ سے نکال لیتے ہیں؟''

میں نے ''منہ سے نہیں نکالتے، دودھ سے دوھ لیتے ہیں''۔

''کیسے دوھ لیتے ہیں؟''

میں نے چرواہے کو چونی دی اور اس نے ایک گائے کو دوھ کر دکھایا۔ نہ صرف دودھ دھوکر دکھایا بلکہ اس نے بچے کو اپنی گود میں اس طرح بٹھالیا جس طرح وہ گائے دوہتے وقت مٹکی کو اپنے گھٹنوں میں رکھتا ہے۔ پھر اس نے گائے کے تھن کی دھاریں بچے کے منہ میں ڈالیں۔ بچے کو بہت لطف آیا اور جب دودھ کی دھار غلطی سے بچے کے چہرے پر بکھر گئی تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس نے مجھے دھیرے سے کہا ''بڑا ہوکر اسی طرح میں بھی چرواہا ہوں گا۔'' تھوڑی دیر بعد ہم چرواہے کو بہت پیچھے چھوڑ آئے، اب وہاں پہنچ گئے جہاں سے سمندر نزدیک تھا اور ایک چھوٹا لڑکا جو میرے لڑکے سے پانچ چھ سال بڑا ہوگا بڑے اطمینان سے کیچڑ اور پانی میں

کھڑا ہو کر کیکڑے سے پکڑ رہا تھا۔ بچے کو کیکڑے پکڑنے والے بچے کی بہادری بہت پسند آئی۔ کتنے اطمینان سے وہ کیکڑے کو اپنے ہاتھ میں اٹھا لیتا تھا۔ اس کے سامنے کے دو بازو الگ کر کے انہیں توڑ توڑ کر وہاں سے دھاگے باندھ کر اپنی جھال والی بھوری پیٹی میں ڈال دیتا تھا۔ میرا لڑکا بڑے انہماک سے اس کام کو دیکھتا رہا اور جب وہاں سے چلے اور بہت دور آگے نکل گئے تو لڑکے نے ٹھنڈی سانس بھر کر مجھ سے کہا ''میں بھی بڑا ہو کر کیکڑے پکڑوں گا''۔

جنگل میں گھومتے ہوئے نئے نئے پیڑوں، پھولوں تتلیوں سے متعارف ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک پرانے مندر کی سیڑھیوں پر جا بیٹھے۔ یہ بہت پرانا مندر تھا اور اس کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہمیں پتھر کا ایک بہت بڑا بیل دکھائی پڑا جو مندر کے باہر بیٹھا تھا۔

لڑکے نے کہا ''یہ بیل ہے نا؟''

''ہاں''

''یہاں کیا کر رہا ہے؟''

میں نے کہا ''مندر کے سامنے آرام کر رہا ہے''۔

''یہ مندر ہے؟''

''ہاں''

''مندر کیا ہوتا ہے؟''

''مندر میں پوجا ہوتی ہے''

''پوجا کیا ہوتی ہے؟''

میں چپ ہو گیا۔ اسے کیا بتاتا کہ پوجا کسے کہتے ہیں کیونکہ بھگوان اور خدا کا خیال تو بہت بعد کی چیز ہے۔ پہلے تو بچہ دودھ پیتا ہے، ماں کا چہرہ دیکھتا ہے، گھٹنوں کے بل چلتا ہے اور پھر بولنا شروع کرتا ہے۔ پہلا لفظ جو ہو سکتا ہے وہ ابا اور ماں اور پانی اور روٹی کے کھلونے کے نام ہوتے ہیں اور بھائی بہنوں کے پیار ہوتے ہیں۔ اس ننھے چھوٹی سی پیاری دنیا میں پوجا اور بھگوان کا خیال نہیں کھپتا۔ اس لئے میں بچے سے کہا۔

''مجھے بھی نہیں معلوم، لیکن آؤ اندر چلکر دیکھیں پوجا مندر میں کیسے ہوتی ہے؟''

ہم مندر کے اندر چلے گئے۔

مندر کی ٹوٹی پھوٹی عمارت کے اندر بہت سی مورتیاں ٹوٹی پڑی تھیں، بندروں کی مورتیاں اور ہاتھی گھوڑوں کی مورتیاں، یہ مورتیاں بے حد خراب حالت میں دیواروں کے آس پاس پڑی تھی اور اب ان پر جھاڑیاں بھی اگ آئی تھیں۔ مندر کے وسط میں جہاں بڑی مورتی کو ہونا چاہیے تھا وہاں صرف پتھر کا ایک کنول پھول باقی رہ گیا تھا۔ جس کے گھیرے کے اندر چڑیوں نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس گھونسلے کے اندر تین بڑے ہی خوبصورت انڈے رکھے ہوئے تھے۔ نازک نازک پیلے رنگ کے تین انڈے جن پر جامنی رنگ کے دھبے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔

بچے نے خوشی سے چلا کر ایک انڈے کو ہاتھ میں اٹھایا۔ بچہ بے حد خوش تھا وہ خوشی سے اچھل رہا تھا اور انڈے سے پیار کر رہا تھا۔ وہ کبھی اسے چومتا، کبھی گال سے لگاتا اور کبھی خوش ہو کر میری طرف دیکھتا، گویا اسے دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اس کی خوشی مجھ تک پہنچی اور میرا دل بھی ایک عجیب مسرت وانبساط سے بھر گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بچے نے اس انڈے کو اٹھا کر اپنی نیکر کی جیب میں ڈال لیا۔ اب دوسرا انڈا اٹھانے لگا کہ میں نے روک دیا۔

''کیوں؟'' لڑکے نے پوچھا

''یہ انڈے ہمارے نہیں ہیں، یہ انڈے اس مندر کے ہیں''۔

لڑکے نے دریافت کیا ''یہ پوجا کے انڈے ہیں''

''ہاں'' میں نے خوش ہو کر کہا ''یہ پوجا کے انڈے ہیں''

ان انڈوں کو گھونسلوں میں رکھ دو۔ پھر ایک چڑیا یہاں گاتی ہوئی آئے گی اور ان انڈوں کو اپنے پروں میں سمیٹ لے گی اور پھر وہ گیت گائے گی اور گیت گائے گی......اور گیت گائے گی اور مندر کی ٹوٹی ہوئی چھت سے آسمان مسکرائے گا۔ پھر اس کے پروں کا دامن پیار کی سنہری خوشی سے بھر جائے گا''۔

بچے نے خوش ہو کر کہا ''تب پھر پوجا پوری ہو جائے گی؟''

''ہاں پوجا پوری ہو جائے گی''۔

بچے نے خوش ہو کر انڈوں کو واپس گھونسلے میں رکھ دیا۔ اسے یہ پوجا بہت پسند آئی تھی۔ مجھے بھی اصل میں آج ہی معلوم ہوا کہ پوجا صرف بھگوان کو نہیں کہتے، پوجا ماں کو کہتے ہیں اور تخلیق کے عمل کو کہتے ہیں اور زندگی کے پیار کو کہتے ہیں۔

بچہ چلتے چلتے تھک گیا اور پھر میں نے اسے اپنی بانہوں میں اٹھا لیا اور چلتے چلتے اسے پریوں کے دیس کی ایک خوبصورت سی خواب کی مانند دھندلی دھندلی کہانی سنانے لگا۔ جسے سنتے سنتے بچہ میرے شانے سے لگ کر سو گیا۔

پھر واپس آ کر میں نے بیری کے جھنڈ سے اس کا بستہ اٹھا لیا اور بازوؤں کے نیچے کر کے میں نے اپنے سوئے ہوئے بچے کا پر امید چہرہ دیکھا اور اس کے بھولے چہرے میں مجھے اپنا عکس نظر آیا اور وہ دن یاد آیا جب میں اس طرح ایک اندھیرے سے اسکول اور ایک ظالم استاد کے ڈر سے اسکول سے بھاگا تھا اور پھر مجھے اپنی زندگی کی بہت سی تلخ باتیں یاد آئیں جن کے گنجان پر خار راستوں سے گزر کر لاکھوں بچوں کے پاؤں چھلنی ہو چکے تھے۔ وہ دن رات کی طرح کالے تھے۔ وہ موتی جسے لالچی طوطے نے اپنی آنکھوں میں چھپا لیا تھا اور وہ تصویر جنہیں کوڑھ کے مارے ہاتھوں نے دھبے دار بنا دیا تھا۔ کتنی ہی لمبی تلخ کہانیاں تھیں جو بچپن کے چہروں پر لکیروں اور جھریوں کا ایک لمبا جال پھیلاتی چلی گئی تھیں۔

کہتے ہیں کہ پریوں کے دیس میں ہر ایک کی خواہش پوری کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو میں اس پریوں کے دیس کے بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس بچے کی کہانی ہماری نسل کی کہانی سے مختلف ہو۔ اس کی کہانی ایک ایسے زمانے کی ہو جس میں بچہ اپنا چہرہ دیکھ سکے اور بچوں کی طرح مسکرا سکے۔

اس کے بعد میں اپنے خوابیدہ بچے کو چوم لیتا ہوں اور اسے کندھے سے لگا کر گھر کی جانب چل دیتا ہوں۔

آج آسمان بہت نیلا ہے اور میرے سر کے اوپر گل مہر کے پھول ہیں۔

◆◆◆

پھانسی کے سائے میں

زندگی کے آخری لمحے کیوں برے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ محض جینا ہی کافی ہے۔ محض جینا ہی خوبصورتی ہے...... مجھے فیروز ڈاکو کے آخری لمحے یاد آتے ہیں۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا، اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دوست کے ہاں رام گڑھ جا رہا تھا۔ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بہت بھیڑ تھی، بڑے بمشکل سے مجھے کھڑے ہونے کی جگہ ملی، لمبا سفر تھا کئی گھنٹے اسی طرح کھڑے کھڑے گزر گئے، میرے قریب کی بنچ پر دو ننھی ننھی لڑکیاں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا بھائی جس کی عمر بمشکل آٹھ نو سال کی ہوگی، ان سے پرے ان کی ماں، بیٹھی تھی۔ اس سے پرے پھر دو لڑکے بیٹھے تھے ان کے کپڑے صاف تھے اور سر پر چھوٹی چھوٹی ململ کی ٹوپیاں، ان کے ساتھ ان کی ماں بیٹھی تھی، ادھیڑ عمر کی لالائین، جس نے ایک میلے رنگ کی ریشمی دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا گول چہرہ متین اور غمگین نظر آتا تھا۔ دونوں لڑکے سمٹ کر الگ بیٹھے تھے اور کبھی کبھی ان دو ننھی ننھی لڑکیوں کی ماں کو دیکھ لیتے، ان کے چہروں پر غم وغصہ اور خوف کے جذبات ہویدا ہو جاتے تھے اور پھر وہ اپنا چہرہ پرے کر لیتے اور اپنی ماں کا آنچل پکڑ لیتے ننھی لڑکیوں کی ماں کا چہرہ فق تھا اور بار بار اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے اور وہ انہیں کالے رنگ کے کھدر کے دوپٹے سے پونچھ لیتی اور پھر کھڑکی سے دیکھنے لگتی، اس کا لڑکا اپنی ننھی بہنوں کو میٹھے نوسو اور کھٹے کچالو اور گنڈیریاں راستے کے مختلف اسٹیشنوں سے خرید کر

کھلاتا تھا اور لائن کے لڑکے اسے گھور کر دیکھتے اور پھر اپنی ماں سے کسی چیز کی فرمائش کرتے اور پھر لالائین آہستہ سے جھک کر سیٹ کے نیچے سے ایک ٹوکری کا ڈھکنا الگ کرکے سیب یا سنگترے یا کیلے نکال کر اپنے بیٹوں کو دیتی اور مزے سے پھل کھانے میں اور اسے دکھا دکھا کر کھانے میں مصروف ہو جاتے۔

ابھی رام گڑھ بہت دور تھا اور میں کھڑا کھڑا تھک گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے قریب کے بنچ پر بیٹھی ہوئی ننھی لڑکی سے التفات ظاہر کیا۔ اسے ایک دو اسٹیشنوں سے کھانے کیلئے چیزیں بھی خرید کر پیش کیں، بڑی پیاری ننھی سی لڑکی تھی۔ وہ بہت جلد میری گود میں آ گئی اور میں آرام سے اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس نے میری ناک سے کھیلتے ہوئے کہا ''تم'' کدھل جا رہے ہو''

میں نے کہا ''رام گڑھ جا رہا ہوں''

ننھی نے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہا ''اماں! یہ رام گڑھ جا رہا ہے''۔

ننھی کی ماں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب بیٹھی ہوئی لالائین اور اس کے دونوں لڑکوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر کسی نے مجھ میں دلچسپی لینا مناسب نہ سمجھا۔ صرف میری گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی ہی مجھے حیرت کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ حیرت اور خوشی، میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم دونوں رام گڑھ جا رہے تھے۔

میں نے اس سے پوچھا ''تمہارے ابا کا نام کیا ہے؟''

وہ بولی ''فیروز''

میں نے پوچھا۔ تمہارے ابا رام گڑھ میں ہیں؟''

وہ بولی ''ہاں ابا دیل میں ہیں''

''دیل ہیں؟'' میں نے پھر پوچھا۔ اس کی بات سمجھ میں نہ آئی تھی، اب دو چار اور لوگ بھی ہماری گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

''ہاں۔ رام گڑھ دیل میں؟ کل ان کو پھانسی ہو گی! لڑکی نے نہایت اطمینان سے

گنڈیری چوستے ہوئے جواب دیا۔

''جیل؟ پھانسی؟''

یکا یک جیسے سارے ڈبے میں سناٹا چھا گیا میں نے لڑکی کی اماں کی طرف دیکھا لیکن اس نے اپنا چہرہ اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا تھا اور سسکیاں لے رہی تھی، اس ڈبے کی خاموشی میں وہی سسکیاں پھیلتی جارہی تھیں۔ لالائن نے اپنے دونوں بچوں کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ سب لوگ خوفزدہ سے ہوگئے تھے، جیسے اس چلتی گاڑی میں کسی نے پھانسی کا تختہ ان کے سامنے کھڑا کردیا تھا اور اپنی گردن اسی رسی میں دیکھ رہے تھے۔

''اماں، ابا کی پھانسی نا'' ''لڑکی نے بڑے چاؤ سے اپنی ماں سے پوچھا۔

اماں نے فوراً اسے میری گود سے چھین لیا اور زور سے ایک طمانچہ رسید کیا اور پھر اسے اپنے کالے دوپٹے میں چھپا لیا۔ لڑکی بہت دیر تک اس کالے دوپٹے میں روتی رہی۔ لالائن اور اس کے بیٹے پرے سرک گئے، فرش پر دو کسان بیٹھے تھے وہ بھی رام رام کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور دور ڈبے کے دوسرے کنارے پر جا کر کھڑے ہوئے، اس عورت اور اس کی دو لڑکیوں اور اس کے لڑکے کے ارد گرد گاڑی کے مسافروں نے ایک نظر نہ آنے والی چار دیواری کھڑی کر دی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ صرف اس چار دیواری کے اندر فیروزا اور اس کی بیوی اور اس کے بچے اکیلے رہ گئے تھے اور ایک اجنبی ایک طرف دروازے کی دہلیز پر کھڑا تھا اور گاڑی چل رہی تھی۔

اس رات رام گڑھ سے دس میل باہر میرے دوست نے ایک دعوت کا انتظام کیا تھا۔ چاندنی میں سیاہی اور سیاہی میں چاندنی گھلی ہوئی تھی، ایسی رات عجیب پراسرار ہوتی ہے، زندگی کسی نہ معلوم راستے پر دوڑنا چاہتی ہے اور اپنے عزیز ترین دوستوں کے چہرے بھی اجنبی معلوم ہوتے ہیں، اس محفل رقص و سرور میں مجمع بھی عجب تھا عورتیں بھی اس دیس کی معلوم نہ ہوتی تھیں، یہ ہنسی بھی فطری نہ تھی، نجانے غم کا ہلکا سا غبار مجھے فضا میں تیرتا ہوا کیوں معلوم ہوتا تھا۔

میرے دوست نے پوچھا ''تم چپ کیوں ہو؟''

''تھکا ہوا ہوں شاید؟''

''اس لڑکی کا رقص تمہیں پسند نہیں''

''مجھے نیند آ رہی ہے''

میرا خیال ہے، میں وہیں اس گاؤ تکیئے سے سہارا لگائے سو گیا۔ سوتے وقت صرف اتنا یاد ہے، کہ زبان پر شراب کا ہلکا میٹھا، ہلکا تلخ ذائقہ باقی تھا، لڑکی ناچ رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی صدا میں اس کی جوان آواز پگھل پگھل کر کہہ رہی تھی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا۔

میرے دوست نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ موٹر بھاگتی جا رہی تھی۔ غالباً محفل رقص ختم ہو چکی تھی اور ہم واپس رام گڑھ جا رہے تھے فضا میں ایک اجلا پن آ رہا تھا اور بہت سے تاروں کے رنگ مانگ پڑ گئے تھے۔ لیکن دو ایک تاروں کے رنگ نکھر رہے تھے، یکا یک ایک تارہ بہت ہی روشن اور حسین نظر آنے لگا۔ دور کہیں مرغ بولا۔ اور پھر گھڑیال نے پانچ بجائے۔

میرے دوست نے کہا ''مجھے کیا معلوم تھا تم اتنے تھکے ماندے رام گڑھ پہنچو گے، میں نے دعوت تمہاری خاطر منعقد کی تھی اور تم سوتے رہے''۔

میں نے جمائی لے کر کہا۔ ''بھئی معاف کرنا۔ میرے پاس پیسے بالکل نہیں تھے کمبخت کبھی نہیں ہوتے تھرڈ میں آیا اب تم ہی بتاؤ......''

''تھرڈ میں؟ لاحول ولا۔ بھئی ریس اندھا دھند نہ کھیلا کرو''۔

''کون چغدر ریس کھلتا ہے، وہ تو یوں سمجھو کہ......اچھا تو یہ بتاؤ کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟

''جیل خانے میں''

''جیل خانے میں؟''

''ہاں تمہیں ایک عجیب تماشہ دکھلائیں گے۔ کبھی پھانسی دیکھی ہے تم نے؟''

ٹن''

گھڑیال کی آخری گونج میرے خون کی مدھم روانی میں مل گئی اور پھر اس نے میرے خون کے ذرے کو چونکا دیا، ٹن ٹن ٹن، میرے خون کا ہر ذرہ اس صدا سے گونجنے لگا اور روانی بڑھتی گئی اور مجھے اپنا گلا گھٹا معلوم ہوا میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن خون خود بول رہا تھا۔ اس نے مجھے بولنے نہ دیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنا حلقوم سہلانے لگا۔

''شوفر تمہیں معلوم ہے۔ پھانسی کس وقت دی جائے گی''

''ساڑھے پانچ بجے حضور''

''گاڑی تیز چلاؤ''

ساڑھے پانچ میں چند منٹ باقی تھے۔ جب ہم جیل خانے کے پھاٹک کے اندر داخل ہوئے اور کار کو گھما کر اس طرف لے گئے، جہاں پھانسی کھڑی تھی، جہاں جیل کے ملازمین، ڈاکٹر اور چند افسر لوگ جمع تھے، ایک چھوٹے سے میدان میں پھانسی کھڑی تھی۔ دو لمبے لمبے سیاہ کھمبے ایک اندھے کنوئیں کے دونوں طرف کھڑے تھے اور اس اندھے کنوئیں کے اوپر لکڑی کا ایک تختہ بچھا تھا، اس پر بھی سیاہ رنگ کیا ہوا تھا، اور دونوں کھمبوں کے درمیان جو دو لوہے کے تار تھے ان کا رنگ بھی سیاہ تھا اور ان دونوں میں ڈیڑھ دوفٹ کا فاصلہ تھا یہ دونوں تار ایک دوسرے کے متوازی دونوں کھمبوں کے بیچوں بیچ چلے جاتے تھے، میدان کے چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں۔ جن کے اوپر کانچ کے تیز ٹکڑے لگے تھے اور ان سے پرے شمال مشرق میں پہاڑوں کی چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آتی تھیں۔ آسمان اب ابر آلود ہو گیا تھا۔

ہم بھی ڈاکٹر کے پاس کھڑے ہو گئے، وزیر صاحب کے لڑکے کو دیکھ کر دو ایک افسروں نے ہمیں سلام کیا چہرے دھندلے دھندلے نظر آتے تھے، قریب کی دیوار کا سایہ ایک سیاہ لبادے کی طرح تماشائیوں کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے۔ چند لوگ سگریٹ پی رہے تھے۔ سگریٹ کا دھواں اور گرم گرم سانس کا دھواں فضا میں بل کھاتا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے آسمان پر روشن ستارے کو ڈھونڈا جیسے بچہ خواب میں ڈر جانے پر اپنی ماں کی چھاتی ڈھونڈتا ہے، لیکن مطلع ابر آلود ہو چکا تھا اور اب تو ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی، کالی کالی دو چار چھتریاں کھل گئیں، لیکن بارش بالکل معمولی سی تھی، جیسے ہلکی ہلکی اوس گر رہی ہو۔ ستارہ کہیں نظر نہ آیا۔

میں نے ناامید ہو کر اپنے دوست سے کہا۔

''چلو چلیں''

وہ بولا۔ ''بزدل ہو، یہ منظر تمہیں زندگی بھر اور کہیں دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

کہیں لوہے کا ایک پھاٹک کھلا، پھر سفید اجلے کپڑے پہنے ہوئے ایک درمیانے قد کا آدمی پھانسی کی طرف چلتا ہوا نظر آیا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور چہرے پر چھدری سی داڑھی تھی۔ وہ بالکل ہمارے قریب سے گزرا۔ اس کا چہرہ سپید اور ستا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پیچھے پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے قریب ایک لمحہ کیلئے رکا اور اپنے پہرہ داروں سے مخاطب ہو کر پھانسی کے کالے کھمبوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''وہ آ گئی میری جان لینے والی''

اس کی مسکراہٹ میں کسی مردنی تھی، اس کی آواز کیسی تھی تھرتھراہٹ تھی، جیسے اس زندہ جلد میں ہوتی ہے، جسے چھری کی تیز دھار ذبح کرتے وقت چھوئے۔ اس کی چال میں سستی اکھڑی اکھڑی سی جھجھک تھی، جیسے وہ اپنی ٹانگوں سے نہیں لکڑی کی ٹانگوں سے چلتا ہو۔ پھر بھی وہ بہادر آدمی تھا، دلیر آدمی تھا اور بغیر کسی سہارے کے پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا اور خدا کا نام لینے لگا، بلند، صاف تیقن آمیز آواز میں......

وہ کس طاقت کو بلا رہا تھا؟

میں نے اپنے دوست سے پوچھا ''جلاد کہاں ہے؟''

جیسے میرے سوال کا جواب دینے کیلئے ایک آدمی ایک لمبا سفید کوٹ اور پتلون اور سیاہ بوٹ پہنے ہوئے آگے بڑھا اور پھانسی کی طرف چلتا گیا۔ اس کے سر پر سفید پگڑی تھی، اس

کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا ہی تھا۔ وہ سیدھا دائیں ہاتھ کے کھمبے کے قریب کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا ہاتھ لوہے کی پھرکی پر رکھ دیا۔ جس پر ریشمی ڈوری بندھی تھی ہاتھ میں ایک سفید کپڑے کا غلاف تھا۔

میرے دوست نے کہا۔ پرانے زمانے گئے آج کل تو جلاد بھی بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں کسی قاتل کو خون معاف کر دیا جاتا تھا اور وہ اس کے عوض میں سرکاری جلاد بنا دیا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قاتل کو اسی لیے معاف کیا جاتا تھا۔ اسی شرط پر کہ وہ سرکاری جلاد بن جائے۔

''اور اب'' میں نے پوچھا۔

''اب معاملہ دوسرا ہے، اب تو قانون اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ محض جلاد بنانے کیلئے کسی کا خون معاف کر دیا جائے اور عام طور پر لوگ جلاد کے پیشے کو...... میرا مطلب ہے، اچھا نہیں سمجھتے''

''وہ کیوں؟ ہم قتل کرنا پسند کرتے ہیں اور پھر اگر کوئی قتل کرے اسے پھانسی کی سزا بھی دیتے ہیں۔ پھر جلاد کے پیشے میں کیا برائی دیکھتے ہیں۔ کیا کہیں انسانی ضمیر کے اندر کوئی پھانس رہ جاتی ہے''۔

''جلاد کے پیشے کیلئے ہمیں امیدوار نہیں ملتے، درآنحالیہ ریاست میں اس کے لئے تنخواہ بھی اور ترقی کا انتظام بھی خاطر خواہ موجود ہے، پھر بھی...... جلاد بننے کیلئے کوئی راضی نہیں ہوتا اور اب تو جلاد کا کام بھی اس قدر آسان ہو گیا ہے۔ بس چند لمحوں کی بات ہے''۔

میرا دوست کہہ رہا تھا۔ اب فیروز کی پھانسی کیلئے بھی کوئی جلاد نہیں ملتا تھا۔ بہتیری کوشش کی۔ آخر یہ آدمی راضی ہوا۔ یہ اسی جیل میں کمپونڈر ہے۔ دو ایک مرتبہ خود بھی رشوت ستانی کے جرم میں قید ہو چکا ہے۔ مریضوں کو پیٹنے میں بڑی مہارت رکھتا ہے اور زخموں کی چیر پھاڑ میں تو اس کا مقابلہ اور کوئی کمپونڈر نہیں کر سکتا''۔

یکا یک فیروز نے کہا ''میرے تار کا کوئی جواب آیا؟''

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ’’مجھے افسوس ہے، فیروز تمہارے تار کا کوئی جواب نہیں آیا‘‘۔

رحم کی آخری درخواست بھی ٹھکرا دی گئی تھی۔

’’تم اپنے بیوی بچوں سے مل سکتے ہو‘‘

یکا یک لوہے کا دروازہ پھر کھلا اور دو عورتیں اندر داخل ہوئیں دونوں کے ساتھ بچے تھے، دو ننگی لڑکیاں اور ایک لڑکا اور ایک کالا دوپٹہ اوڑھے ہوئے عورت، دوسری عورت کے ساتھ دو لڑکے تھے۔ جنہوں نے چھوٹی چھوٹی سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ دو پلی ٹوپیاں۔

دائیں کھمبے پر کالے دوپٹے والی عورت کھڑی ہوگئی، بائیں کھمبے پر وہ لالائین اور اس کے لڑکے۔

’’یہ کیا تماشا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

میرے دوست نے جواب دیا۔ ’’وہ لالائین مقتول مہاجن کی بیوی ہے وہ اس کے دونوں لڑکے ہیں‘‘۔

فیروز نے ہنس کر کہا۔ ’’چھوٹے شاہ جی، اپنے باپ کے قاتل کو پھانسی دیکھنے آئے ہو‘‘۔

میں نے کہا۔ ’’انتہائی ظلم ہے، ان لوگوں کو یہاں نہیں آنے دینا چاہیے تھا‘‘۔

’’میرا دوست بولا۔ ’’پہلے تو اس ریاست میں کیا ساری دنیا میں سر بازار پھانسی دی جاتی تھی۔ تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو‘‘۔

’’چھوٹے شاہ جی کا اب کلیجہ ٹھنڈا ہوگا‘‘۔ فیروز نے تلوار کی دھار کی طرح تیز لہجے میں کہا۔

دائیں طرف اس کی بیوی اپنے بچوں کیلئے کھڑی تھی۔ لیکن فیروز نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ بس وہ عورت اس کی طرف تکتی گئی، اور فیروز لالائن اور اس کے بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔

یکا یک ننھی لڑکی نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا ’’ابا‘‘

''ابا''

''ابا''

فیروز نے ایک لمحے کیلئے شمال مشرق کی طرف مڑ کر دیکھا۔لیکن روشن ستارہ کہیں نہ تھا۔ چاروں طرف بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دوست سے کہا ''انتہائی ظلم ہے۔ان بچوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے''

لڑکی نے کہا۔''ابا......ابا......ابا''

فیروز نے آستہ سے جلاد سے کہا۔''مجھے جلدی سے غلاف اڑھا دو میں اپنی بچیوں کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا''۔

میرے دوست نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہا۔اس نے حکم دیا کہ اب دونوں عورتوں اوران کے بچوں کو وہاں سے پرے ہٹا دیا جائے۔

لوہے کا پھاٹک ایک بار پھر کھلا اور لالائن اور اس کے دونوں بیٹے باہر چلے گئے۔

فیروز کی بیوی ایک بار رکی اور مڑی چیخ مار کر اپنے خاوند کی طرف بڑھنا چاہتی تھی کہ پہرہ داروں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے لوہے کے پھاٹک کے باہر دھکیل کر دور کہیں جیل خانے کے دوسری طرف لے گئے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ابھی ساڑھے پانچ بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو فیروز! ڈاکٹر نے پوچھا۔

''دعا کرو۔میرے لئے دعا کرو۔سب لوگ میرے لئے دعا کرو۔'' فیروز کی آواز اس غلاف کے اندر سے اس طرح آ رہی تھی، جیسے وہ کسی تاریک اندھے کنوئیں میں بول رہا ہو''۔

جلاد نے ریشمی ڈوری کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔اور پھندے کی گانٹھ کو اس کے گلے میں فٹ کر دیا! انصاف کی رسی!

فیروز زور زور سے اور تیزی سے اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔

وہ کسی طاقت کو بلا رہا تھا۔

ایک منٹ گزر گیا۔

دوسرا منٹ گزر گیا۔

تیسرا منٹ گزر گیا۔

چوتھا گزرا......ٹن! جیل خانے کی گھڑیال نے بجایا۔ گونج فضا میں تھرانے لگی۔

ڈاکٹر نے سفید رومال ہلایا اور دائیں کھمبے کی پھرکی ہلی، اور پھانسی کا تختہ بیچ میں شق ہو گیا، اور عین اسی لمحے فیروز ہماری آنکھوں کے سامنے سے گم ہو گیا۔ وہ اب ان دونوں تختوں کے بیچ اندھیرے کنوئیں میں اسی ریشمی ڈوری سے لٹکا ہوا دم توڑ رہا تھا۔

صرف چند سکینڈ کیلئے لاش تڑپی، جس طرح بجلی کا تار جسم سے چھو جائے۔ ایک سماجی اضطرابی حرکت، کرب اور بے چینی اور مہیب اضطراب، جیسے لاکھوں ٹن پانی کا طوفان یکا یک جہاز سے ٹکرا جائے جیسے ریلتا ہوالا وا یکا یک کسی آتش فشاں چوٹی سے پھٹ پڑے اور فضا میں آگ ہی آگ برسا دے جیسے خون کی ہر بوند میں اور دماغ کی ہر نس میں بارود کا فیتہ یکا یک بھک سے اڑ جائے، نہیں جب بھی نہیں، اس تڑپ، اس اضطراب اس کرب کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے، جب روح اور جسم اس طرح زبردستی ایک دوسرے سے جدا کیے جاتے ہیں۔

وہ اضطراب، وہ حرکت، وہ تڑپ بجلی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح میری روح کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے آپ کو مرتے دیکھا۔ اپنے ایمان کو خاکستر ہوتے دیکھا، وہ انسان، وہ کسی کا خاوند وہ کسی کا باپ وہ اس کی تہذیب جس نے اس پھانسی کو روا رکھا ہے۔ جس نے خون کا بدلہ خون میں لینا چاہا ہے۔ کبھی پنپ نہیں سکتے کبھی اٹھ نہیں سکتے۔ کبھی بلند نہیں ہو سکتے۔ مجھے فیروز کی صورت یاد نہیں۔ ہاں یاد، کے ہر کونے میں پھانسی کا ایک تختہ دیکھتا ہوں، غلاف کے اندر کوئی ہے اور اس کے بازو پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔

یہ صورت، جب بھی اکیلا ہوتا ہوں، میرے سامنے آتی ہے، اور ایک خاموش طعنہ بن کر مجھ سے پوچھتی ہے مجھے جانتے ہو۔ میں انسان ہوں۔ نیکی اور بدی کا پتلا، ازلی، ابدی انسان، تم نے مجھے اک ریشمی ڈوری سے اندھے کنوئیں میں لٹکا رکھا ہے کیا مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہو گی۔

◆◆◆

سیٹھ جی

سیٹھ جی کے ہونٹ بڑے بڑے اور شہوانی تھے۔ ان کی ناک لمبی اور ٹیڑھی تھی اور آنکھوں میں شائیلاک کی سی مکاری جھلک رہی تھی۔ میں جب ان کے دفتر میں پہنچا تو وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ہاہا آپ آئے ہیں! ارے بھائی جی آئے ہیں، ایک کرسی اندر بھیج دو۔

ایک چپڑاسی کرسی لے کر آیا۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے سیٹھ جی کے مسکراتے ہوئے چمکتے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے ان کے چہرے پر بناسپتی گھی کا ڈبہ انڈیل دیا ہے یہ مسکراہٹ اس نقلی گھی میں فرائی کی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سیٹھ جی نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے، اپنے ہاتھ ملے اور ایک عجیب منحنی باریک ہنسی سے جو کسی شیطانی گھوڑی کی ہنہناہٹ سے مشابہت رکھتی تھی، کام لیتے ہوئے بولے۔ ''ارے واہ واہ دھن بھاگ ہمارے! کسن جی آئے ہیں۔ میں نے ہر چند بھائی سے کہا تھا کہ کسن جی کبھی ملیں تو ہمارے پاس بھیج دینا ارے بھائی دو لاکھ کی بات ہی کیا ہے، یہ گرج تو جب چاہو پوری کر لینا تم نے ملنا بھی چھوڑ دیا''۔

میں نے کہا۔ ''میں آج سے چھ ماہ پہلے اسی کام کیلئے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ آپ نے اتنے پھیرے کرائے کہ میرے جوتے کا اندر کا موزہ بھی گھس گیا''۔

''ہاہاہا'' سیٹھ جی ہنستے ہوئے بولے۔'' آپ بڑے کھس مجاک معلوم ہوتے ہیں۔ جوتے کے اندر کا موزہ گھس گیا ہاہاہا! ایسا مجاک تو ہم نے کسی فلم میں نہیں سنا اس کو لکھ ڈالو نا، کسی فلم میں تمہاری قسم ہے بہت چلے گا ہاہاہا!

ہنستے ہنستے سیٹھ جی کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ان کے پیٹ میں لرزشیں پیدا ہونے لگیں۔ جب اچھی طرح ہنس چکے تو گھنٹی بجا کے بولے، کچھ پیو گے، کوئی ٹھنڈا ونڈا؟''

''ہاں ٹھنڈے سوڈے میں وہسکی ڈال کر پیوؤں گا''۔

اس کے بعد آپ نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک لڑکا گھنٹی کی آواز سن کر اندر آیا اور اپنے موٹے سیٹھ کی توند میں ہنسی کی لہریں اٹھتی دیکھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔ جب یہ طوفان رکا تو سیٹھ نے لڑکے سے کہا'' دو بہت اچھی وھٹو کی بوتلیں لاؤ''۔ جب لڑکا چلا گیا تو آپ میرے آگے جھک کر میری طرف دیکھنے لگے۔'' میں چاہا ہوں کہ آپ روپیہ مجھ سے سوا دو کی بجائے ڈھائی لاکھ لے لیں۔ لیکن پکچر ایسی ہو جو بالکل کلاسیکل ہو''۔

میں نے کہا۔'' کلاسیکل سے آپ کا مطلب کلاسیکل میوزک سے ہے شاید؟ بہت اچھا، میں دلیپ چند ویدی سے عرض کروں گا کہ وہ اس کا میوزک سنبھال لیں''

''نہیں نہیں'' سیٹھ جی بولے۔'' آپ میرا مطلب گلت سمجھے، آپ ایک ایسی پکچر بنائیں جو کلاسیکل ہو، یعنی جس کا جواب دنیا میں نہ ہو۔ آپ سمجھ گئے نا میرا مطلب؟ ایک دم فائن سمجھے''

''سمجھ گیا'' میں نے کہا۔ مگر ایسی فلم ہندوستان میں کون دیکھے گا؟ دیکھئے! اس سے پہلے تین چار بار تجربے ہم لوگ کر چکے ہیں۔ ایک تو وہ قحط بنگال کے بارے میں فلم تھی، ملک اور ملک سے باہر کے بڑے بڑے مشاہیر نے یہ تصویر دیکھی اور اس کی بڑی تعریف کی اور روس اور امریکہ اور انگلینڈ کے ناقدوں نے بھی اسے بہت سراہا۔ لیکن یہاں کہیں بھی تین چار ہفتے سے زیادہ نہیں چلی۔ آپ ایسی ہی تصویر چاہتے ہیں نا؟''

''نہیں نہیں ایسا پکچر کیا کرنا، اپنے کو''

میں نے کہا ''تو پھر ایک پکچر وہ تھی جس میں غریبی اور امیری کا تضاد دکھایا گیا تھا۔ اداکاروں نے بہت خوبصورت طریقے سے اپنا کام سرانجام دیا تھا۔ ڈائریکٹر نے بھی بڑی کاوش سے وہ تصویر بنائی تھی۔ بنی ہندوستان میں تھی۔ لیکن جب فرانس میں اس کی نمائش کی گئی تو وہاں کے فلمی مبصروں نے اسے اس سال کی بہترین فلم قرار دیا مگر ہندوستان میں ابھی تک ڈبوں میں بند ہے اگر آپ چاہیں تو میں''

باپ رے! میں نے ایسی پکچر کیلئے کہا ہے؟ آپ سے میں کچھ اور......

میں نے کہا ''تو پھر شاید آپ تیسری پکچر چاہتے ہیں جس میں گانے اور ڈانس عوام کے مذاق کے تھے لیکن اس کی کہانی ریاستی جاگیرداروں کے خلاف تھی۔

''جس کی وجہ سے کئی ریاستوں میں اس کی نمائش خلاف قانون قرار دی گئی اور ڈسٹری بیوٹر آج تک بنانے والے کی جان کو رو رہے ہیں۔ مگر پکچر اچھی خاصی تھی بیچارے ریاستی عوام کی زندگی کی عکاسی۔

سیٹھ گھبرا کر بولے۔ ''اپنے کو کاسی بیاسی کچھ نہیں چاہیے، اپنے کو سیدھی سادھی پکچر''۔

میں نے بات کاٹ کے کہا۔ ''تو ایک پکچر وہ ہے، بڑی سیدھی سادھی محبت کی کہانی ہے، مگر اس کا موضوع تھا ''زمین کسانوں میں بانٹ دو'' مگر تین دفعہ سنسر ہوئی آخر میں نہ زمین کسانوں کے پاس رہی نہ کسان رہے، خالی خولی محبت کی کہانی رہ گئی شہد لگا کر چاٹنے کیلئے''۔

سیٹھ بولے ''نا بابا۔ میں باز آیا ایسی پھلم اپنے کو نائیں چاہیے، جب تو ایک کوڑی نہیں دوں گا، میں تو ایسی کلاسیکل پکچر چاہتا ہوں جیسی کھڑکی، سنتوشی، شہنائی''۔

میں نے کہا۔ ''کھڑکی اور شہنائی تو فلمیں ہیں سنتوشی کوئی فلم نہیں ہے وہ کھڑکی اور شہنائی کے ڈائریکٹر صاحب کا نام ہے''۔

''نام تو اچھا ہے مگر سنتوشی صاحب آپ پر دس لاکھ کے ہرجانے کا دعویٰ کر دیں

گئے''۔

''اچھا جی'' سیٹھ صاحب کرسی پر تلملائے، تڑپے اور پھر ایک دم ٹھس ہو کر بیٹھ گئے، جیسے اس کے سامنے ساری دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہو۔

میں نے کہا ''سنتوشی تو نہیں لیکن بے ہوشی نام کیسا رہے گا؟''

سیٹھ جی کرسی اچھل پڑے اور بڑے زور سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے۔

''واہ واہ کسن جی! کیا نام سوچا ہے بے ہوشی، بڑا اچھا نام ہے''۔

میں نے کہا ''اور جتنے کریکٹر ہیں سب بے ہوش ہو جاتے ہیں، ہیرو، ہیروئین، سنیاسی، سائڈ ہیرو، سائڈ ولن سب ایک گانا گاتے ہیں اور گاتے ہی بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ کیسا Idea ہے سیٹھ؟

''کمال کر دیا کسن جی! مگر کتنے گانے رکھو گے آپ؟''

''تمیں گانے رکھوں گا، کریکٹر بہت ہوں گے نا اور پھر ہر گانے کے بعد بے ہوشی ہو گی گویا ہر دفعہ ڈرامہ پیدا ہو گا۔ میں تو سمجھتا ہوں سیٹھ پکچر لگتے ہی ہال میں ساری پبلک بے ہوش ہو جائے گی۔

''واہ واہ'' سیٹھ جی خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔ ''نیا Idea ہے ام دنیا نیا! میں بھی اوپیرا ہاؤس بک کرتا ہوں اس کیلئے''۔

میں نے کہا ''ہاؤس تو بہت اچھا ہے مگر پبلک کی بے ہوشی کیلئے ذرا چھوٹا رہے گا۔ کوئی بڑا سا ہال لیجئے اور وہاں سے کرسیاں ہٹوا دیجئے تاکہ لوگ پکچر دیکھنے جائیں اور اس فرش کا ک پر بیہوش ہوتے جائیں۔ دیکھیے گا سیٹھ جی! کیسی باکس آفس پکچر بنتی ہے۔ لائیے ابھی چیک کاٹ دیجئے۔

''چیک تو کاٹ دیتا ہوں، مگر اس میں میرا شیئر بھی رہے گا۔ پکچر بھی گروی کروں گا اور سود اور رائلٹی بھی لوں گا''۔

میں نے کہا ''سب منظور ہے''

وہ بولے ایک اور شرط ہے۔ اس پکچر میں شیئر ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ پکچر کے بیچ میں کوئی شرارت ہو، ہمارا نام بدنام ہو"۔

''وہ کیسے ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس یہی کہ سٹوڈیو کے اندر کوئی شراب نہیں پیے گا، کوئی سگریٹ نہیں پیے گا، کوئی لڑکیوں کی طرف بری نظر سے نہیں دیکھے گا''۔

میں نے کہا۔ ''وہ سب ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے مگر یہ شراب کیلئے ذرا اتنی مشکل ہے کہ اگر میرے خیال میں کوئی ایک آدھ پیگ پی کے آ جائے تو اسے کیسے روک سکتے ہیں۔ ایک آدھ پیگ تو ڈاکٹر بھی زبردستی پلا دیتے ہیں بیمار لوگوں کو"۔

سیٹھ نے کہا۔ ''ارے ایک آدھ پیگ کی بات کیا ہے وہ تو ٹھیک ہے۔ خیر میں چیک لکھتا ہوں''۔

وہ چیک لکھنے لگے۔ میں نے ذرا وقفہ کے بعد کھنکار کے کہا۔ ''اور سگریٹ سے تو خود مجھے وحشت ہوتی ہے۔ یعنی ہر وقت منہ سے تمباکو کی بو آتی ہے۔ جیسے آپ کے منہ سے پیاز کی بو آ رہی ہے اور......''

سیٹھ جی ایک دم چونک کر بولے۔ ''کیا میرے منہ سے پیاز کی بو آ رہی ہے......؟

''بو نہیں بھپارے آ رہے ہیں''۔

سیٹھ نے غصے میں گھنٹی بجائی، چپراسی اندر آیا۔ سیٹھ نے چپراسی سے کلونت کو بلانے کو کہا۔ کلونت آیا تو سیٹھ اس پر برس پڑے، بدمعاش سالے"! تو نے بتایا نہیں آج سالن میں اتنی بھنی ہوئی پیاز تھی کہ منہ سے بو آنے لگی۔ سالے! مجھے معلوم نہیں! دس سال سے ہمارے یہاں کام کر رہا ہے اور تجھے یہ معلوم نہیں کہ میں لنچ میں بھنی ہوئی پیاز نہیں کھاتا ہوں۔ کیسا جنگلی کے مافق گدھا ہے نکل جا، منیم جی سے حساب چکتا کرا لے"۔

بلونت سر جھکائے چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ''بات پیاز کی نہیں سگریٹوں کی ہو رہی تھی۔ دراصل سگریٹ پینا بہت

بری بات ہے۔ لیکن کبھی کبھار اسٹوڈیو میں جب آدمی رات دن کام کرتا ہے تو ایک اعصابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کیلئے کبھی کبھار سگریٹ پینا بہت مفید ہوتا ہے''۔

سیٹھ نے کہا نہیں نہیں میں ایسے سگریٹ پینے کو تھوڑی منع کرتا ہوں''۔

''باری رہی لڑکیوں والی بات'' میں نے کہا۔ ''اس پر تو ظاہر ہے کسی شریف آدمی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں کو بری نظر سے دیکھنا بہت برا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں سچی محبت کو کوئی روک سکتا۔ جہاں عورت اور مرد ملیں گے وہاں سچی محبت بھی ہو گی۔ آج تک انڈسٹری میں ہزاروں بڑے بڑے جغادری قسم کے پروڈیوسر سے لے کے معمولی اکسٹرا لوگوں تک کو ہو چکی ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے دو دو شادیوں کے بعد سچی محبت کی ہے۔ اب اس چیز کو روکنا تو بہت مشکل ہو گا''۔

سیٹھ جی بولے۔ ''سچی محبت کو میں کب بولتا ہوں کہ منع کر دو، اپن خود ایک بار اس جھنجھٹ میں پھنس گئے تھے''۔

''میں نے آنکھ مار کر کہا' سچ مچ سیٹھ جی۔ آپ بھی! یقین نہیں آتا''۔

''قسم لے لو کسن جی تمہارے ہی سر کی قسم، جو جھوٹ بولوں۔ وہ (ہائے میں مر گئی) پھلم کی ہیروئن نہیں، رام تمہارا بھلا کرے، ہیروئن نہیں سائڈ میں کون تھی لڑکی؟''

''جوگیشوری''

''ہاں ہاں جوگیشوری سے ہمارا پریم ہو گیا۔ بڑھتے بڑھتے دو تین بچے بھی ہو گئے۔ اب وہ کولابے میں ہے۔ میں اس کا خرچہ پانی سب دیتا ہوں۔ کبھی کبھی کولابے جاتا ہوں، تو قسم لے لو، بالکل اپنی دھرم پتنی کی طرح لگتی ہے۔ اب ایسے پریم کو کون منا ہی کرتا ہے......؟ میں یہ تھوڑا کہتا ہوں۔ کہ بالکل کمیونسٹ ہو جاؤ''۔

''ہاں ہاں وہ تو ظاہر ہے۔'' میں نے کہا ''آپ کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہو سکتا تھا''۔

سیٹھ جی چیک انگلیوں میں پھراتے ہوئے بولے۔ ''کسن جی! یہ میں کیا سن رہا

ہوں کمیونسٹ چین کو لے گئے''۔

''ہاں لے گئے''

''اور ادھر ملایا میں بھی ان کی بدماسی ہے''۔

''سنتے تو یہی ہیں''۔

آج صبح میں نے کھبر پڑھی کہ رنگون سے دس میل ادھر لڑائی ہو رہی ہے۔ وہاں بھی یہ دنگا چل رہا ہے ٹھیک ہے کیا؟''

میں نے کہا ''آپ نے ٹھیک پڑھا ہے''۔

سیٹھ جی چیک انگلیوں میں گھماتے ہوئے رک گئے۔ انہوں نے بڑے غور سے چیک کی طرف دیکھا، میری طرف دیکھا، میرے اور چیک کے درمیان صرف 6 انچ کا فاصلہ تھا۔ سیٹھ جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے چیک کو پھاڑتے ہوئے بولے۔ ''کسن جی! اب ہمارا بیوپار نہیں چلے گا۔ اب یہ سودا کرنے کا وقت نہیں ہے''۔

◆◆◆

سیما

اسے سوچنے اور غور کرنے کی بہت بری عادت تھی۔ یونہی بیٹھا بیٹھا جہان بھر کی باتیں سوچا کرتا۔ گو وہ ابھی بمشکل سولہ سال کا ہوگا اور کالج کے پہلے سال میں تھا لیکن ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اس کے سر کے بال بڑھے ہوئے اور اکثر الجھے ہوئے ہوتے تھے۔ پتلون گھٹنوں کے قریب آگے بڑھی ہوئی اور کوٹ کی بانہیں کہنیوں کے قریب سے بے حد میلی اور گھسی ہوئی جیسے وہ ان کہنیں سے انگلیوں کا کام لیتا رہا ہو۔ وہ بے حد شرمیلا لڑکا تھا۔ شرم، جھجک اور ڈر، یہ تینوں اوصاف اس میں تھے (یعنی اگر انہیں اوصاف کہا جا سکتا ہے تو......) یونہی ایک بے معنی فضول سا ڈر، کالج کے لڑکوں سے، پروفیسروں سے، راہ چلتے ہوئے خوش پوش لوگوں سے اسے ڈر کیوں محسوس ہوتا۔ اگر وہ چاہتا تو خوش پوش بن سکتا تھا۔ لیکن اسے خوش نما کپڑوں سے بھی ڈر لگا تھا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا تھا جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ اس کا چہرہ ہر وقت متفکر سا دکھائی دیتا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اداسی جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی۔ لبوں پر کبھی کبھی حزیں مسکراہٹ بھی آجاتی، لیکن یہ مسکراہٹ بہت کم لوگوں نے دیکھی تھی۔

وہ اپنی والدہ کی نگرانی میں اس شہر میں پڑھنے آیا تھا۔ شہر کی ایک بارونق گلی میں انہوں نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ شہر سے باہر کسی ایک کونے میں مکان لے لے۔ لیکن اس کی ماں نے اس بات کی مخالفت کی تھی۔ شہر کے باہر تو چمار بستے تھے یا

ایک پاگل خانہ تھا۔ پھر شہر سے باہر وہ کس سے بات کر سکے گی۔ کیونکہ عورت اور خاموشی دو متضاد چیزیں ہیں اور پھر یہ گھر کالج سے قریب بھی تھا۔ یعنی کوئی دس منٹ کا راستہ سائیکل پر پچپیس تیس منٹ پیدل، والدہ نے اسے ایک نیا سائیکل خرید دیا تھا۔ لیکن اسے اپنے سائیکل سے بھی ڈر محسوس ہوتا تھا۔ عجب بے ہنگم سی سواری ہے۔ ہر وقت آدمی کی جان بریکوں میں پھنسی رہتی ہے ہینڈل سنبھالو تو بریکیں جواب دے جاتی ہیں۔ بریکوں کا خیال رکھو تو گھنٹی بجانے کا خیال نہیں رہتا۔ کوئی موٹر گاڑی سامنے سے آ جائے تو نہ پیڈل چلتے ہیں نہ پہیے، یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آدمی کا جسم گدی پر ہے یا ہوا میں معلق۔

اس کی والدہ کو اس سے بہت محبت تھی۔ اگر کالج سے واپس آتے ہوئے اسے پانچ منٹ کی دیر بھی ہو جاتی تو گھر کے دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھا کرتی اگر وہ باہر سیر یا کھیل سے دیر میں آتا تو اس کی ماں پریشان ہو جاتی اور بار بار پوچھتی۔ ''بیٹا اتنی دیر کہاں رہے''۔

''یونہی سوچتا ہوا آ رہا تھا''۔

''یہ اچھی عادت نہیں۔ یونہی ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہو''۔

اور وہ شرما کر کہتا۔ ''کچھ نہیں ماں! اور اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو جاتا۔ اگر وہ بتا دے کہ وہ کیا سوچتا ہوا واپس آ رہا تھا تو اس کی ماں کیا خیال کرے گی اور خود بھی کئی بار سوچتا کہ وہ کیوں ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس سوچ کا مطلب؟ فائدہ؟ اسے اکثر اپنے آپ سے ڈر محسوس ہوتا۔

سیما کو اس نے سب سے پہلے اسی گھر میں دیکھا تھا۔ الھڑ بلکہ بھدی سی لڑکی۔ صرف رنگ صاف تھا۔ ورنہ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے متعلق وہ سوچ سکتا۔ اس میں نہ جوانی تھی نہ روپ، لڑکی ہی تو تھی، نہ چال اچھی تھی، نہ لباس اچھا، نہ ہنسی اچھی، نہ گفتگو اچھی، ہاتھ کی انگلیاں بے ڈھنگی سی نظر آتی تھیں۔ ان میں کوئی نفاست نہ تھی۔ لب پھیکے اور بے رس معلوم ہوتے تھے۔ نگاہوں میں گہرائی نہ تھی۔ سیدھی صاف سی نگاہ۔ وہ نگاہ جو کچھ جانتی ہی نہیں، معلوم تو اسے بھی کیا تھا۔ لیکن کم از کم کتابوں میں تو وہ کئی بار لڑکیوں کے متعلق پڑھ چکا تھا

اور دور سے کئی خوبصورت لڑکیوں کو دیکھا بھی تھا۔ لیکن ان سے بات اس نے کبھی نہ کی تھی۔ اسے لڑکیوں سے بھی ڈر محسوس ہوتا تھا۔

ہاں سیما سے وہ ڈرتا نہ تھا۔ سیما وہ لڑکی نہ تھی۔ ایک بار جب وہ سیما کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا اور سیما نوکر سے کھانا مانگ رہی تھی اور نوکر اس سے ہنس ہنس کر بات کرنے کی کوشش کرر ہا تھا تو اسے برا محسوس ہوا۔ نوکر کی ہنسی اور سیما کا بے ڈھنگا پن اس کی بے سمجھی، یہ سب چیزیں اسے بری محسوس ہوئیں اور وہ سوچنے لگا کہ یہ لڑکی ہمارے گھر آتی ہی کیوں ہے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اس کی ماں پرانے خیال کی عورت ہے۔ وہ جب تک دن میں کسی برہمن کو کھانا نہ کھلا لے......خود کھانا نہیں کھاتی۔ اسے ان برہمنوں سے جو گلے میں چادر لٹکائے ماتھے پر تلک لگائے بغل میں پوتھی دبائے اس کے گھر آتے تھے اور جنہیں کھانا کھلائے دکشنا دیئے بغیر اس کی ماں کبھی واپس نہیں کرتی تھی، بہت ڈر محسوس ہوتا تھا۔ لیکن اس کی ماں یہ سب کچھ اپنے لال کیلئے کرتی تھی۔ وہ اس کی جنم پتری کھول کر بیٹھ جاتی اور برہمن مہاراج سے پوچھتی۔ ''مہاراج میرا لڑکا کب نوکر ہوگا، مہاراج میرے لڑکے کا کب بیاہ ہوگا۔ مہاراج کیا میری بہو میرے کہنے میں ہوگی۔ مہاراج پوتے کا منہ کب دیکھوں گی''۔

اور برہمن اتنے اچھے دلکش جواب دیتے تھے کہ کھانا کھلائے اور دکشنا دیئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

رام دھن اس کا نوکر اس کا ہم عمر تھا اور بے حد شریر، بلکہ شریفوں کی اصطلاح میں اسے بدمعاش ہی کہنا چاہیے وہ سیما کو اکثر چھیڑتا رہتا تھا۔ لیکن سیما کو اول تو بہت سے رقیق جملوں کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دوسرے وہ ہر روز کھانا لے جاتی تھی اور پھر آخر اس میں کسی کا کیا بگڑتا تھا۔ بیچارہ دھن رام چولھے کے قریب چپاتیاں اتارتا اور ایک دو گندے مخول کر کے خاموش ہو جاتا اور وہ کھانا لے کر چل دیتی۔ بات اس سے آگے نہ بڑھنے پائی، کیونکہ سیما کی عمر بمشکل دس بارہ سال کی ہوگی۔ اس کا چہرہ، چال، ڈھال، قد، بت، ہر چیز نامکمل نظر آتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اسے بناتے بناتے جان بوجھ کر ادھورا رہنے دیا تھا۔ وہ حسین

بن سکتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے نہ بن سکی، اب وہ خوبصورت نہ تھی کہ ایک لڑکی بیکار، بے مصرف۔

ایک دن سیما رسوئی میں کھڑی کھانا لے رہی تھی اور وہ اپنا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لیے کچھ سوچ رہا تھا کہ رام دھن کی شریر ہنسی کی آواز سنائی دی۔ رام دھن اسے بلا رہا تھا، اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ جب اس نے رام دھن کی طرف دیکھا......تو وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''واہ واہ بابو جی میں نے ایک عمدہ تجویز سوچی ہے۔ بھلا کہیے۔ آپ کا اگر سیما سے بیاہ ہو جائے تو کیسا رہے۔ واہ واہ''

سیما بے خوفی سے اور بغیر جھجک کے ہنس پڑی اسے سیما کی ہنسی اور رام دھن کا مذاق بہت برا محسوس ہوا اس نے حقارت سے منہ دوسری طرف کر لیا اور جب سیما چلی گئی تو اس نے رام دھن کو خوب ڈانٹا اور ماں سے شکایت کر کے اسے ایک اور ڈانٹ پلائی۔ اس نے سوچا کہ گنوار کتا کتنا بیہودہ، فضول اور نکما شخص ہے۔ جب دیکھو لڑکیوں کے متعلق گندا مذاق کرتا رہتا ہے۔ کیا کرے تعلیم نہیں پائی، تمیز نہیں سیکھی، عقل ہوتی تو ایسی باتیں نہ کرتا اور پھر غریب بھی ہے۔ اس کے بھائی بہن بھی ہوں گے۔ اس جتنی ہی تو عمر ہے، فرض کرو کہ وہ رام دھن کی حالت میں ہوتا۔ خدا کسی کو غریب نہ بنائے۔ لیکن خدا نے غریب بنائے ہی کیوں؟ اس نے ہر شخص کو مسرت اور دولت کیوں نہیں عطا کی۔ یہ سوچتے سوچتے اسے دنیا کے خدا سے بھی ڈر محسوس ہوتا۔ اس گھر میں وہ سیما کو قریباً ہر روز دیکھتا تھا۔ یونہی سرسری طور پر کبھی اس نے اس کی زندگی، اس کی حرکات سکنات، اس کی ہستی کے متعلق زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا۔ ایک بار اس نے اس کے متعلق جو اندازہ لگایا تھا۔ وہ بہت دیر تک اس کے دل میں رہا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ دو سال گزر گئے۔ وہ اب بی اے میں تھا۔ وظیفہ لیتا تھا اور اپنی دنیا میں اور بھی گہری دلچسپی لینے لگا تھا۔ اب یہی دنیا اس کے لئے حقیقی دنیا بنتی جا رہی تھی۔ باہر کی دنیا کو وہ ایک سرسری پھسلتی اچٹتی نگاہ سے دیکھتا۔ لوگ، لباس، آوازیں، دھمکیاں، ہنسی، حسد، خوشی، اکثر بے معنی اور بیکار چیزیں نظر آتیں۔ ان میں اسے کیا دلچسپی ہوتی تھی۔ اس خول کے اندر ایک اور دنیا تھی۔ رنگین، پر کیف، خوبصورت، علمی اور ادبی مطالعہ نے اس کے دل پر ایک گہرا اثر کیا اور

وہ اپنی تخیلی دنیا میں منہمک ہو گیا۔کئی بار تو اس قدر سوچ میں ڈوبا ہوتا کہ اس کی والدہ اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑ جھنجوڑ کر جگاتی۔ ''اٹھو بیٹا کھانا کھالو''۔ وہ ناچار کھانا کھانے کیلئے بیٹھتا اور نوالہ ہاتھ میں لیے سوچنے لگتا اور اس کی والدہ کو پھر اسے جگانا پڑتا اور وہ محجوب ہو کر کھانا کھانے لگتا۔ کیسا بے وقوف لڑکا تھا وہ کم از کم کھانا کھاتے ہوئے تو اسے نہ سوچنا چاہئے تھا۔ کہتے ہیں کہ کھانا کھاتے ہوئے آدمی اگر سوچنا شروع کر دے تو کبھی کبھی حلق میں نوالہ اٹک جاتا ہے۔ آخ......تھو......تھو......اب پھر نوالہ حلق میں اٹک گیا تھا۔ اس کی والدہ سرزنش کے انداز میں کہتی، میں نے تمہیں کئی بار سمجھایا ہے۔ کھانا کھاتے وقت نہ سوچا کرو۔ یہ بہت بری عادت ہے''۔

بی اے میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنی ماں سے کہہ سن کر مکان تبدیل کر لیا۔ اسے گلی میں رہنا اچھا نہ لگتا تھا۔ وہ شہر کے ایک کونے میں تنہا رہنا چاہتا تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔ یعنی اٹھارہ سال کی عمر کا جوان، اب اس کی ماں یونہی اس کی ہر بات ٹال نہ سکتی تھی۔ آخر اس کی ماں نے شہر سے باہر تو نہیں لیکن شہر کے شمالی کونے پر ایک مکان لے لیا۔ یہ مکان ایک گلی کے آخری سرے پر واقع تھا اور اس مکان کے پرے ایک وسیع میدان تھا اور اس سے پرے سرکاری ہسپتال کا باغ اور اس سے پرے وسیع کھیت اور اس سے پرے پہاڑوں کی چوٹیوں کا سلسلہ۔ وہ یہ مکان کرایہ پر لے کر بہت خوش ہوا۔ اس کی ماں بھی خوش تھی۔ کیونکہ کچھ بھی ہو یہ مکان ایک گلی ہی میں تھا۔ ان کے مکان کے ساتھ ایک خالی زمین کا ٹکڑا تھا، جس پر جا بجا جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جنگلی لالہ کھلا تھا۔ دھتورے کے سفید پھول اپنی ڈنڈیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ اس خالی زمین کے ٹکڑے کے پرے سیما کا گھر تھا۔ کچی مٹی کا بنا ہوا۔ یہاں سیما اپنے چھوٹے بھائی، خالہ، کے خاوند اور اماں کے ساتھ رہتی تھی۔ سامنے گلی میں اور مکان بھی تھے۔ غرضیکہ اس کی والدہ کیلئے رونق کا اچھا خاصا سامان تھا۔

اب کے جو سردی کا موسم آیا تو اس نے سیما میں پہلی بار تبدیلی محسوس کی، وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے کالج کو جا رہا تھا کہ اسے خالی زمین کے ٹکڑے کے قریب سیما مل

گئی۔ سیما اپنے ہاتھ میں کانگڑی لیے اس کے گھر کی طرف آ رہی تھی۔ کانگڑی میں لال لال کوئلے دہک رہے تھے۔ سیما اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ’’آپ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس کانگڑی پر ہاتھ تاپ لیجئے‘‘۔ یہ کہہ کر وہ ہنسی۔

وہ چونک پڑا۔ یہ نئی قسم کی البیلی ہنسی تھی۔ البیلی، میٹھی کچھ تھوڑی سی خودی، تھوڑا سا غرور، اس نے سیما کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ لیکن اب ان آنکھوں میں انجان پن نہ تھا اور وہ سیما سے نظر نہ ملا سکا۔ اس نے یکا یک محسوس کیا کہ سیما کے چہرے پر ایک نئی دلآویزی آ گئی ہے۔ رخساروں پر ایسی شہابی روئیں جیسے پکے ہوئے سیب پر جسے انسانی ہاتھ نے نہ چھوا ہو۔ لبوں میں رس اور سرخی اور چمک اور ایک لطیف قسم کی بغاوت جیسے یہ لب، اپنے مالک کے اختیار میں نہیں۔ ان کی شوخی، ان کی ہنسی، ان کی سرخی، ان کی چمک، ایک فطری، قدرتی، خودرو چیز ہے۔ سیما کی مخملیں ٹھوڑی سے اتر کر اس کی نگاہ سیما کی گردن پر پہنچی۔ اس گردن میں ہنس کے پروں کی سفیدی اور ہنس کی گردن کا خم موجود نہ تھا۔ وہ بہت حیران ہوا۔ اس کی نگاہ اور نیچے جانے لگی۔ لیکن گردن کے نیچے ایک ریشمیں کرتا تھا، نیلا جھلمل کرتا ہوا، اور پھر اس کی نگاہیں ان ہاتھوں پر پڑی جو کانگڑی کو پکڑے ہوئے تھے۔ لمبی مخروطی انگلیاں اور پوریں حنا میں رنگی ہوئیں۔ بھلا وہ اب تک ان انگلیوں کی خوبصورت سے کیوں آگاہ نہ تھا۔ سیما ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے سر کی طرف لے گئی اور کانچ کی چوڑیاں چاندی کی گھنٹی کی طرح بج رہی تھیں۔ سیما کے سر کے بال سنہرے تھے اور بل کھاتے ہوئے، وہ بہت حیران ہوا۔ اس نے اپنے میں ایک نئی قسم کی جھجک، اک انوکھا ڈر محسوس کیا۔ اب تک سیما سے کبھی خائف نہ ہوا تھا۔ لیکن اب اسے سیما سے بھی ڈر محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ راستے میں سیما کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہ چاہتا تھا لیکن سیما کی صورت بار بار اس کے سامنے آ جاتی اور وہ پریشان ہو جاتا۔ جس چیز کو وہ آج تک نامکمل اور ادھوری سمجھتا آیا تھا۔ اب یکا یک اتنی جاذب اور دلآویز بن گئی تھی کہ اس کے تصور سے ہی اس کا دل کانپنے لگتا۔ ابھی کل ہی تو اس نے اسے دیکھا تھا، اور آج...... یکا یک کیا ہو گیا ہے۔ اب نہ

وہ الہڑ تھی، نہ بھدی، اس کی نگاہوں میں رفعت، لبوں میں رس، چال میں شعریت آ گئی تھی۔ خودی اور غرور، اور پھر ایک لطیف قسم کی بغاوت جیسے وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی طرف دیکھے اور وہ اسے مرعوب کر لے۔ کوئی اس سے مذاق کرنا چاہتا ہے اور وہ ایک ملکہ کی طرح اسے جھڑک دے یا خاموشی سے اس طرح گزر جائے جیسے وہ ان چیزوں سے بہت بلند اور بے نیاز چیز ہے اور یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا کہ سیما بہت بلند اور بے نیاز ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے اس کے ذہن میں سیما کی قدر و قیمت ایک بھیک مانگنے والی برہمن لڑکی سے زیادہ نہ تھی۔ اب یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ خود اس کے سامنے بھیک منگا بن گیا تھا۔

اس دن جب وہ کالج سے لوٹا تو اس کی عجیب حالت تھی۔ جوں جوں وہ سیما کے کچے گھر کے قریب آتا گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوتا گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی اس کی چال میں ایک عجیب ناہمواری سی پیدا ہو گئی جیسے کسی نے شراب پلا کر نیم مدہوش کر دیا ہو۔ اس حالت میں جب وہ سیما کے گھر کے سامنے سے گزرا تو اس نے سیما کو دروازہ پر کھڑے اپنی خالہ سے باتیں کرنے میں مصروف پایا۔ دیوار سے لگی ہوئی نیلراج کے پھولوں کی بیل تھی۔ جس کے لمبے لمبے نازک سے پھول سیما کی انگلیوں کی طرح ہر پتوں پر جھکے ہوئے تھے اور ان کے ڈنٹھلوں میں بھی سیما کی گردن کی سی سپیدی اور لچک موجود تھی۔ اس دن اسے نیلراج کے پھول بہت پیارے معلوم ہوئے۔ اب تک اسے شاعروں اور نظموں سے رغبت نہ تھی۔ انگریزی نظموں کے الجھاؤ اکثر اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ آج رات وہ دیر تک انگریزی شاعروں کی نظمیں پڑھتا رہا۔ ''بلبل کا نغمہ'' لے میا کا عشق اور شیلے کی والہانہ شیفتگی، ان نظموں میں جو درد، کسک اور ملال موجود تھا۔ اک غبار بن کر اس کے دل پر چھا گیا۔ جیسے اس کی تشنہ روح مدتوں کے بعد سیراب ہو گئی ہو۔ نظمیں اور سیما اور سیما کا زندہ، جسمانی، لیکن غیر مرئی ساجن اس کے دل میں ایک اضطراری کیفیت پیدا کرتا گیا۔ یہ سب جذبات اس کے دل میں اس طرح گھل مل گئے کہ ٹھیک طرح سے ان کا تجزیہ نہ کر سکتا تھا۔ اک طوفان تھا جو امنڈ چلا آ رہا تھا اور اس نے جھجکتے ہوئے ڈرتے ہوئے، لیکن نامعلوم سی مسرت کے ساتھ اپنے آپ کو اس

طوفان کے حوالے کر دیا۔

بہت مدت تک اس نیم مدہوشی کے عالم میں رہا۔ کئی برسوں تک رہا اور دل ہی دل میں سیما کو پیار کرتا رہا۔ کیونکہ وہ بے حد شرمیلا لڑکا تھا۔ اظہار محبت کی جرات جو زبان سے کی جاتی ہے اسے کبھی نصیب نہ ہوئی۔ وہ کسی کو اپنا ہم راز نہ بنانا چاہتا تھا۔ سیما سے پہلے اس نے خوبصورتی نہ دیکھی تھی۔ سمجھی نہ تھی، جانی نہ تھی، اب یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کے ہاتھ خزینہ آ گیا ہے۔ اس نے سیما کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لیا سر سے پاؤں تک۔ کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ سیما کو بھی نہیں۔ کیونکہ وہ شرمیلا تھا۔ اسے اس نئے جذبے سے، اس نئے حسن سے ڈر محسوس ہوتا تھا۔ وہ چپکے چپکے اس نئی دنیا کے روپہلے مرغزاروں میں گھومنا چاہتا تھا۔ اکیلے اکیلے، کسی کے دیکھے سنے بغیر وہ یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس کی طرف متوجہ ہوں۔ اس بات کا خیال آتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں آ جاتیں اور کسی نامعلوم ڈر کے احساس سے اس کے سارے جسم میں ایک سنسنی سی پھیلتی جاتی جیسے کسی نے ساکن تالاب کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینک دیا ہو۔

وہ سیما کو دن میں کئی بار دیکھتا تھا اور جب تک دیکھ نہ لیتا اسے چین نہ پڑتا۔ اگر یہ کہا جائے وہ اس راستے کو پوجتا تھا جس پر سیما ادھر سے گزرتی جاتی تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کی وارفتگی میں اتنی گہرائی پیدا ہو چکی تھی کہ اس پر ایک قسم کی ذہنی بے ہوشی ہر وقت طاری رہتی۔ ایک والہانہ کیفیت، حال کا سا وجد، سرمدی نشہ، اور پھر ایک عجیب قسم کی بے قراری، بے کلی، بے چینی درد اور مٹھاس۔ سیما کو دیکھتے ہی اس کے جسم کے روئیں روئیں میں کسی آتشیں سیال کی لہریں گردش کرنے لگتیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ جسم اور روح تحلیل ہوئے جا رہے ہیں۔ تحلیل ہوتے ہوتے ایک شفقی روشنی بنے جا رہے ہیں۔ شفقی روشنی سیما کے گرد لپٹی جا رہی ہے۔ جیسے وہ کوئی نورانی ہالہ ہو اور پھر اپنے ذہن میں اس روشنی اور سیما میں کوئی فرق معلوم نہ کر سکتا۔ یہاں پہنچ کر اسے ایسا معلوم ہوتا گویا وہ اس کی ہیبت ناک قطر کے آخری کونے پر کھڑا ہے۔ کسی خوفناک آتش فشاں پہاڑ کے آخری دہانے پر شفقی روشنی کا ریلتا ہوا لال لال لاوا

بن جاتی اور ہزاروں پر پیچ حلقوں میں گردش کرتی ہوئی معلوم ہوتی۔ اور وہ اپنے آپ کو تھامنے کی کوشش کرتا، اسے ڈر محسوس ہوتا کہ کہیں وہ اس دہانے سے نیچے نہ گر جائے۔

لیکن وہ بے حد شرمیلا تھا۔ شرم، جھجک اور ڈر کے مضبوط خول نے اسے تھام رکھا تھا۔ یہ چیزیں اس نے اپنے بزرگوں سے اپنے سماج کے ماحول سے، اپنے ملک کی فضا سے ورثے میں پائی تھیں۔ اس کی ماں اس کی اچھی طرح نگہداشت کرتی تھی۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ اسے برے لڑکوں کی صحبت سے بچاتی تھی۔ مخرب الاخلاق کتابیں نہیں پڑھنے دیتی تھی۔ کسی لڑکی سے بات نہیں کرنے دیتی تھی۔ وہ ایک اجلے، پاکیزہ صاف ستھرے ماحول میں پرورش پا رہا تھا کہ یکا یک اس کی زندگی میں سیما کے حسن سے تصادم ہوا اور اس کی زندگی دو حلقوں میں بٹ گئی اور دو مختلف محوروں کے گرد طواف کرنے لگی۔ ایک زندگی اسی شرم اور جھجک و ڈر کے خول کے باہر تھی۔ وہ ابھی اسی طرح گھوم رہا تھا۔ گھر، والدہ، پلے گراؤنڈ، کتابیں دوسری زندگی اس خول کے اندر تھی۔ جو پہلے بالکل باہر کی زندگی کی طرح تھی، لیکن اب اسے سیما کے حسن نے متلاطم کر دیا تھا اور ان دونوں زندگیوں کے درمیان وہی خول تھا۔ وہی ڈر، شرم، جھجک اور یہ دونوں زندگیاں اپنے اپنے محوروں پر گھومتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔

کسی کو اس کی محبت کا اندازہ نہ تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ لیکن اس نے اپنے پیار کو سالہا سال اپنے نہاں خانے میں چھپائے رکھا اس سیپ کے موتی کی طرح جو نیلی موجوں کے نیچے غواصوں کی نظر سے دور کسی گہرے سمندر میں مستور ہو۔ اس کے دل تک کون پہنچتا۔ وہ تو اپنا غواص آپ تھا۔ وہ اس راز کو اپنے آپ سے، دنیا سے، سیما سے ہر ایک سے چھپانا چاہتا تھا۔ ایک موہوم سا ڈر ہر وقت اس کے دل پر چھایا رہتا تھا۔ کہ اگر کوئی اس راز سے واقف ہو گیا تو اس کا موتی نیلی موجوں کے نیچے تھپیڑے کھاتے ہوئے سمندر کی گہرائیوں میں سے بھی صدف کی چھاتی توڑ کر نکال لیا جائے گا اور پھر وہ کہیں کا نہ رہے گا۔ تاروں نے بھی اپنے خزانے کی نگہداشت اتنی تندہی سے نہ کی تھی۔ لیکن کئی بار جب اس کی روح سیما کے حسن کے شدید احساس سے تڑپنے لگی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کھل کر بات

کرے۔کسی لطیف پیرائے میں سیما پر اس بے پناہ کسک کو ظاہر کردے جو اس کی جان کھائے جاتی تھی۔کبھی کبھی وہ اس شدت احساس کے زیر اثر جھلا اٹھتا۔ چاہتا کہ سیما کو اپنے بازوؤں میں اس زور سے لپیٹ لے کہ اس خوبصورت لڑکی کا دم گھٹنے لگے۔اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیران ہوجائیں اور اس کے نازک ہونٹ اس طرح کھلے رہ جائیں جیسے گلاب کی ادھ کھلی کلی، جسے رات کی اوس اور صبح صادق کے جھونکوں نے پکی نیند سے جگا دیا ہو۔کبھی کبھی اس شدید احساس کے زیر اثر اس شرم، جھجک اور ڈر کے خول کے اندر ہی اندر اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ چاہتا کہ یک لخت ایک جھٹکے سے اس خول کو چیر کر باہر نکل آئے، اسے پھاڑ پھاڑ کر تار تار کردے، حتیٰ کہ اس کی دونوں زندگیوں کے حلقے ایک دوسرے پر منطبق ہوجائیں اور ایک ہی محور کے گرد گھومنے لگیں۔لیکن یہ ایک وقتی نیم اضطراری حرکت ہوتی ہے جیسے کسی مضبوط قفس کے اندر پرندہ پھڑپھڑائے اور چند لمحوں کی جانگسل کاوش کے بعد بے حرکت ہوکر رہ جائے۔

کئی بار ایسے موقعے بھی آئے تھے جب وہ سیما سے اکیلا ملا تھا۔ایک بار اس کی ماں نے گھر سے باہر کسی کے ہاں جاتے وقت سیما کو بلا بھیجا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ اس کے آنے تک گھر ہی میں رہے۔پھر اس نے سیما کو ایک تھالی میں بہت سے چاول لاکر دیئے تھے اور اس سے کہا تھا کہ وہ ان سے کنکر الگ کر دیا ور چاول سنوار کر دال بھی بھگا ردے۔اتنے عرصے میں وہ خود واپس آجائے گی۔اور اس کی ماں نے اپنے بیٹے کو بھی سیما کی مدد کیلئے کہا تھا اور جب ماں چلی گئی تو وہ چپکے سے سیما کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور چاولوں سے کنکر نکالنے میں مصروف ہوگیا تھا۔سیما اور وہ دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی مونڈھے پر بیٹھے ہوئے دیر تک چاول سنوارتے رہے تھے اور وہ اس سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکا تھا۔اسے ڈر تھا، مبادا سیما اس کے دل کی دھڑکن نہ سن لے، وہ نگاہیں دیکھ لے جو کھل کر دل کا راز کہہ دیتیں، اس نغمے سے آشنا ہوجائے جس سے اس کی روح کا ہر تار مرتعش ہو رہا تھا۔چاروں طرف شفق روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ اپنے اور سیما کے سانس کی مدھم لے کو اس روشنی میں پھیلتے اور مدغم ہوتے دیکھ رہا تھا۔چاول سنوارنے کے بعد وہ مونڈھے سے اٹھ بیٹھا اور سیما دال بگھارنے لگی۔سیما سامنے بیٹھی دال بگھار رہی تھی اور

وہ اس کے خوبصورت ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر مبہوت ہو رہا تھا۔ لمبی، پتلی، مخروطی، حنائی انگلیاں وہ ان کے لمس سے بہرہ ور ہونے کیلئے بے تاب ہو اٹھا۔ سرخ سرخ ناخنوں والی پوریں گلاب کی کلیوں کی مانند تھیں۔ کیا یوں نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ساری عمر سامنے بیٹھی یونہی دال بگھارتی جائے اور وہ اسے اسی طرح سامنے بیٹھا تکتا جائے۔ یہ سوچ کر وہ ہنس پڑا، کتنا مضحکہ خیز خیال ہے اور ناممکن، اس زندگی کے سب سپنے یونہی ہوتے ہیں، میٹھے، پیارے، دلنواز، لیکن ناممکن۔

ایک بار وہ اسی طرح گھر کے باہر خالی زمین کے ٹکڑے پر جہاں جنگلی لالہ کھلا ہوا تھا۔ سیما کے ساتھ پھول چننے بھیجا گیا تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی اور پکی ہوئی پیلی پیلی گھاس کے لمبے لمبے خوشے، ٹھنڈی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میدان میں جگہ جگہ خودرو لالے کے پھولوں کے تختے تھے اور ان سے پرے پنجتارے کے درختوں کی ایک قطار سیما کے گھر تک چلی گئی تھی۔ پنجتارے کے درختوں پر سرخ پھول آئے ہوئے تھے اور دور سے یہ درخت سرخ چھتریوں کی طرح نظر آتے تھے جو سمندر کے کنارے پر ایستادہ ہوں۔ سیما اور وہ اس میدان میں گھاس کے خوشوں پر اپنی ہتھیلیاں سہلاتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، گھاس کے خوشے نرم تھے۔ لانبے، ملائم اور سنہرے، جیسے سیما کے بال، سیما کا دوپٹہ گردن سے نیچے شانوں پر گر گیا تھا۔ اور اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ لانبے نرم اور سنہرے اور اس کا دل بیتاب ہو گیا اور اس نے چاہا کہ وہ سیما کے بالوں سے بھی اسی طرح کھیلے جس طرح وہ دونوں اب گھاس کے خوشوں سے کھیل رہے تھے۔ چمکدار دھوپ تھی اور اس براق آسمان کے پس منظر میں پنجتارے کے سرخ پھول سیما کے لبوں کی طرح مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ہوا میں گھاس کے خوشوں کی سوندھی سی مہک تھی یا لالے کی خوشبو یا دھتورے کے سفید پھولوں کی کرواہٹ۔ لیکن اس وقت بھی وہ بری معلوم نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ان دونوں خوشبوؤں کے ساتھ مل کر ایک انوکھی سی مہک پیدا ہو گئی تھی۔ میٹھی بھی اور کڑوی بھی، چمکتا ہوا سورج پنجتارے کی سرخ چھتریاں، خوشبوؤں سے لدی ہوئی ہوا، اور سیما کی موجودگی۔ گویا کائنات کا زندہ اور غیر مرئی حسن اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا اور اس کی روح اس حسن بے کراں کے احساس کے

بار سے اس قدر بوجھل ہوگئی کہ وہ سیما سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ بس وہ خاموشی سے پھول چنتے رہے اور پھول چن چن کر اس کی جھولی میں ڈالتا رہا۔ حتیٰ کہ جھولی پھولوں سے اس قدر بھر گئی کہ پھول سیما کی ٹھوڑی کو چھونے لگے اور اب ان پھولوں کو اٹھائے وہ خود بھی ایک خوبصورت پیڑ معلوم ہوتی تھی۔ جس کی شاخیں لالے کے پھولوں کے بار سے جھک گئی ہوں۔ تھک کر وہ دونوں پنچتارے کے درختوں کی قطار کے نیچے جا بیٹھے تھے اور اس نے سیما کے بیٹھنے کیلئے اپنا کوٹ گھاس پر بچھا دیا تھا اور سیما اس کی اس حرکت پر ہنس پڑی تھی اور اطمینان سے اپنے کانوں میں پنچتارے کے پھولوں کے آویزے لگانے مں مصروف ہوگئی تھی۔

نہیں اس نے کبھی سیما سے دل کی بات نہیں کی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی سالہا سال تک وہ اسے کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سیما سے پیار کرتا رہا۔ ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے جیسے وہ کسی فعل شنیع کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس عرصے میں اس کی دونوں زندگیوں کے حلقے اپنی اپنی حرکت کرتے رہے اور اپنے اپنے محور گھومتے رہے۔ اس عرصے میں وہ کچھ زیادہ شرمیلا ہوگیا۔ اس کی جھجک پہلے سے بڑھ گئی، اس عرصے میں اس نے اپنی تعلیم ختم کر لی تھی، پھر تین سال باغات کے محکمے میں تربیت حاصل کی تھی اور اب وہ سرکاری باغات کا افسر اعلیٰ بن گیا تھا۔ اس عرصہ میں سیما کی بھی شادی ہوگئی تھی اور وہ سیندور کا لال ٹیکا لگائے اس کے گھر آیا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک غریب براہمن کی لڑکی تھی اور ایک غریب براہمن سے بیاہی گئی تھی اور پوجا پاٹ اور دکشنا اور روٹی مانگنا ہی تو براہمنوں کے کام تھے۔ اب وہ ایک معزز عہدیدار تھا، شاہی باغات کا افسر اعلیٰ۔ اب وہ سرکاری باغات کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ اس کی والدہ اس کے ساتھ تھی اور اسی طرح اس کی نگہداشت کرتی تھی جیسے ابھی وہ دو سال کا بچہ ہو۔ شائد ذہن اور شعور میں وہ ایک دو سالہ بچے کی مانند تھا کیونکہ وہ اب بھی سیما کو بھولا نہیں تھا۔ اس کی وارفتگی، شیفتگی، الفت اسی شدت کے ساتھ قائم تھی۔ بلکہ سیما کی شادی کے بعد کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ جتنی زیادہ اب اس سے دور ہوگئی تھی شاید اسی نسبت سے وہ اس سے زیادہ محبت کرنے لگ پڑا تھا۔ لیکن اب اس محبت میں درد بڑھ گیا تھا۔ بے چینی اور بے کلی تیز ہوگئی تھی اور

وہ خول جو اس زندگی میں لوہے کی ایک ڈاٹ کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ اس کی روح کو کچلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس بات کی تو اسے کبھی ہمت نہ ہوئی تھی کہ سیما سے اپنی محبت کا ذکر کرے۔ اپنی ماں سے سیما سے شادی کرنے کا کہیے یا اس دیوار کو توڑ ڈالنے کی کوشش کرے۔ ہاں وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ سیما کو چاہنے لگا تھا۔ دل میں کسی وقت تیر کی سی چبھن محسوس ہوتی تھی۔ جب سیما اکیلی یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ یا اپنے خاوند کے ہمراہ اس کے سامنے سے گزر جاتی تھی۔ شادی کے بعد سیما اور بھی حسین نکلی تھی۔ جیسے اوشا کی اجلی اجلی سپیدی کو آفتاب کی پہلی کرنوں نے جلا دی ہو۔ اس حسن نے اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تھی۔ اس کی روح کا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ شاید کہیں دل کے کسی تاریک گوشے میں امید کی ایک کرن ابھی تک تڑپ رہی تھی کہ وہ سیما کو پالے گا۔ محض اپنے جذبہ شوق وارفتگی کے سہارے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے باندھتا۔ لیکن پھر وہی شرم، جھجک اور ڈر کا خول اس کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیتا۔ سیما تو بیاہتا تھی، پتی برتا، عفت مآب عورت، لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی اسے چاہتا رہا۔ وہی دوری، وہی بُعد، وہی دبا ہوا خاموش جذبہ، وہی ناکام چاہت اب اسے سیما کو دیکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔ جب بھی وہ سیما کو دیکھتا تو سیما کے چہرے پر ایک دلآویز تبسم دیکھ کر شدت احساس سے پاگل ہونے لگتا۔ یا ایسی شاہانہ تمکنت دیکھتا جو گویا صاف کہہ رہی ہوتی، ''تم مجھے کبھی نہ پاسکو گے۔ تم اس لازول حسن کو کبھی نہیں چھو سکتے'' اور اس کا رنگ متغیر ہونے لگتا۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگتا اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ناچنے لگتے۔

اوول اسی کا دوست تھا، نکما، نڈر، بے باک، نہ اسے سماج کی پروا تھی، نہ اپنے ماں باپ کی، مذہبی عقائد کے لحاظ سے وہ بے رہرو سمجھا جاتا تھا۔ وہ پنچایت کے محکمہ کا افسر تھا۔ شہر کے عزت دار لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کیونکہ اس کے چال چلن کو درست نہ سمجھا جاتا تھا اور یوں بھی کوئی شریف آدمی اس کا ساتھی نہ تھا۔ اوول اور اس کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لیکن شاید یہی وجہ تھی جس نے ان دونوں کو دوست بنا دیا تھا۔ اوول ہمیشہ اسے چھیڑا کرتا۔ اس کے مذہبی، سیاسی اور ذاتی عقائد کا مضحکہ اڑایا کرتا۔ اس دنیا میں ہر شخص

خود غرض ہے۔ ہر شخص کمینہ ہے۔ اس مہاجنی دور میں ہر شخص کی ایک قیمت مقرر ہے۔ ہر شخص ایک خاص قیمت پر بک جایا کرتا ہے۔ لیکن لوگ اب بھی اسی طرح بکتے ہیں، بازاروں میں، گلی کوچوں میں، دفتروں میں۔ یہ نئی غلامی ہے۔ اسے نوکری کہتے ہیں لیکن غلامی نہیں کہتے کیونکہ ممنوع ہے۔ لیکن لوگ اب بھی اسی طرح بکتے ہیں۔ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ سماج میں عورتوں کا درجہ بلند ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بدستور بکتی ہیں۔ بیچی جاتی ہیں، گھروں میں، بازاروں میں، شادی میں، ہر نہج اور ہر صورت میں بیچی جاتی ہیں۔ ہاں ہر شخص کی ایک قیمت مقرر ہے۔ خدا سے لے کر عورت تک دنیا میں آدمی ہر چیز خرید سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے پاس پیسہ ہو، پیسہ، پیسہ، پیسہ، پیسہ اور اس قسم کی ہزاروں اول جلول باتیں بکتا۔ اوول کی باتیں سن کر اسے بہت غصہ آتا تھا اور وہ گھنٹوں بحث کیا کرتا تھا، پھر باتیں کرتے کرتے وہ یک لخت خاموش ہو جاتا، ایک عجیب سی اداسی کا تاریک سایہ اس کی روح پر طاری ہو جاتا اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے۔ اسے اس طرح پریشان اور خاموش دیکھ کر اوول اسے اور بھی تنگ کرتا۔ ''یوں باتیں کرتے کرتے کیوں اداس ہو جاتے ہو۔ کیا کسی سے محبت ہے، حیرت ہے تمہارے جیسے شرمیلے ڈرپوک آدمی کو بھی عورت سے محبت ہو سکتی ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی عورت کی شکل بھی دیکھی ہے۔ کبھی کسی عورت سے بات بھی کی ہے۔ دراصل یہ تمہارا قصور نہیں یہ ہماری اپنی تربیت کا قصور ہے۔'' امی کی گود میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' تم کسی سے کیا خاک محبت کرو گے۔ عورت کو دیکھتے ہی تمہارے تن بدن پر رعشہ چھا جاتا ہے۔ زبان میں لکنت آ جاتی ہے۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں، دیکھو، دیکھو ابھی سے تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ ایلو یہ سرخی کانوں تک جا پہنچی۔ کیسے جھینپ رہے ہو۔ میاں اپنا علاج کراؤ۔ یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔ مجھے دیکھو شادی نہیں کی۔ لیکن درجنوں عورتوں سے عشق کر بیٹھا ہوں یعنی وہ چیز جسے تم اپنی دانست میں عشق سمجھتے ہو۔ شادی تو میں کبھی نہیں کروں گا۔ شادی میں عورت مہنگی پڑتی ہے۔ میں تو کبھی کبھار عورت خرید لیا کرتا ہوں۔ جس طرح اونی جراب، سوئٹر یا دستانہ خریدا جاتا ہے اور پھر جب بیکار ہو جاتا ہے تو پھینک دیا کرتا

ہوں۔ اس نظام میں ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اس قیمت پر وہ چیز حاصل کی جاسکتی ہے اور جب وہ چیز اپنا مصرف کھو بیٹھے تو بیکار ہو جاتی ہے، پھینک دی جاتی ہے۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ دفتروں میں، کارخانوں میں، بازاروں میں، گھروں میں، یہ کیا تم محبت کی مصیبت لے بیٹھتے ہو۔ بتاؤ تو سہی وہ کون حور شمائل ہے جس سے تمہیں اتنی والہانہ محبت ہے؟''

اور وہ جھنجھلا کر کہتا ''مجھے کسی سے محبت نہیں، یہ تم کیسی فضول باتیں کرتے ہو''۔

اوول ہنس کر کہتا ''نہ بتاؤ، لیکن یہ تمہاری آنکھیں سب کچھ بتا رہی ہیں اور ایک دن تمہیں ایک زبان سے سب کچھ بتانا ہوگا۔

اور ایک دن آخر اس نے اوول کو سب کچھ بتا دیا۔ ایک ابر آلود شام کو جب اوول اور وہ اوول کے گھر انگیٹھی کے قریب بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ اس نے اوول کو سب کچھ بتا دیا۔ اس کی طبیعت بے حد اداس تھی اور کمرے کے باہر چھائے ہوئے میلے کہر نے اسے اور بھی غمگین بنا دیا تھا۔ ان بوجھے، انجانے طریق پر اوول نے اس کے پیار کی کہانی اس کی زبان سے سن لی۔ جھجکتے جھجکتے، ڈرتے ڈرتے، اس نے اپنی ناکام چاہت کی داستان کہہ ڈالی اور جوں جوں وہ داستان کہتا گیا۔ اس کی طبیعت میں روانی آتی گئی۔ اک طوفان اٹھا تھا کہ امنڈا چلا آرہا تھا۔ اس کی گھٹی ہوئی تشنہ روح کی ساری تلخی اب چھلک کر باہر آرہی تھی اور جب اس نے داستان ختم کی تو اس کی اور اوول دونوں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اوول کو معلوم نہ تھا کہ اس شرمیلے نوجوان کے دل میں محبت کا ایک بے کنار سمندر موجزن تھا۔ وہ بہت حیران ہوا اور اسے اپنے دوست پر بہت رحم آیا۔

جب وہ داستان محبت سن چکا تو کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے دوست کے شانے پر تھپکی دے کر کہا ''مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن مجھے تمہارا ڈاکٹر بننا پڑے گا'' پھر رک کر بولا ''تمہاری جیب میں دس دس روپے کے دو نوٹ ہوں گے''۔

اس نے دو نوٹ نکال کر دیئے ''کیوں کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں'' اوول مسکرایا ''تمہارے لیے دوائی لینے جارہا ہوں''

یہ کہہ کر وہ دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا۔

وہ اوول کی بات نہ سمجھ سکا۔لیکن اوول ہمیشہ اس قسم کی فضول باتیں کرتا تھا۔اس لیے اس نے چنداں پروانہ کی اور وہ آگ تاپتے ہوئے سرخ کوئلوں کی طرف دیکھتے ہوئے پھر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ باہر بادل گھر آئے تھے اور سامنے کے سلسلہ ہائے کوہ پر جھکے پڑے تھے۔ان کی گرج لرزہ خیز تھی اور بجلی کی چمک خشمگیں، جیسے انہیں رہ رہ کر اس پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے کیوں اپنے رازِ محبت کو یوں افشا کیا۔ دردناک سیٹیاں اور دریچوں کے شیشوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتا سنتا شاید وہ سو گیا۔ یہ نیند تھی یا مدہوشی، اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کتنا عرصہ اس عالم میں رہا۔ یکا یک اس نے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنی۔''اوول ہوگا''۔اس نے افسردہ لہجے میں کہا''کون ہے؟'' ایک اور دستک اور پھر دروازہ آہستہ سے کھل کر بند ہو گیا۔ یہ سیما تھی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکی۔ پھر نگاہیں نیچی کیے قدم اٹھائے اس کے قریب آتی گئی اور اس کے برابر بیٹھ گئی۔

یہ سیما ہے۔اس نے اپنے دل میں سوچا۔ سچ مچ یہ سیما ہے؟ اس کی برسوں کی محبوبہ، کائنات کا زندہ اور غیر مرئی حسن، وہی لانبے ریشمیں سنہرے بال، وہی پیارا چہرہ، وہی دلآویز لب، وہی گردن کی موتنی سپیدی، یہ سچ مچ سیما ہے؟ غیر شعوری انداز میں اس کے ہاتھ آگے بڑھے اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگے۔ یہ وہی بال ہیں، سنہرے ملائم۔ یہ وہی چہرہ ہے۔اس کی انگلیاں سیما کے رخساروں کو چھونے لگیں۔ جیسے کوئی اندھا راستہ بھول گیا ہو اور بڑھتے ہوئے طوفان میں ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر وہ ڈھونڈ رہا ہو۔ سیما کے جسم میں ایک ہلکی سی کپکپی پیدا ہوئی...... یہ وہی لب ہیں، جنہیں چومنے کی خاطر وہ ہزار بار پاگل ہو گیا تھا۔اس نے آہستہ سے ایک بار دو بار ان لبوں کو چوما، پھیکے اور سرد لب جیسے وہ کسی مٹی کی مورت کو چوم رہا ہو۔ کیا، کیا یہ وہی سیما ہے۔اس کی نگاہیں سیما کے ہاتھوں پر پڑیں، خوبصورت ہاتھ، کومل مٹی کی طرح سفید، ملائم بے داغ۔اس نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ہاتھوں کی انگلیوں اور پشت کو سکڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جھریاں نمودار ہو رہی تھیں۔

جلد پر چتلے، چتکبرے داغ ظاہر ہو رہے تھے۔ پھر وہ جلد سیاہ تر ہوتی گئی۔ انگلیاں سکڑتی گئیں۔ اب وہ ان ہاتھوں کے ایک ایک جوڑ اور ہڈی کو الگ کر سکتا تھا۔ یکا یک ایک شعلہ بلند ہوا اور اس نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ یکا یک اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کا دم گھٹا جا رہا ہے۔ کسی نے اس کے حلق میں ایک روڑا اتار دیا ہے اور وہ بول نہیں سکتا۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ حلقے ناچنے لگے۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اگر وہ ایک لمحہ بھی اس کمرے میں رہا تو دم گھٹ کر مر جائے گا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے اوول کے بلند قہقہوں کی آواز سنی۔

وہ بھاگتا جا رہا تھا اور سیاہ بادلوں کے چھینٹے اس پر پڑ رہے تھے، وہ میلے کہرے میں بھاگتا جا رہا تھا اور بارش میں بھیگ رہا تھا۔ اسے بارش کی پرواہ نہ تھی۔ اسے گردو پیش کی دنیا کا ہوش نہ تھا۔ کوئی اس کے کانوں میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''دنیا میں ہر چیز بکتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز کی ایک قیمت ہے، خدا سے لے کر عورت تک'' اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور بھاگتا چلا گیا۔ پیلے کہرے میں اس نے پنجتارے کے درختوں کی ایک قطار دیکھی جو اک سائے کی طرح اس کے سامنے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ نیل راج کے لمبے لمبے نازک سے پھول سبز پتیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ اسے بھاگتے دیکھ کر یکا یک انہوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بہ انداز ترحم اسے دیکھنے لگے۔ پیلی پیلی گھاس کے لمبے نرم اور سنہرے خوشے کہرے میں چاروں طرف سے ابھر ابھر کر ہوا میں لہرانے لگے...... اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بڑھتے ہوئے طوفان میں بھاگتا گیا۔ اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ اس کی روح میں کوئی چیز پھنستی جا رہی تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس کے قدم یک دم رک گئے۔ مٹھیاں بھنچ گئیں اور وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''سیما، سیما! جیسے وہ اپنے خدا کو بلا رہا ہو۔ وہ خدا جو وہاں موجود نہ تھا۔ پھر یکا یک ایک خوفناک ہنسی اس کے لبوں سے پھوٹ پڑی۔ ہاہاہا۔ کسی نے بند آتش فشاں دہانے کا منہ کھول دیا اور لاکھوں توپوں کی گرج کے ساتھ چاروں طرف ریلتا ہوا لاوا پھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ جیسے پجاری چلا رہے تھے اور غزنوی نے گرز مار کر سومنات کی مورت

کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ جیسے زندگی میں پھنسا ہوا آہنی ڈاٹ اک آخری کشمکش سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اتر گیا تھا اور زندگی کے دونوں حلقے گھومتے گھومتے ایک دوسرے پر منطبق ہو گئے تھے۔ اس کی ٹانگیں شل ہوئی جاتی تھیں اور اب اس سے چلا نہ جاتا تھا۔ یکا یک وہ اسی طوفان میں گیلی زمین پر گر گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو وہ بارش میں بالکل بھیگ چکا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ سے گھٹنوں کا سہارا لے کر اٹھا اب وہ بالکل خاموش تھا اور گھر کا راستہ معلوم کر سکتا تھا۔ چلتے چلتے یکا یک اسے معلوم ہوا کہ اس کی روح کا طوفان ختم ہو چکا ہے اور اس کی زندگی ہمیشہ کیلئے بے خول اور بے محور ہو کر رہ گئی ہے۔

◆◆◆

پہلا اور تیسرا

پہلے درجے میں لوگ کفن کی طرح اجلا لباس پہنے، سپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے گاڑی کے جھٹکوں میں موم بتیوں کی طرح ہل رہے تھے۔ ان موم بتیوں کے ہاتھوں میں اخبار تھے یا چمکیلے امریکی ناول، کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی وہ بھی ایک آبی تصویر کی طرح ساکت و جامد نظر آتی تھی۔ یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہ تھا۔ یہاں خاموشی تھی اور ایک طویل گہرا سناٹا اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کسی ہزار سال پرانے مندر میں آنکلا ہو اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو......

تیسرے درجے میں بڑی بھیڑ تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اندر آسکا اور ڈبے کے دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ ذرا سی جگہ اسے ملی جس میں وہ ایک پاؤں فرش پر لٹکا سکا، دوسرا پاؤں لٹکانے کی جگہ نہ تھی۔ دوسرا پاؤں اس نے ذرا پیچھے سرکایا تو سیاہ چمکیلے بالوں والی سانولی کرسچن حسینہ نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا مگر رمیش بھی مجبور تھا۔ اب اس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے لے کر ران تک اس سانولی لڑکی کی ٹانگ سے چپک گئی تھی اور اب وہ دونوں ٹانگیں گاڑی کی لے پر ڈبل اسپرنگ کی طرح حرکت کرتی تھیں۔ یہ محض اتفاق تھا، مگر انسانی جسم کو کیا کیا جائے، یہ بھی ایک مشین ہے، جب تک یہ مشین چلتی ہے حرکت کرتی ہے اس سے نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں چنانچہ لڑکی کا چہرہ بے حد ملیح ہو گیا اور رمیش کو اس کے بالوں

سے خوشبو بھی آنے لگی اور لڑکی کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ نکلیں، جیسے پھول کی پتیوں پر شبنم بکھر جاتی ہے، اس کے کان میں وہ آویزہ گاڑی کی لے پر ڈول رہا تھا۔ شاید اب رمیش کا دل بھی اس لے پر ڈول رہا تھا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس عیسائی حسینہ کو اپنی بانہوں میں لپٹا لے اور اس کے چھوٹے سے ادھ کھلے دہن پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔ وہ تو حیرت ہوئی کہ لوکل فاسٹ نہیں تھی۔ اگلے اسٹیشن پر رک گئی اور یہاں پر بہت سے مسافر اتر گئے اور دوسرے مسافروں کے ریلے اندر آنے سے پہلے اس عیسائی حسینہ نے اپنے لئے ایک سیٹ تلاش کر لی اور اپنے پھول دار میلے سائے پر کمر سے کولہے تک ہاتھ پھیرتی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی ماہی گیر عورت کے پاس بیٹھ گئی۔ رمیش نے اور پھر اس عیسائی لڑکی نے ایک لمحے کیلئے محبوب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کی ایک نگاہ میں کتنا ملال تھا۔ پھر دوسرے لمحے میں جیسے برقی رو ٹوٹ گئی اور پھر اک دوسرے کیلئے اجنبی ہو گئے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان ایک صدی ایسا لمبا لمحہ آیا تھا جب وہ دونوں مکمل اجنبی ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے تھے، جیسے وہ چاہنے والے ہی ہو سکتے ہیں اور رمیش سوچنے لگا یہ انسانی جسم بھی کتنی عجیب مشین ہے جب برقی رو کٹ جاتی ہے تو جذبات کام نہیں کرتے اور جب تک برقی رو جاری و ساری ہے ساری کائنات رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اور ریلے میں دو سرکاری چپراسی داخل ہوئے اور تین چار سادھو اور ایک بھیک مانگنے والا جو مختلف جانوروں کی بولیاں بول کر پیسے مانگ رہا تھا۔ یہ بھیک منگا دونوں آنکھوں سے اندھا تھا، اور اس کی سر گھٹا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، اور وہ کبھی اپنا دایاں ہاتھ منہ پر رکھ کے اور کبھی بایاں ہاتھ اور دایاں ہاتھ دونوں اپنے منہ کے قریب لے جا کے مختلف آوازیں نکالتا تھا۔

یہ کوا بولتا ہے ”کائیں کائیں“

اندھے نے کبھی کوا دیکھا ہے، جب وہ اپنے سیاہ چمکیلے پروں کو پھیلا کر نیلے آسمان پر پرواز کرتا ہے اور شریر بچوں کی طرح شور مچاتا ہے۔

یہ پہاڑی کوا......

پہاڑی کوا؟ تو نے پہاڑ دیکھے ہیں، اندھے، اونچے اونچے پہاڑ جن کی سر بفلک چوٹیوں پر سفید برف ہوتی ہے۔ جن کے سینے سے آبشار بہتے ہیں اور جنگل کے سبز پیرہنوں میں گلہریاں اور خرگوش، اور چھوٹے چھوٹے بندر اور لنگور اور خوبصورت پروں والے تیتر اپنی زندگی کی خوبصورت تصویر بناتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی کسی کھڑک کے تنے سے لگا ہوا کوئی ریچھ چاروں طرف دیکھا ہے اور ہوا میں اپنی تھوتھنی کو اونچا کر کے شہید کے چھتوں کی خوشبو سونگھتا ہے۔

یہ ہوائی جہاز کی آواز......

تو نے ایلومینیم کا وہ سفید پرندہ دیکھا جو پروپلر گھماتے ہوئے چار انجنوں کا شور مچاتے ہوئے فضا میں اڑتا ہے اور جس کے پیٹ میں انسان اس طرح بیٹھے ہیں، جس طرح اس گاڑی کے ڈبے میں مسافر بیٹھے ہیں مگر ہوائی جہاز میں ایسی بھیڑ نہیں ہوتی ایسے بھیک منگے بھی نہیں ہوتے۔ وہاں آرامدہ کرسیاں ہوتی ہیں اور خوبصورت پردے ہوتے ہیں اور سیم تن نازک بدن حسین عورتیں مسافروں کو رنگارنگ کاغذوں میں لپٹے ہوئے سوندے سوندے چاکلیٹ کھلاتی ہیں۔

ماہی گیر عورت جو بیڑی پی رہی تھی اس نے اندھے کو ایک آنہ دیا اور بولی۔

''جا'' اب دفان ہو جا، کسی دوسرے ڈبے میں جا کے یہ بولیاں سنا، بہت مغز چاٹ لی ہے تو نے۔

اتنا کہہ کر وہ خوب پھیل کر بیٹھ گئی، عیسائی لڑکی پھر سمٹ گئی، ماہی گیر عورت نے اپنی خالی ٹوکری جس میں مچھلیوں کی باس رچی ہوئی تھی اپنے ہاتھوں سے خوب اچھی طرح تھپتھپائی اسے جھاڑ پونچھ کے سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور خوب زور زور سے بیڑی پینے لگی اور کرسچین لڑکی سے کہنے لگی۔ مچھلی تو بڑے شوق سے کھاتی ہے اور اب یہاں ناک پر رومال رکھتی ہے، تیری یہ بٹن جیسی ناک سڑ تو نہیں جائے گی، بھلا''۔

کرسچین حسینہ نے ناک سے رومال ہٹا لیا۔ آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے، ماہی گیر

عورت اور زور زور سے بیڑی پینے لگی۔ ہنسنے اور بیڑی پینے کے درمیان اسے کھانسی آ گئی اب وہ ہنس رہی تھی اور بیڑی کا دھواں اس کے نتھنوں سے نکل رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے قریب کی جھریاں اور گہری ہو گئی تھیں اور کانوں میں سونے کا بوجھل دبگڑا کسی طلائی مچھلی کی طرح لٹک رہا تھا۔ جیسے مچھلی کانٹے میں پھنس کر بار بار تڑپ رہی ہو۔

ایک سادھو دوسرے سے مخاطب ہو کے کہنے لگا۔ کل نرگس کی نئی تصویر دیکھی ری بولی سینما میں واہ وا مجا آ گیا۔ رام جانے لڑکی کیا ہے۔ امرت کا گھونٹ ہے۔ تو نے ری بولی کی تصویر دیکھی ہے''۔

نہیں گورو! اپن کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے، پرسوں میرے گورو کو سیٹھ پھر سڑمل کے ہاں دکشنا ملی تھی۔ ساڑھے آٹھ آنے۔ گورو نے مجھے دیئے، میں تو سرکس دیکھ آیا۔ مگر رام جانے سرکس کی چھوکریوں میں وہ دم نہیں ہے۔ اب کے گورو نے آنکھ کھولی۔ وہ سیٹ پر ہی بھنگ اور چرس کے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ اب کے انہوں نے اپنے چیلوں سے جو یہ گفتگو سنی تو انہوں نے ایک آنکھ کھولی اور شکایت کرنیوالے چیلے سے کہا، کل تجھے دس آنے دوں گا، رام پان میں سوبھنا سامرتھ کو دیکھ آئیو۔ بالکل سیتا ماتا معلوم ہوتی ہیں۔ گنگا مائی کی طرح شیتل اور نرمل۔

چھوٹا چیلا ٹھنکنے لگا نہیں گورو ہم تو نرگس کی نئی تصویر دیکھیں گے۔ سنا ہے اس میں ایک ڈانس بہت اچھا ہے۔

گورو بولے ''ابے جا وہ ڈانس کیا ہو گا۔ یاد ہے اپنے گاؤں کی وہ مہتاری چمارن ننگا میا کی سوگند لے لو۔ اس سے اچھا کون ناچے گا، کیوں بے بھورے یاد ہے وہ برکات کا میلہ''۔

بڑا چیلا ہونٹ تر کے بولا۔ مہاتری کا جواب نہیں ہے۔ گورو میں سمجھتا ہوں۔ اب کے تم سردیوں میں دیس جاؤ تو اسے ساتھ ہی لیتے جاؤ۔ بے کار میں یہاں سے ہر مہینے منی آرڈر بھیجتے ہو۔ یہیں ایک فلم کمپنی کھول دیں گے، کیوں بے چچا۔

چچا بڑے گورو کا پاؤں دابنے لگا، ہاں گورو ہو جائے پھر۔

بڑے گورو مسکرائے۔ انہوں نے لنگوٹ کی تہہ میں ہات ڈال کے ایک چونی اور تین دونیاں نکالیں اور انہیں چھوٹے چیلے کی ہتھیلی پر رکھ کر کہا۔ جا تو بچہ ہے۔ ابھی نرگس کی فلم دیکھ آ۔ میں تو موہ مایا سب تیاگ چکا۔ خالی رام کا نام لیتا ہوں۔ بڑے گورو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گانجے کے مراقبے میں چلے گئے۔

چند کلرک آمنے سامنے دو سیٹوں پر بیٹھے بڑے زور کی بحث کر رہے تھے۔ ریلوے ہڑتال نہیں ہوئی، اچھا ہوا، کمیونسٹ بہت شور مچاتے تھے، سالوں کی بدھیا بیٹھ گئی۔ بہت اچھا ہوا۔

کیسے اچھا ہوا، ایک پارسی کلرک نے ناک میں گنگناتے ہوئے کہا۔

ارے ملک میں بڑا خطرہ تھا۔ بفروان جی بھائی، تم کیا جانو، گجرات میں کال پڑا تھا۔ اگر ہڑتال ہو جاتی تو لوگ بھوکے مر جاتے۔

اب کیا گجرات میں کال ختم ہو گیا ہے، مہنگائی ختم ہو گئی ہے، بھوک ختم ہو گئی ہے؟ تیسرا کلرک بولا۔

دوسرا کلرک بولا۔ ''ہاں اس کا جواب دو''۔

پہلا کلرک بولا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو اپنی حکومت آئے دو سال بھی پورے نہیں ہوئے۔

دوسرا بولا۔ دو سال ہی میں کیا کم ہوا ہے۔ مہنگائی کہاں سے کہاں چلی گئی۔ سچ جانو میں نے چھ مہینے سے جراب تک نہیں پہنی۔ بڑا لڑکا اسکول سے اٹھا لیا۔

وہ کیوں!

فیس دوگنی ہو گئی، کتابوں پر محصول لگا دیا، بچے کو کہاں سے پڑھاؤں۔ میں نے اسے راشننگ کے محکمے میں چپڑاسی کی ملازمت دلا دی ہے۔ دیکھ لینا ایک روز ترقی کرتا کرتا وزیر اعظم بن جائے گا۔

سب کلرک ہنسنے لگے۔ پہلا کلرک کہنے لگا۔ مگر مجھے تو کمیونسٹوں کی ہار پر خوشی ہے، ہڑتال سے پہلا کتنا اچھلتے تھے۔

تمہارے سوشلسٹوں نے عین وقت پر دھوکا دیا۔ پارسی بولا۔

مگر کوئی تو آتا، کہیں پر کچھ تو ہوتا۔ سب بھیگی بلی بن کر بیٹھ گئے۔ ایک مزدور بھی نہیں اٹھا، اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، یہ گنوار مزدور اور اجڈ کسان ہیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان لوگوں کو جتنا دبا کے رکھا جائے اتنا ہی یہ ٹھیک رہتے ہیں۔ ذرا ڈھیل دے دو تو سر چڑھ جاتے ہیں، سرکار نے ٹھیک کیا۔

ایک اور آدمی بولا۔ نو مارچ کو دیکھا نہیں تھا، چپے چپے پر پولیس اور فوج کا پہرہ تھا۔ ریل کی پٹڑی پر، اسٹیشنوں پر، کارخانوں پر، لوکو ورکشاپ میں، سنا ہے کوئی ہل نہیں سکتا تھا۔ حکم تھا کوئی ذرا چین چپٹ کرے تو اسے گولی سے اڑا دو۔

ایک آدمی جس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور جس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور جس کے گھٹنوں پر تیل کے بڑے بڑے داغ تھے اور میل کی تہیں، اور جو بڑی بے چینی اور پریشانی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ یکا یک اٹھ کھڑا ہوا اس نے اس کلرک کو جو گولی سے اڑا دینے کا ذکر بڑی شیخی سے کر رہا تھا، زور سے ایک طمانچہ مارا، طمانچہ اس زور کا تھا کہ کلرک کا منہ دوسری طرف گھوم گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنے میں دوسرے لوگوں نے مزدور کو پکڑ لیا۔

مزدور نے زور سے اپنی باہیں چھڑا لیں اور کہا اب دیکھنا سالو۔

یہ لوگ اس پر پل پڑے۔ ایک کونے میں چار مارواڑی تاش کھیل رہے تھے انہوں نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ پکڑو، پکڑو، اسے یہ کمیونسٹ ہے مارو، مارو اسے جان سے مار دو، پولیس کے حوالے کر دو۔

مزدور لڑ رہا تھا۔ لیکن وہ اکیلا تھا اور وہ بہت سارے تھے، پھر بھی چار آدمیوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس نے مدد کیلئے ادھر ادھر دیکھا دور ایک کونے میں سے ایک آدمی اٹھا، اس نے بڑے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے کلرک کو پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر ماہی گیر

عورت بیڑی کا دھواں نکالتی ہوئی اٹھی اور اس نے مچھلی والی ٹوکری لوگوں کے سر پر دے ماری اور چیخنے چلانے اور گھونسے مارنے لگی۔ ایک گھونسا غلطی سے رمیش کو بھی لگا اور اسے معلوم ہوا کہ مچھلی بیچنے والی عورت کا گھونسا کتنا تکڑا ہوتا ہے اور پھر ایک عورت آ گئی اس نے بھی بڑے اچھے اور رنگین کپڑے پہن رکھے تھے، اور وہ بھی پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے مزدور کی حمایت میں لڑنے لگی۔ ایک سادھو کا منڈل ایک مارواڑی کے سر پر اوندھا ہو گیا اور اس میں دال، چینی، چاول، سنگترے کی قاشیں، چنبیلی کے پھول، بینگن کی بھاجی اور پسی ہوئی سرخ مرچیں چاروں طرف پھیل گئیں اور لوگ کھانسنے لگے اور مارواڑی چلانے لگا اور کسی نے ان کی تاش اٹھا کر باہر پھینک دی۔ کسی نے پگڑی اچھال دی، اور دو مارواڑی رونے لگے اور چلانے لگے، کمیونسٹ آ گئے، زنجیر کھینچو، ہڑتالی آ گئے، ہڑتالی آ گئے۔

یکا یک گاری کھڑی ہو گئی اور پھر پولیس آ گئی۔

جب مجمع ذرا چھٹا تو معلوم ہوا کہ میلے میلے کپڑوں والا مزدور غائب ہے اور ماہی گیر عورت کا ٹوکرا ٹوٹ گیا ہے اور نوجوان عورت کا رنگین لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے والے نوجوان کا منہ نوچا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ سے خون نکل رہا ہے۔ لیکن ماہی گیر عورت کا زیادہ نقصان ہوا۔ ہاں وہ ان لوگوں کی گت دیکھ کر ہنس رہی تھی، جنہوں نے مزدور کو پکڑنا چاہا تھا، پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ مارواڑی ہاتھ بڑھا بڑھا کر گرجنے لگے، یہی تھی جو اس کے لئے لڑ رہی تھی اور یہ آدمی، یہ عورت، یہ جوان، یہ بابو اور وہ کم بخت ہڑتال کرانے والا کمیونسٹ تھا اس کو انہوں نے بھگا دیا۔

ماہی گیر عورت نے چلانے والے مارواڑی کی طرف اپنی ٹوکری زور سے پھینکی جو ٹھیک اس مارواڑی کے گلے میں آویزاں ہو گئی، سب لوگ ہنسنے لگے۔ ماہی گیر عورت بولی تو لڑائی میں حصہ کیا لے گا، تو نہ مرد ہے نہ عورت، تو دلال ہے دلال۔ دونوں طرف سے کمیشن کھاتا ہے، تیرے جیسا مارواڑی ہمارے وارسوا میں بھی تھا، وہ ہماری مچھلیوں کو اپنے ٹرکوں میں بھر کر شہر لے جاتا تھا اور سارا پیسہ خود ہڑپ کر جاتا تھا۔ اب ہم سارے گاؤں کے ماہی گیرون

نے مل کر اپنی ٹرک لے لی ہے خود مچھلی سمندر سے نکالتے ہیں اپنی ٹرک میں لے جا کے شہر میں بیچتے ہیں، پہلے میرے کان میں ایک چاندی کی بالی نہیں تھی اب دیکھ یہ سونے کا دبگڑا، تیری چپڑی پھجڑی بیوی کے پاس بھی ایسا نہ ہوگا۔

پولیس والے اس سے پوچھنے لگے کون تھا وہ؟

وہ بولی۔ وہ میرا بیٹا تھا۔

ہاں وہ میرا بیٹا تھا۔ وہ جہازی تھا ناوارسوا میں، جب جہازیوں کی ہڑتال ہوئی، تو اس نے اکیلے پانچ گوروں سے لڑائی کی، تم نہیں جانتے ہو اور اکھباروں میں بھی یہ کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ میرا بیٹا تھا، اور میں نے اپنی آنکھوں سے اسے پانچ گوروں سے لڑتے دیکھا، اور آج جو آدمی یہاں سے بھاگا، وہ بھی میرا بیٹا تھا، کیونکہ وہ بھی اس طرح کی ہڑتال چاہتا تھا جس کیلئے میرا بیٹا مارا گیا۔ اس لیے میں نے اسے بچالیا۔ اب تمہارا جہاں جی چاہے لے چلو۔

پولیس والوں نے اسے گاڑی سے نیچے اتار لیا۔ گاڑی چلتے چلتے رمیش نے دیکھا کہ وہ عورت پولیس والے سے ماچس مانگ رہی ہے، ماچس لے کر اس نے اپنی بیڑی سلگائی اور ماچس کی روشنی اس کی گہری آنکھوں میں چمک اٹھی، اور اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے اردگرد جھریاں گہری ہوگئیں اور طلائی دبگڑا اس کے کانوں میں بار بار غصے سے ہلنے لگا، پھر گاڑی آگے نکل گئی۔

رمیش ایک سیٹ پر بیٹھ گیا، اس کے قریب ہی وہ نوجوان جس نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اس نوجوان عورت کے قریب بیٹھا ہوا تھا، جس کا رنگین لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ نوجوان رمیش کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا ''وہ بچ گیا۔ اب ہاتھ نہیں آئے گا''۔

اس نے سر ہلا دیا۔ میں جانتا ہوں، مگر وہ بھی میری طرح کوئی مزدور دکھائی دیتا تھا۔

رمیش نے پوچھا ''تم مزدور ہو؟ مگر تمہارے کپڑے تو......

اس نے جواب دیا۔ ہمارا آج ہی بیاہ ہوا ہے۔ یہ بیاہ کے کپڑے تھے، میرے بھی اور اس کے بھی اور اس نے اپنی بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا...... بڑی مشکل سے یہ کپڑے

سلائے تھے، خیر کوئی بات نہیں اپنا ساتھی تو بچ گیا۔

وہ اپنی نوجوان بیوی کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ اس کی بیوی نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اور پھر اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے امرود کو اس نے دانتوں سے کاٹا اور لجائی ہوئی دلیری سے اس جوٹھے امرود کو اپنے خاوند کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

نوجوان مزدور امرود کھانے لگا، اور اس کے مضبوط ہاتھ نے بیوی کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

رمیش آہستہ سے وہاں سے اٹھ گیا، دوسری طرف ڈبے کے قریب مارواڑی اپنی پگڑیاں، اچکنیں اور دھوتیاں درست کر رہے تھے۔

ایک مارواڑی نے اپنی جیب سے تاش نکالتے ہوئے کہا۔ کیا ہوا مچھلی والی نے تاش باہر پھینک دی، ہمارے پاس دوسری تاش ہے۔

رمیش نے مارواڑیوں کے اوپر جھک کر کہا تمہارے پاس صرف ایک تاش ہے لیکن مچھلی والی کے پاس سارا سمندر ہے اور اس کی ساری مچھلیاں ہیں، تم اسے جیت نہیں سکتے......

لوگ کفن کی طرح اجلا لباس پہنے اسپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے، گاڑی کی لے پر مومی بتیوں کی طرح ہل رہے تھے ان موم بتیوں کے ہاتھوں میں اخبار تھے اور چمکیلے امریکی ناول لیے کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی، وہ ایک بے جان آبی تصویر کی طرح ساکت و جامد نظر آتی تھی، یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا، کوئی کسی کی طرح دیکھتا نہ تھا، یہاں خاموشی تھی اور او یک طویل گہرا سناٹا اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کئی ہزار سال پرانے مندر میں آنکلا ہو اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو۔

◆◆◆

چندرو کی دنیا

کراچی میں بھی اس کا یہی دھندا تھا اور باندرے آ کر بھی یہی دھندا رہا۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا کوئی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ کراچی میں بھی سدھو حلوائی کے گھر کی سیڑھیوں کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں سوتا تھا اور باندرے میں بھی وہیں سیڑھیوں کے عقب میں اسے جگہ ملی تھی۔ کراچی میں اس کے پاس ایک میلا کچیلا بستر، زنگ آلود پترے کا ایک چھوٹا سا سیاہ ٹرنک اور ایک پیتل کا لوٹا تھا۔ یہاں پر بھی وہی سامان تھا۔ ذہنی لگاؤ نہ اسے کراچی سے تھا، نہ اسے بمبئی سے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ ذہنی لگاؤ کے کہتے ہیں؟ کلچر کسے کہتے ہیں؟ حب الوطنی کیا ہوتی ہے؟ اور کس بھاؤ بیچی جاتی ہے؟ وہ ان سب نئے دھندوں سے ناواقف تھا۔ بس اسے اتنا یاد تھا کہ جب اس نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو سدھو حلوائی کے گھر میں برتن مانجھتے، جھاڑو دیتے، پانی ڈھوتے، فرش صاف کرتے اور گالیاں کھاتے پایا۔ اسے ان باتوں کا کبھی ملال نہ ہوا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ کام کرنے اور گالیاں کھانے کے بعد ہی روٹی ملتی ہے اور اس قسم کے لوگوں کو ایسے ہی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں سدھو حلوائی کے گھر میں اس کا جسم تیزی سے بڑھ رہا تھا اور اسے روٹی کی شدید ضرورت رہتی تھی اور ہر وقت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ اس لئے وہ حلوائی کے جھوٹے سالن کے ساتھ ساتھ اس کی گالی کو بھی روٹی کے ٹکڑے میں لپیٹ کر نگل جاتا تھا۔

اس کے ماں باپ کون تھے؟ کسی کو پتہ نہ تھا۔ خود چندرو نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ سدھا حلوائی اسے گالیاں دیتا ہوا اکثر کہا کرتا تھا کہ اس نے چندرو کو پناہ دی ہے ورنہ نہ جانے چندرو کا کیا بنتا۔ چندرو نے کبھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ نہ سدھو کیلئے شکریئے کے نرم جذبے کا اس کے دل تک گزر ہوا۔ کیونکہ چندرو کو کوئی دوسری زندگی یاد نہیں تھی اسے بس اتنا معلوم تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ ہوتے ہیں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ نہیں ہوتے، کچھ لوگ گھر والے ہوتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں دیتے ہیں، کچھ لوگ گالیاں سہتے ہیں۔ کچھ لوگ سیڑھیوں کے پیچھے سونے والے ہوتے ہیں۔ ایک کام کرتا ہے، دوسرا کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ بس ایسی ہے یہ دنیا اور ایسی ہی رہے گی۔ دو خانوں میں بٹی ہوئی۔ یعنی ایک وہ جو اوپر والے ہیں۔ دوسرہ وہ جو نیچے والے ہیں۔ ایسا کیوں ہے اور ویسا کیوں نہیں اور جو ہے وہ کب کیوں اور کیسے بہتر ہوسکتا ہے؟ وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا اور نہ اس قسم کی باتوں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ البتہ جب کبھی وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا تو اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس طرح وہ سٹے کے نمبر کا داؤ لگانے کیلئے کبھی کبھی ہوا میں سکہ اچھال کر ٹاس کر لیتا ہے اسی طرح اس کے پیدا کرنے والے نے اس کیلئے ٹاس کر لیا ہوگا اور اسے اس خانے میں ڈال دیا ہوگا جو اس کی قسمت تھی۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ چندرو کو اپنی قسمت سے کوئی شکایت تھی ہرگز نہیں! وہ ایک خوش باش محنت کرنے والا، بھاگ بھاگ کر جی لگا کر خوش مزاجی سے کام کرنے والا لڑکا تھا وہ رات دن اپنے کام میں اس قدر مشغول رہتا تھا کہ اسے بیمار پڑنے کی بھی کبھی فرصت نہیں ملی۔

کراچی میں تو وہ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا مگر بمبئی آ کر تو اس کے ہاتھ پاؤں اور کھلے اور بڑا سینہ پھیلا، گندمی رنگ صاف ہونے لگا، بالوں میں مچھے سے پڑنے لگے، آنکھیں زیادہ روشن اور بڑی معلوم ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں ضرور کسی بڑے گھر کی رہی ہوگی۔ اس کے پھیلے ہوئے سینے بانہوں کی مضبوط مچھلیاں اور کھردرے سخت ہاتھ دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اس کا باپ بھی ممکن ہے اسی بڑے خاندان کا کوئی جوان اور

تگڑا نوکر رہا ہوگا۔ اس قسم کے تجربے بالعموم سڑک پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔

چندرو کی دنیا میں آواز کا اس حد تک گزر تھا کہ سن سکتا تھا بول نہیں سکتا تھا۔ عام طور پر گونگے بہرے بھی ہوتے ہیں مگر وہ صرف گونگا تھا بہرہ نہ تھا اس لئے حلوائی ایک دفعہ اسے بچپن میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا ڈاکٹر نے چندرو کا معائنہ کرنے کے بعد حلوائی سے کہا کہ چندرو کے حلق میں کوئی پیدائشی نقص ہے مگر آپریشن کرنے سے یہ نقص دور کیا جا سکتا ہے اور چندرو کو بولنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے مگر حلوائی نے کبھی اس نقص کو آپریشن کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سدھو نے سوچا یہ تو بہت اچھا ہے کہ نوکر گالی سن سکے مگر جواب نہ دے سکے۔

چندرو کا یہی نقص سدھو کی نگاہ میں اس کی سب سے بڑی خوبی بن گیا۔ اس دنیا میں مالکوں کی آدھی زندگی اسی فکر میں گزر جاتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے نوکروں کو گونگا کر دیں۔ اس کیلئے قانون پاس کئے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹیں سجائی جاتی ہیں اور اخبار نکالے جاتے ہیں پولیس اور فوج کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ سن لو مگر جواب نہ دو۔

اور چندرو تو پیدائشی گونگا تھا یقیناً سدھو ایسا احمق نہیں ہے کہ اس کا آپریشن کروائے۔

سدھو بھی دل کا برا نہیں تھا۔ اپنے مخصوص حالات میں مخصوص حدود کے اندر رہ کر اپنے زاویہ نگاہ رکھے ہوئے وہ چندرو کو اپنے طریقے سے چاہتا بھی تھا۔ وہ سمجھتا تھا اور اس بات پر خوش تھا اور اکثر اس کا فخریہ اظہار بھی کیا کرتا تھا کہ اس نے چندرو کی پرورش کی۔ ایک بیٹے کی طرح کی ہے۔ کون کسی یتیم بچے کی اس طرح پرورش کرتا ہے۔ اس طرح پالتا پوستا اور بڑا کرتا ہے۔ کون اس طرح اسے کام پر لگا تا ہے جب تک چندرو کا لڑکپن تھا۔ سدھو اس سے گھر کا کام لیتا رہا۔ جب چندرو لڑکپن کی حدود پھلانگنے لگا تو سدھو نے اس کی خاطر ایک نیا دھندا شروع کیا۔

حلوائی کی دوکان پر تو اس کے اپنے بیٹے بیٹھتے تھے اس نے چندرو کیلئے چاٹ بیچنے کا دھندا طے کیا۔ ہولے ہولے اس نے چندرو کو چاٹ بنانے کا فن سکھا دیا۔ جل جیرہ اور کانجی

بنانے کا فن گول گپے اور دہی بھلے بنانے کے طریقے، چٹخارہ پیدا کرنے والے تیکھے مصالحے، کرکی پاپڑیاں اور چنے کا لذیز مرکیلا سالن، پٹھورے بنانے اور تلنے کے انداز، پھر سموسے اور آلو کی ٹکیاں بھرنے کا کام...... پھر چٹنیاں...... لہسن کی چٹنی لال مرچ کی چٹنی، ہرے پودینے کی چٹنی، کھٹی چٹنی، میٹھی چٹنی، ادرک کی چٹنی اور پیاز اور انار دانے کی چٹنی۔

پھر انواع واقسام کی چاٹیں پروسنے کے انداز، دہی بڑے کی چاٹ کانجی کے بڑے کی چاٹ، میٹھی چٹنی کے پکوڑوں کی چاٹ، آلو کی چاٹ، آلو اور آلو پاپڑی کی چاٹ، ہری مونگ کی گول گپے، آلو کے گول گپے، کانجی کے گول گپے، ہرے مصالحے کے گول گپے، جتنے برسوں میں چندرو نے یہ کام سیکھا اتنے برسوں میں ایک لڑکا ایم اے پاس کر لیتا ہے پھر بھی بے کار رہتا ہے مگر سدھو کا گھر بے کار، گریجویٹوں کو اگلنے کی یونیورسٹی نہیں تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چندرو اپنے کام میں مشاق ہو گیا ہے اور جوان ہو گیا ہے تو اس نے چار پہیوں والی ایک ہاتھ گاڑی خریدی، چاٹ کے تھال سجائے اور چندرو کو چاٹ بیچنے پر لگا دیا۔ ڈیڑھ روپیہ روز پر۔

جہاں چندرو چاٹ بیچنے لگا وہاں کوئی اس کا مد مقابل نہ تھا۔ سدھو نے بہت سوچ سمجھ سے یہ جگہ انتخاب کی تھی۔ کھار لنکنگ روڈ پر اور پالی ہل کے چوراہے کے قریب ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے اس نے چاٹ کی چار پہیوں والی گاڑی کو کھڑا کیا۔ یہ جگہ بارونق تھی۔ ایک طرف یونین بینک تھا دوسری طرف ٹیلیفون ایکسچینج، تیسری طرف ایرانی کی دکان، چوتھی طرف گھوڑ بندر روڈ کا نالہ، بیچ میں شام کے وقت کھاتے پیتے خوش باش خوش لباس نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ہجوم بہتا تھا۔ چندرو کی چاٹ ہمیشہ تارہ عمدہ اور کراری ہوتی تھی۔

وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش ہوتی تھی۔ اس کا سودا ہمیشہ کھرا ہوتا تھا۔ ہاتھ صاف اور تول پورا۔ گاہک کو اور کیا چاہیے؟ چندرو کی چاٹ اس نو آبادی میں چاروں طرف مقبول ہوتی گئی اور شام کے وقت اس کے ٹھیلے کے چاروں طرف نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ہجوم رہنے لگا۔ چندرو کو سدھو نے ڈیڑھ روپیہ روز پر لگایا تھا اور چندرو جو ڈیڑھ روپے میں خوش تھا اب تین روپیہ یومیہ پا کر بھی خوش تھا کیونکہ خوش رہنا اس کی عادت تھی۔

اسے کام کرنا پسند تھا اور وہ اپنا کام جانتا تھا اور اپنے کام سے اسے لگن تھی۔ وہ اپنے گاہکوں کو خوش کرنا جانتا تھا اور انہیں خوش کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ دن بھر وہ چاٹ تیار کرنے میں مصروف رہتا شام کے چار بجے وہ چاٹ گاڑی لے کر نالے پر آ جاتا۔ چار سے آٹھ بجے تک ہاتھ روکے بغیر آرام کا سانس لئے بغیر وہ جلدی جلدی کام کرتا۔ آٹھ بجے اس کا ٹھیلہ خالی ہو جاتا اور وہ اسے لے کر اپنے مالک کے گھر واپس آتا۔ کھانا کھا کر سینما چلا جاتا۔ بارہ بجے رات کو سینما سے لوٹ کر اپنی چٹائی بچھا کر سیڑھیوں کے پیچھے سو جاتا اور صبح پھر اپنے کام پر۔

یہ اس کی زندگی تھی۔ یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ بے فکر اور زندہ دل تھا۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن، نہ بچے نہ بیوی، دوسرے لوگوں کیلئے بہت سے خانے ہوتے ہیں۔ اس کا صرف ایک ہی خانہ تھا۔ دوسرے لوگ بہت سے ٹکڑوں میں بٹے ہوتے ہیں اور ان ٹکڑوں کو جوڑ کر ہی ان کی شخصیت دیکھی جا سکتی ہے مگر چندرو ایک لکڑی کے ایک ٹکڑے سے بنا تھا۔ جیسا وہ اندر سے تھا ویسا ہی وہ باہر سے بھی نظر آتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں بے جوڑ اور مکمل تھا۔ سانولی پارو کو اسے پریشان کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بالے جھلاتی پاؤں میں چھوٹی سی پازیب بجاتی جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کے ٹھیلے کے گرد کھڑی ہو جاتی تو چندرو سمجھ جاتا کہ اب اس کی شامت آئی ہے۔ دہی بڑے کی پتّل تقریباً چاٹ کر وہ ذرا سا دہی بڑا اس پر لگا رہنے دیتی اور پھر اسے دکھا کر کہتی۔

''اے گونگے! تو بہرہ بھی ہے کیا؟ میں نے دہی بڑے نہیں مانگے تھے'' دہی پٹا کری مانگی تھی۔ اب اس کے پیسے کون دے گا۔ تیرا باپ۔

(اتنا کہہ کر وہ اس بڑے کی تقریباً خالی پتّل کو اسے دکھا کر بڑی حقارت سے زمین پر پھینک دیتی)

وہ جلدی جلدی اس کیلئے دہی پٹا کری بنانے لگتا۔ پارو اس پٹا کری کی پتّل صاف کر کے اس میں آدھی پٹا کری چھوڑ دیتی اور غصے سے کہتی......

اتنی مرچ ڈال دی......اتنی مرچ......

چاٹ بنانا نہیں آتا ہے تو ٹھیلہ لے کر کیوں آتا ہے؟ لے اپنا پٹا کری واپس لے لے"۔

اتنا کہہ کر وہ دہی اور چٹنی کی پٹا کری اپنے ناخن کی کور میں پھنسا کر اس کی ٹھیلے پر گھماتی کبھی اسے جھوٹی پٹا کروں کے تھال میں واپس ڈال دینے کی دھمکی دیتی۔ اس کی سہیلیاں ہنستیں، تالیاں بجاتیں، چندرو دونوں ہاتھوں سے ناں ناں کے اشارے کرتا ہوا پارو سے اپنی جھوٹی پٹا کری زمین پر پھینک دینے کا اشارہ کرتا۔

"اچھا سمجھ گئی، تیرے چنوں کے تھال میں ڈال دوں...... وہ جان بوجھ کر اس کا اشارہ غلط سمجھتی! جلدی جلدی گھبراتے ہوئے انداز میں چندرو زور زور سے سر ہلاتا پھر زمین کی طرف اشارہ کرتا پارو کھلکھلا کر کہتی......

"اچھا زمین سے مٹی اٹھا کر تیرے دہی کے برتن میں ڈال دوں؟...... پارو نیچے زمین سے تھوڑی مٹی اٹھا لیتی۔

اس پر چندرو اور بھی گھبرا جاتا۔ دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا کر منع کرتا۔ بالآخر پارو اسے دھمکاتی۔

"تو چل جلدی سے آلو کی چھٹکیاں تل دے اور خوب گرم گرم مصالحے والے چنے دینا اور ادرک بھی نہیں تو یہ پٹا کری ابھی جائے گی تیرے کالے گلاب جامنوں کے برتن میں۔

چندرو خوش ہو کر چوڑی بتیسی نکال دیتا ہے۔ ماتھے پر آئی ہوئی ایک گھنگھریالی لٹ پیچھے کو ہٹا کے تولیئے سے ہاتھ پونچھ کے جلدی سے پارو اور اس کی سہیلیوں کیلئے آلو کی ٹکیاں تلنے میں مصروف ہو جاتا۔ پھر کبھی کبھی پارو حساب میں بھی گھپلا کیا کرتی۔

"ساٹھ پیسے کی ٹکیاں، تیس پیسے کی پٹا کری، دہی بڑے تو میں نے مانگے ہی نہ تھے۔ اس کے پیسے کیوں ملیں گے تجھے......؟ ہو گئے نوے پیسے، دس پیسے کل کے باقی ہیں...... لے ایک روپیہ!

گونگا چندرو پیسے لینے سے انکار کرتا وہ کبھی کبھی پارو کی شوخ چمکتی ہوئی آنکھوں کو

دیکھتا، کبھی اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں کپکپاتے ایک روپے کے نوٹ کو دیکھتا اور سر ہلا کر انکار کر دیتا اور حساب سمجھانے بیٹھتا۔ وہ وقت قیامت کا ہوتا تھا جب وہ پارو کو حساب سمجھاتا تھا دہی بڑے کے تھال کی طرف اشارہ کر کے اپنی انگلی کو اپنے منہ میں رکھ کر چپ چپ کی آواز پیدا کرتے ہوئے اس سے کہتا......

دہی بڑے تو کھا گئی ہو، اس کے پیسے کیوں نہیں دو گی......؟''

تیس پیسے دہی بڑے کے بھی لاؤ...... وہ اپنے گلے میں سے تیس پیسے نکال کر پارو کو دکھاتا۔ اس پر پارو فوراً چمک کر کہتی......''اچھا تیس پیسے مجھے واپس دے رہے ہو...... لاؤ''

اس پر چندرو فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتا......''نہیں''

انکار میں وہ سر ہلا کر پارو کو سمجھاتا......

''مجھے نہیں تمہیں دینا ہوں گے۔ یہ تیس پیسے......

وہ اپنی انگلی پارو کی طرف بڑھا کے اشارہ کر کے کہتا۔ اس پر فوراً پارو اسے روک دیتی......

''اے اپنا ہاتھ پیچھے رکھ! نہیں تو ماروں گی چپل'' اس پر چندرو گھبرا جاتا۔ پارو کی ڈانٹ سے لاجواب ہو کر بالکل بے بس ہو کر مجبور اور خاموش نگاہوں سے پارو کی طرف دیکھنے لگتا کہ پارو کو اس پر رحم آ جاتا۔ جیب سے پورے پیسے نکال کر اسے دیدیتی اور بولتی......

''تو بہت گھپلا کرتا ہے حساب میں کل سے تیرے ٹھیلے پر نہیں آؤں گی''۔

مگر دوسرے دن پھر آ جاتی تھی...... اسے چندرو کو چھیڑنے میں مزہ آتا تھا اور اب چندرو کو بھی مزا آنے لگا تھا۔ جس دن وہ نہیں آتی تھی حالانکہ اس دن بھی اس کی گاہکی اور کمائی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر جانے کیا بات تھی چندرو کو وہ دن سونا سونا سا لگتا تھا۔

جہاں پر اس کا ٹھیکہ رکھا تھا، وہ اس کے سامنے کی ایک گلی سے آتی تھی۔ پہلے پہل چندرو کا ٹھیلہ بالکل یونین بینک کے سامنے نالہ پر تھا ہولے ہولے چندرو اپنے ٹھیلے کو کھسکاتے کھسکاتے پارو کی گلی کے بالکل سامنے لے آیا۔ اب وہ دور سے پارو کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھ

سکتا تھا۔ پہلے دن جب اس نے ٹھیلہ یہاں لگایا تھا تو پارو ٹھیلے کی بدلی ہوئی جگہ دیکھ کر کچھ چونک تھی، کچھ غصہ سے بھڑک گئی تھی۔

''ارے نالے سے ادھر کیوں آ گیا رے گونگے؟''

گونگے چندرو نے ٹیلی فون ایکسچینج کی عمارت کی طرف اشارہ کیا، جہاں وہ اب تک ٹھیلا لگاتا آ رہا تھا۔ ادھر کیبل بچھانے کیلئے زمین کھودی جا رہی تھی اور بہت سے کالے کالے پائپ رکھے ہوئے تھے۔

وجہ معقول تھی، پارو لاجواب ہوگئی۔ پھر کچھ نہیں بولی۔ لیکن پھر جب کیبل بچھ گئے اور زمین کی مٹی ہموار کر دی گئی تو چندرو نے اپنا ٹھیلہ پھر بھی نہیں ہٹایا۔ تو پارو بھی کچھ نہ بولی۔ ہاں اس کے چنچل سبھاؤ میں ایک عجیب سی تیزی سی آ گئی۔ وہ اسے پہلے سے زیادہ ستانے لگی۔

پارو کی دیکھا دیکھی اس کی دوسری سہیلیاں بھی چندرو کو ستانے لگیں اور کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی۔ مگر لڑکوں کو تو چندرو ڈانٹ دیتا اور وہ جلدی سے بھاگ جاتے۔ ایک بار اس نے پارو کی سہیلیوں سے عاجز آ کر انہیں بھی ڈانٹ پلائی تو پارو اس قدر ناراض ہوئی کہ اگلے تین چار روز تک چندرو کو ستانا بند کر دیا۔ اس پر چندرو کو ایسا لگا کہ آسمان اس پر ڈھے پڑا ہو۔ یا اس کی پیروں تلے زمین پھٹ گئی ہو۔ یہ پارو مجھے ستاتی کیوں نہیں ہے؟ طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اس نے چاہا کہ پارو اسے ڈانٹ پلائے لیکن جب اس پر بھی انداز نہیں بدلے اور وہ ایک مہذب متمدن لیکن چاٹ بیچنے والے چندرو جیسے چھوکروں کو فاصلے پر رکھنے والی لڑکی کی طرح اس سے چاٹ کھاتی رہی تو چندرو اپنی گونگی حماقتوں پر بہت نادم ہوا۔

ایک دفعہ اس نے بجائے پارو کے خود حساب میں گھپلا کر دیا۔ سوا روپیہ بنتا تھا، اس نے پونے دو روپے طلب کئے جان بوجھ کر خوب لڑائی کی...... جم کے لڑائی ہوئی۔ بالآخر چندرو نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور یہ گویا ایک طرح سے پچھلی تمام غلطیوں کی بھی تلافی تھی۔

چندرو بہت خوش ہوا، کیونکہ پارو اور اس کی سہیلیاں اسے پھر ستانے لگی تھیں۔

بس اسے اتنا کچھ ہی چاہیے۔ ایک پازیب کی کھنک اور شریر ہنسی جو پھلجھڑی کی طرح

اس کی گونگی سنسان دنیا کے ویرانے کو ایک لمحہ کیلئے روشن کر دے۔ پھر جب پارو کے قدم سہیلیوں کے قدموں میں گڈ مڈ ہو کے چلے جاتے تو وہ جھوم جاتا اس کی پازیب کی موسیقی ہی کچھ اور تھی۔ یہ موسیقی جو اس کے کانوں میں نہیں اس کے دل کی تنہا تاریک اور شرمیلے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔ بس اتنا ہی کافی تھا اور وہ اسی میں خوش تھا۔

اچانک مصیبت نازل ہوئی ایک دوسرے ٹھیلے کی صورت میں۔ کیا ٹھیلہ تھا یہ! بالکل نیا اور جدید ڈیزائن کا۔ چاروں طرف چمکتا ہوا کانچ لگا تھا۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں، چاروں طرف لال پیلے، اودے اور نیلے رنگ کے کانچ تھے۔ گیس کے دو ہنڈے تھے۔ جن سے ٹھیلہ بقعہ نور بن گیا تھا۔ پتل کی جگہ چمکتی ہوئی پلیٹیں تھیں۔ ٹھیلے والے کے ساتھ ایک چھوٹا سا چھوکرا بھی تھا، جو گاہک کو بڑی مستعدی سے ایک پلیٹ اور ایک صاف ستھری نیپ کن بھی پیش کرتا تھا اور پانی بھی پلاتا تھا۔ چاٹ والے کے گھڑے کے گرد موگرے کے پھولوں کا ہار بھی لپٹا ہوا تھا اور ایک چھوٹا سا ہار چاٹ والے نے اپنی کلائی پر باندھ رکھا تھا اور جب وہ مصالحہ دار پانی میں گول گپے ڈبو کر پلیٹ میں رکھ کر گاہک کی طرف سرکاتا تو اس کی کراری خوشبو کے ساتھ گاہک کے نتھنوں میں موگرے کی مہک بھی شامل ہو جاتی اور گاہک مسکرا کر نئے چاٹ والے سے گویا تمغے کی طرح اس پلیٹ کو حاصل کر لیتا۔ اور نیا چاٹ والا گونگے چاٹ والے کی طرف تحقیر سے دیکھ کر پرنخوت آواز میں زور سے کہتا......

''چکھیئے......''

ایک ایک دو دو کر کے چندرو کے بہت سے گاہک ٹوٹ کر نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع ہونے لگے تو بھی چندرو کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ پھر آ جائیں گے، یہ اونچی دوکان پھیکے پکوان والے کب تک چندرو کی سچی اصلی اور صحیح مصالحوں میں رچی ہوئی چاٹ کا مقابلہ کریں گے ہم بھی دیکھ لیں گے......اس نے دو ایک گاہکوں کو نئے چاٹ والے کی طرف جاتے ہوئے کنکھیوں سے دیکھ بھی لیا تھا اور اسے ابھی معلوم ہو چکا تھا کہ چکنی چمکتی پلیٹوں اور ہوٹل نما سروس کے باوجود انہیں نئے چاٹ والے کی چاٹ زیادہ پسند نہیں آ رہی ہے۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر اپنے کام میں جت گیا۔ یکا یک اس کے کانوں میں پازیب کی ایک کھنک سنائی دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک گیا۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

گلی سے پارو پازیب کھنکھناتی اپنی سہیلیوں کے سنگ برآمد ہو رہی تھی۔ جیسے چڑیاں چہکیں ایسے وہ لڑکیاں بول رہی تھیں۔ کتنی ہی بڑی بڑی اور شوخ نگاہیں تھیں۔ فضا میں ابابیلوں کی طرح طرح تیرتی ہوئی سڑک پار کر کے وہ اس کے ٹھیلے کی طرف بڑھنے لگیں......

اچانک پارو کی نگاہ نئے ٹھیلے والے کی طرف اٹھی۔ وہ رک گئی......

اس کی سہلیاں بھی رک گئیں......

وہ سانس لئے بغیر پارو کی طرف دیکھنے لگا......

پارو نے ایک اچٹتی سی نگاہ چندرو کے ٹھیلے پر ڈالی۔ پھر نخوت سے اس نے منہ پھیر لیا، اور اک ادائے خاص سے مڑ کر اپنی سہیلیوں کو لے کر نئے ٹھیلے کے پاس پہنچ گئی۔

''تم بھی؟......تم بھی؟...... پارو تم بھی......؟

چندرو کا چہرہ غصہ وشرم سے لال ہو گیا۔ رگوں اور نسوں میں خون گونجنے لگا، جیسے اس کا حلق خون سے بھر گیا ہو۔ وہ کچھ بول بھی نہیں سکا۔ مگر اسے دیکھ کر لگتا تھا، جیسے بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ اس موٹی دیوار کو توڑ دے گا جو اس کی روح کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ابھی چیخ کر کہے گا......تم بھی!......تم بھی!...... پارو! تم بھی! ؟''......مگر خون اس کے حلق میں بھر گیا تھا۔

اس کے کان کسی بڑھتے ہوئے طوفان کی آوازیں سن رہے تھے اور اس کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گویائی کی آخری کوشش گویا کسی لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی اور وہ سر جھکا کر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

مگر اس بے چین پازیب کی کھنک ابھی تک اس کے دل میں تھی...... پارو اور اس کی سہیلیاں نئے ٹھیلے والے کے گرد جمع انواع واقسام کی چاٹیں کھائے چلی جا رہی تھیں اور بیچ بیچ

میں تعریفیں کرتی جا رہی تھیں۔ ان سب میں پارو کی آواز سب سے اونچی تھی۔

''ہائے کیسی لذیذ چاٹ ہے! کیسے برابر کے مصالحے ہیں......اس موئے (نام نہ لے کر محض اشارہ کر کے) پرانے ٹھیلے والے کو تو چاٹ بنانے کی تمیز ہی نہیں ہے''۔

''اب تک جھوٹی پتلوں میں چاٹ کھلاتا رہا ہے''

''اری اس کی طرف دیکھو......'' پارو نے چمک کر چندرو کی طرف اشارہ کیا۔

''کتنا گندہ اور غلیظ......معلوم ہوتا ہے سات دن سے نہایا نہیں......''

ایک نیپ کن تو ہے نہیں اس کے پاس!...... جب ہاتھ پونچھنے کیلئے پونچھنے کیلئے مانگو وہ ہی اپنا......گندا میلا تولیہ آگے کر دیتا ہے''۔

''اونہہ''...... پارو کے پتلے پتلے ہونٹ نفرت سے خم ہو گئے ہیں......میں تو کبھی اس چاٹ والے کے ٹھیلے پر تھوکوں بھی نا۔

اس کے آگے چندرو کچھ سن نہ سکا۔ ایک لال آندھی اس کی آنکھوں میں چھا گئی۔ وہ گونگوں کی سی ایک وحشت زدہ چیخ کے ساتھ اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر آگے بڑھا اور اس نے نئے ٹھیلے والے کو جا لیا اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ لڑکیاں چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئیں۔

چندرو نئے ٹھیلے والے اور اس کے چھوکرے دونوں پر بھاری ثابت ہوا۔ چندرو ایک وحشی جانور کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس نے نئے ٹھیلے والے کو مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے ٹھیلے کے سارے کانچ توڑ ڈالے، چھوکرے کی پٹائی کی۔ نیا ٹھیلہ مع اپنے ساز و سامان کے سڑک پر اوندھا کر دیا۔ پھر سڑک کے بیچ کھڑے ہو کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی......

عدالت میں اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ عدالت نے اسے دو ماہ قید کی سزا دی اور پانچ سو روپیہ جرمانہ اور جرمانہ نہ دینے کی صورت میں چار ماہ قید بامشقت۔

سدھو حلوائی نے جرمانہ نہیں بھرا۔

اور دوسرا کون تھا جو جرمانہ ادا کرتا؟

چندرو نے پورے چھ ماہ کی جیل کاٹی......

جیل کاٹ کر چندرو پھر سدھو حلوائی کے گھر پہنچ گیا۔کوئی دوسرا اس کا ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔سدھو حلوائی پہلے اسے دیر تک گالیاں دیتا رہا اور اس کی حماقت پر اسے بے نقط سناتا رہا اور دیر تک چندرو سر جھکائے خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔اگر وہ گونگا نہ بھی ہوتا تو کسی سے کیا کہتا۔اس کا جرم یہ نہیں تھا کہ اس نے ایک ٹھیلے والے کو مارا تھا اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک پازیب کی کھنک سنی تھی۔

جب سدھو حلوائی نے خوب اچھی طرح گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لی، تو اس نے اسے پھر کام پر لگا لیا۔آخر کیا کرتا......؟ چندرو بے حد ایماندار محنتی اور اپنے کام میں مشاق تھا۔اب جیل کاٹ کر آیا ہے کہ تھوڑی عقل بھی آ گئی ہوگی کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔اس نے خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کر دو تین دن بعد پھر سے چندرو کو اسی اڈے پر ٹھیلہ دے کر روانہ کر دیا۔

چندرو کی غیر حاضری میں سدھو نے ایک اچھا کام کیا تھا۔اس نے چندرو کے ٹھیلے پر نیا رنگ روغن کروا دیا۔کانچ بھی لگا دیا تھا۔پتلوں کی جگہ کچھ سستی قسم کی چینی کی پلیٹیں اور چمچے بھی رکھ دیئے تھے۔

چندرو چھ ماہ بعد پھر سے ٹھیلہ لے کر روانہ ہوا۔آٹھویں دسویں اور گیارہویں سڑک پار کر کے لنک روڈ کے ناکے پر آیا۔یونین بینک سے گھوم کر ٹیلی فون ایکسچینج کے پاس پہنچا۔اس نے دیکھا، جہاں پر پہلے اس کا ٹھیلہ تھا، اب اس جگہ اس نئے ٹھیلے والے نے قبضہ کر لیا تھا۔وہی چھوکرا ہے، وہی ٹھیلہ والا ہے۔اس ٹھیلے والے نے چندرو کو گھور کر دیکھا۔چندرو نے اپنی نظریں چرا لیں۔اس نے نئے ٹھیلے والے سے کچھ فاصلہ پر ایکسچینج کے ایک طرف اپنا ٹھیلہ روک دیا، اور گاہکوں کا انتظار کرنے لگا۔

چار بج گئے، پانچ بج گئے، چھ بج گئے۔کوئی گاہک اس کے پاس نہیں پھٹکا۔دو ایک گاہک آئے مگر وہ نئے تھے اور اسے جانتے نہیں تھے۔چار چھ آنے کی چاٹ کھا کر چل دیئے۔

افسردہ دل چندرو سر جھکائے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کبھی تولیہ لے کر کانچ چمکاتا۔ ڈوئی ڈال کر گھڑے میں مصالحہ دار پانی کو ہلاتا۔ انگیٹھی میں آنچ ٹھیک کرتا۔ ہولے ہولے آلو کے بھرتے میں مٹی کے دانے اور مصالحے ڈال کر ٹکیاں بناتا رہا۔

یکا یک اس کے کانوں میں پازیب کی کھنک سنائی دی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خون رخساروں کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ اپنے جھکے ہوئے سر کو اوپر اٹھانا چاہتا تھا۔ مگر اس کا سر اوپر نہیں اٹھتا تھا...... پازیب کی کھنک اب سڑک پر آ گئی تھی۔

پھر جسم و جان کا زور لگا کر اس نے اپنی گری ہوئی گردن کو اوپر اٹھایا اور جب دیکھا تو اس کی آنکھیں پارو پر جمی کی جمی رہ گئیں اس کے ہاتھ سے ڈولی گر گئی اور تولیہ اس کے کاندھے سے اتر کر نیچے بالٹی میں بھیگ گیا اور گاہک نے قریب آ کر کہا۔

''مجھے دو سمو سے دو''

مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ اس کے بدن میں جتنے حواس تھے، جتنے احساس تھے، جتنے جذبات تھے، سب کھینچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔ اب اس کے پاس کوئی جسم نہ تھا۔ صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں۔

یہ اس کا ٹھیلہ تھا۔ چند قدم پر دوسرا ٹھیلہ تھا اور وہ تکے جا رہا تھا...... پارو کدھر جائے گی۔

ہولے ہولے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے گاہے گاہے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ لڑکیاں سڑک پر چلتے ہوئے اس دونوں ٹھیلوں کے قریب آ رہی تھیں۔ زیر لب بحث دھیرے دھیرے ساتھ چل رہی تھی۔

یکا یک جیسے اس بحث کا خاتمہ ہو گیا۔ لڑکیوں نے سڑک پار کر کے نئے ٹھیلے والے کو گھیر لیا۔

مگر چندرو کی نگاہیں نئے ٹھیلے کی طرف نہیں پھریں، وہ اس خلاء میں دیکھ رہا تھا، گلی اور سڑک کے سنگھم پر جہاں آج چھ ماہ بعد اس نے پارو کو دیکھا تھا۔ وہ سر اٹھائے دنیا و مافیہا،

گردو پیش سے بے خبر ادھر ہی دیکھتا رہا۔ وہ پتھر کی طرح کھڑا صرف خلا میں دیکھ رہا تھا۔ یکا یک بڑی تیزی سے اکیلی پاروا پنی سہیلیوں سے کٹ کراس کے ٹھیلہ پہ آ گئی، اور چپ چاپ اس کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑی ہوگئی اسی لمحہ گونگا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ آنسو نہیں تھے، الفاظ تھے...... شکرانے کے...... دفتر تھے شکایتوں کے...... ابلتے ہوئے آنسو...... فصیح اور تبلیغ جملوں کی طرح اس کے گالوں پر بہتے آرہے تھے اور پارو سر جھکائے سن رہی تھی۔

آج پارو گونگی تھی اور چندرو بھول رہا تھا...... ارے وہ کیسے کیسے اس گونگے سے کہے پارو نے بھی تو چھ ماہ انہی آنسوؤں کا...... انہی آنسوؤں کا انتظار کیا تھا......

◆◆◆

جہلم میں ناؤ پر

گٹالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا۔ لاری مسافروں سے کچھا کھچ بھری ہوئی تھی اور تمازت آفتاب نے اور بھی حبس پیدا کر دیا تھا۔ میں درمیانے درجے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اب بس والوں نے بھی ریلوے کی طرح مختلف درجے بنا دیے ہیں اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ کوئی موٹر نہ ملی ورنہ راستہ آسانی سے طے ہو جاتا۔ یوں بھی تمام بس میں دل بستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ میرے دائیں طرف مور کی طرح طرہ پھیلائے ہوئے ایک تھانیدار صاحب تشریف فرما تھے جو بار بار مونچھوں کو تاؤ دیئے جا رہے تھے۔ سب سے آگے اول درجے کی نشست پر یعنی ڈرائیور کے بالکل قریب ایک تحصیلدار صاحب جلوہ افروز تھے جن کی خندہ پیشانی اور ڈھیلے صافے سے ان کی دلی طمانیت کا اظہار ہوتا تھا۔ میرے سامنے کی نشست پر چار عورتیں بیٹھی تھیں، دو بالکل بوڑھی اور دو ادھیڑ عمر کی تھیں مگر جو عورت میرے مقابل بیٹھی تھی اور اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لیے تھی وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور زیادہ بدصورت تھی۔ وہ کبھی کبھی گھونگٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں ہے۔ یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں بچ گیا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا۔ میں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور بس کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر، آہ اس مسافروں سے بھری ہوئی بس جو اپنی زندگی کی منزل کو بے تحاشا بھاگی جا

رہی تھی۔ مجھے کہیں بھی روان نظر نہ آیا۔ دل برداشتہ چہرے تھے اور حقے یا پھر تھانیدار صاحب کا مورچھل۔ میں نے ایک لمحہ کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں کہا کہ اس بس میں سب کچھ ہے، مگر حسن ناپید ہے۔ دوسرے لمحے میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کم عمر بدصورت عورت اپنے چھوٹے بچے پر جھکی ہوئی اسے نہایت مدھم آواز میں میری گود میں چلے جانے کو کہہ رہی تھی۔

اس نے اپنی سانولی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھ کر گھٹے ہوئے لہجہ میں کہا۔

''آہ میں کس قدر تھک گئی ہوں، میرا سانس گھٹا جا رہا ہے''۔

بے چاری غریب عورت! میرا مطلب یہ ہے کہ گو وہ ریشم میں ملبوس تھی اور بے حد بدصورت تھی۔ پھر بھی عورت فطرتاً غریب اور کمزور ہوتی ہے، چنانچہ میں نے چھوٹے بچے کو اپنی رانوں پر لے لیا۔ عورت نے احسان مند نگاہوں سے میری طرف دیکھا، پھر کھڑکی سے سر باہر نکال کر قے کرنے لگی۔

عشق کی مجبوریاں، ناچاریاں، میں نے جلدی سے ننھے کو تھانیدار صاحب کی آغوش میں دھکیل دیا اور خود اٹھ کر ڈرائیور کو لاری ٹھہرانے کیلئے کہا۔

ڈرائیور بولا۔ ''سرکار یہاں لاری ٹھہرانے سے کیا فائدہ، بس کٹالیاں کا گھاٹ کوئی پون میل رہ گیا ہے، وہیں ٹھہراؤں گا۔ کسٹم کی چوکی پر، دریا کے کنارے، دریا کی ٹھنڈی ہوا سے ان کی طبیعت راس ہو جائے گی۔

چنانچہ یہی ہوا۔

کٹالیاں اور شہر جہلم کے درمیان دریائے جہلم بہتا ہے۔ اس لئے شہر جہلم کو جانے کیلئے کٹالیاں کی چونگی پر عموماً ہر وقت بھیڑ سی لگی رہتی ہے۔ ریاست جموں کو جاتے ہوئے مسافروں کا تانتا، ریاست جموں سے جہلم آتے ہوئے لوگ اسباب سے لدے ہوئے بیل یا گدھے، چونگی پر ٹھہری ہوئی بے شمار لاریاں اور دریا کے کنارے بندھے ہوئے لمبے لمبے مچھوے، ایک چھوٹی بندرگاہ کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اسی بھیڑ بھاڑ میں میں نے

تھانیدار صاحب، تحصیلدار صاحب اور کم عمر بدصورت کو بھی کھو دیا۔ میرا اسباب مختصر سا تھا۔ اس لئے چونگی والوں سے جلدی خلاصی کرالی اور ایک چھوٹے سے قلی پر اسباب لادکر میں دریا کی سمت چلا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ گٹالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا۔ سر میں درد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن اب جوں جوں دریا کے وسیع پانیوں سے ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے آنے لگے۔ طبیعت صاف ہوتی گئی اور جب دریا کے کنارے پہنچا ہوں تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی نہا کر اٹھا ہوں، لمبی لمبی دریائی گھاس جو کنارے پر اگی ہوئی تھی، ایک لطیف خوشبو لئے ہوئے تھی، جس نے بے حس نتھنوں کو بیدار کر دیا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ جس پر چلتے ہوئے بڑے بڑے مچھوے اور چھوٹی کشتیاں ملاحوں کی پرشور راگنیاں اور لمبی لمبی ڈانڈوں کے پانی کو چیرنے کی مدھم آوازیں، ایک پرکیف منظر پیش کر رہی تھیں۔

چھوٹے سے دبلے پتلے قلی نے کاؤ کے ایک درخت کے نیچے میرا اسباب اتار کر رکھا تھا۔ درخت کی چھدری چھدری چھاؤں میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت سا اسباب لیے بیٹھے تھے۔ غالباً کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے قلی کو جیب سے دونی نکال کر دی اور اس سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے''۔

''عبداللہ''

''تو عبداللہ ہمیں کہیں سے کشتی کا انتظار کر دو، دیکھو؟ ضرور''

عبداللہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ''صاحب ایک کشتی تو میری اپنی ہی ہے، ٹھہریئے، میں اپنے چھوٹے بھائی کو بلاتا ہوں۔ ہم دونوں آپ کو پار لے چلیں گے، ساڑھے تین روپے کرایہ ہوگا''۔

جب عبداللہ چلا گیا تو میں زمین پر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھا، ریت کے بڑے بڑے نیلے کائی اور تنگ درختوں کے جھنڈ، اڑتے ہوئے ماہی خور، پھر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف توجہ کی۔ لڑکی پیٹھ موڑے، دریا کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ اس نے ایک گہرے رنگ کی

سبز ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس کا کنارہ سنہری تھا۔ لڑکا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھورے رنگ کا کوٹ اور ایک خاکی نکر پہن رکھی تھی۔ گلے میں ایک خوش رنگ ٹائی بھی تھی۔

مجھے اپنی طرف مڑتے دیکھ کر کہنے لگا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''جہلم کے پار ایک گاؤں ہے، وہاں میرا گھر ہے۔ بس وہیں جا رہا ہوں اور آپ؟'' میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے جوابدیا۔ ''ہم لاہور جا رہے ہیں۔ میں تو جموں میں تعلیم پاتا ہوں مگر یہ...... میری ہمشیرہ ہیں، لاہور ایف اے میں تعلیم پاتی ہیں۔ انہیں پہنچانے جا رہا ہوں، اس سفر میں بہت پریشانی دیکھنا پڑتی ہے۔ اب یہاں ملاح بہت تنگ کرتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ سے بیٹھے کہ کوئی چھوٹی سی کشتی علیحدہ ہمارے لئے مل جائے تو اس میں سوار ہو کر پار چلے جائیں مگر یہ ملاح لوگ کہتے ہیں کہ کوئی چھوٹی کشتی سرے سے ہے ہی نہیں۔ سب بڑے بڑے مچھورے ہیں۔ جن کے دام بھی بہت مانگتے ہیں۔ آٹھ روپیہ، دس روپیہ، یہ تو دن دہاڑے ڈاکہ ہے۔ کتنی پریشانی اٹھانی پڑتی ہے''۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ گھبرایئے نہیں، ابھی کشتی مل جائے گی۔ میں سب انتظام کیے دیتا ہوں اور ہم آرام سے جہلم پہنچ جائیں گے''۔

لڑکی نے میری طرف دیکھا اگر میں یہ کہہ دوں کہ اس جیسا خوبصورت اور بھولا بھالا چہرہ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا تو یقیناً جھوٹ ہوگا لیکن یہ کہہ دینے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ اس کے چہرے میں کچھ ایسی عجیب کشش تھی۔ جس نے مجھے ایک دم مسحور کر لیا۔ صرف ایک لمحہ کیلئے اس نے میری طرف دیکھا۔ پھر وہ گھنی گھنی پلکیں اس کے رخساروں پر جھک گئیں۔ وہ کشمیر کے حسن صبیح کا ایک نادر نمونہ تھی، دلکش خدوخال، سروقد، دلآویز رنگت۔ لیکن جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی ظاہری خوبصورت سے بھی بڑھ کر اس کی نگاہوں کا حزن وملال تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا۔ اف، وہ المناک گہرائیاں۔ اس ایک لمحہ میں مجھے ایسا

محسوس ہوا کہ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کسی گہرے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ پھر یکا یک مجھے ٹھوکر سی لگی اور میں نے اپنے آپ کو کنارے پر پایا۔ کسی قدر عجیب احساس تھا، مگر یہ احساس صرف ایک لمحہ تک ہی محدود تھا۔ دوسرے لمحہ میں وہ جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اب اس کا چہرہ صاف اور بھولا بھالا تھا۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری، میرے دل پر ایک نیم اضطراری کیفیت طاری ہوگئی۔

اتنے میں اور دو مسافر آ کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ پہلے ایک بوڑھا آدمی، سفید ریش لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور ''رام رام'' کرتا ہوا میرے نزدیک بیٹھ گیا۔ پھر بچہ اٹھائے ہوئے وہی کم عمر کی بدصورت عورت نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک قلی ٹرنک اور گٹھری اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ عورت بھی لڑکی کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور چھوٹا بچہ سبز ساڑھی کے پلو کو کھینچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ بھی آ گیا اور کچھ وقفے کے بعد اس کا بھائی ایک کشتی کو کنارے پر لے آیا۔

عبداللہ نے مجھے مسکرا کر کہا۔ ''چلئے کشتی میں بیٹھئے''۔

بوڑھے آدمی نے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مجھے بھی لے چلو بابا۔ رام تمہارا بھلا کرے''۔

بدصورت عورت بھی اٹھ کھڑی ہوئی کہنے لگی۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں بھی اس کشتی میں بیٹھ جاؤں۔ مجھے آج گوجرانوالہ پہنچنا ہے۔ اگر یہ گاڑی نہ ملی تو پھر......اب شام بھی ہوتی جا رہی ہے اور میں اکیلی ہوں''۔

ہم سب کشتی میں جا کر بیٹھ گئے، قلیوں نے مال و اسباب کشتی میں قرینے سے رکھ دیا۔

عبداللہ اور اس کے بھائی نے آستینیں اوپر چڑھا لیں اور ایک ایک ڈانڈا ہاتھ میں لے کر کشتی کے دونوں سروں پر کھڑے ہوگئے۔

اللہ کا نام لے کر کشتی چلی۔ عبداللہ نے گانا شروع کیا۔

جس داناں لیندیاں بیڑا پار روے

ڈاچی والیا موڑ مہار و ے

عبداللہ نے رک کر پوچھا ''آپ کو میرے گانے پر کوئی اعتراض تو نہیں''۔

لڑکے نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں نہیں، ضرور گاؤ، تمھاری آواز بہت اچھی ہے۔''

''عبداللہ نے پھر گانا شروع کیا۔ وہی ڈاچی کا پرانا گیت جسے گانے کیلئے سوز چاہیے ساز نہیں۔

ایک سانڈنی سوار کو صحرا میں سے گزرتے دیکھ کر ایک اداس حسینہ جو اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہے اسے رک جانے کو کہتی ہے اور پھر اسے التجا کرتی ہے کہ تو مجھے سانڈنی پر بٹھا کر میرے بچھڑے ہوئے محبوب سے ملا دے۔

ڈاچی والیا! موڑیں مہار و ے

ڈاچی والیا! لے چل نال و ے

لڑکے نے کہا۔ ''ظالم! بہت اچھا گاتا ہے، کیا سریلا ہے، مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ ذرا سنو تو......

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بھائی کے شانوں سے سر لگائے ایک طرف بیٹھی تھی، آہستہ سے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے لبوں پر ایک عجیب یاس انگیز مسکراہٹ آ گئی۔ نہایت آہستہ آہستہ اس نے اپنے بازو چھاتی پر باندھ لیے اور ٹانگیں پھیلا کر نشست پر لیٹ گئی۔ اس طرح کہ اس کے نصف چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے خوبصورت ہاتھوں کو، اس کے نازک ٹخنوں کو۔

میری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں

میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں

عبداللہ کی پرسوز آواز نے میری جذبات کی سمٹی ہوئی دنیا میں طلاطم پیدا کر دیا۔ میرا دل ایک عجیب لذت درد کے مزے لینے لگا۔ یہ کیسی خلش تھی۔ ہلکی میٹھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نغمے کی ہر لے میں کسی مہجور حسینہ کی روح کھچی ہوئی چلی آ رہی ہے، یا دریائے جہلم کی وسیع چادر آب ایک صحرا ہے۔ جس میں ہماری کشتی ''ڈاچی'' بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی ہے،

روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کیلیئے۔

ڈاچی ....

میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں

لڑکی نے چپکے سے ساڑھی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے، اس کے بھائی نے نہیں دیکھا۔لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔کیا ڈاچی کے حسین نغمے نے لڑکی کے دل میں محبت کی دبی ہوئی آگ کو روشن کر دیا تھا، نہیں تو یہ آنسو کیسے؟ میرا دل اس بھید کو جاننے کے لئے بے تاب ہو گیا۔، وہ کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی یاد میں رو رہی تھی؟ میں نے چاہا کہ میں گلاب کی نرم و نازک پتیوں سے اس کے آنسو پونچھ ڈالوں۔اور اس سے پوچھوں۔ بتا اے حسینہ! تجھے کیا غم ہے؟''

اس کے بجائے میں نے اس بدصورت عورت کی شرمائی ہوئی نگاہیں اپنے چہرے پر جمی ہوئی دیکھیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے لجا کر اپنی آنکھیں نیچے کر لیں اور اپنے بچے پر جھک گئی۔

چھلک...... چھلک...... چھلک...... چھلک...... کشتی بھاگی جا رہی تھی۔ ڈانڈ ایں باری باری ہل رہی تھیں۔مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔دریا میں ڈوب رہا تھا۔دریا کی خاموش سطح پر ایک عجیب نازک، نرالی، سحر طراز روشنی پھیل گئی تھی۔ میں نے سمجھا یہ غروب آفتاب نہیں، نمود سحر ہے، مغرب نہیں مشرق ہے۔روشنی کا منبع اعظم ہے۔ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی نہ غرق ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں اپنے ابدی محبوب سے۔

''میں تاں ماہی نون مناون چلیاں''

چپ......چپ......چپ......شپ کشتی بھاگی جا رہی تھی۔

شام ہو گئی۔اندھیرا بڑھتا گیا، عبداللہ خاموش ہو گیا۔ پھر ایک دلکش انداز سے سفید دودھ جیسی بے داغ چاندنی کھل گئی۔ اور مجھے ڈل میں تیرتے ہوئے کنول کے پھول یاد آ گئے۔کشتی کے چاروں طرف دور دور تک پانی کی ہلکی ہلکی ٹوٹتی ہوئی لہروں پر ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ کنول کے لاکھوں پھول کھل گئے ہیں۔

بوڑھا آہستہ آہستہ ''رام رام'' جپ رہا تھا۔ بدصورت عورت دزدیدہ نگاہوں سے کبھی مجھے، کبھی خاموش لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیتی تھی۔ لڑکے نے ایک دوبار اپنی بہن کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بے چاری شاما، سفر کی تکان سے چور ہو کر آخر سو گئی ہے۔ یہ سفر کتنا پریشان کن ہے''۔

کیا واقعی سو رہی تھی، یا آنکھیں بند کیے کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت ایک مرمریں مجسمہ کی طرح پڑی تھی، یا کسی سپنے کی ٹھنڈی چھاؤں میں، ستاروں کی کپکپاتی ہوئی لامتناہی دنیا میں اپنے محبوب سے مل رہی تھی۔ یا پھر اس کی آوارہ روح چاند کی کرنوں میں بھٹکتی ہوئی کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ ہاں مگر کس کو؟

آخر ایک طویل عرصہ کے بعد اس طویل سکونت کو عبداللہ نے توڑ دیا۔ ''لو کنارہ آ گیا'' اس نے ڈانڈا کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

کنارے پر پہنچ کر میں نے لڑکے سے کہا۔ ''آپ جا کر تانگہ وانگہ درست کریں۔ میں یہاں قلیوں کا انتظام کرتا ہوں''۔

تانگے والوں کا اڈا کوئی فرلانگ بھر دور تھا۔ لڑکا تانگے کا انتظام کرنے گیا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ''ذرا کہیں سے قلیوں کو تو بلوا دو''۔

عبداللہ کہنے لگا۔ ''اب اس وقت یہاں دریا کے کنارے قلی کہاں سے آئیں گے''۔

''تو پھر اب کیا کیا جائے؟''

''میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ہم دونوں بھائی دو تین پھیرے لگا کر آپ کا اسباب تانگوں پر رکھ دیں۔ چار آنے فی پھیرا لیں گے۔''

''اچھا یونہی سہی، اٹھاؤ اسباب اور ان (بدصورت عورت کی طرف اشارہ کر کے) کو بھی اڈے پر لے چلو''۔

عبداللہ کے آخری پھیرے پر میں نے کشتی میں سوئی ہوئی لڑکی کو جگا دیا۔ ''اٹھیئے

اب تو جہلم کا دوسرا کنارہ بھی آ گیا''۔

میری زبان سے پہلا لفظ ادا ہونے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یقیناً سو نہیں رہی تھی۔ چاندنی رات میں اس کا رنگ زعفران کے پھول کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹوں پر وہی یاس انگیز مسکراہٹ تھی۔

میں نے بٹوے سے ایک روپیہ نکال کر کہا ''ایک روپیہ کا خردہ ہوگا''

اس نے ہینڈ بیگ کھول کر پیسے نکالے۔ اور مجھے دے دیئے۔ وہ نرم و نازک مخروطی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی تھیں۔

میں نے عبداللہ کو انعام دیا۔ اس نے جھک کر ہم کو سلام کیا اور پھر ہماری طرف پیٹھ موڑ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔

ہم خاموش چلے جا رہے تھے۔ ہمارے آگے بوڑھا لاٹھی ٹیکتا جا رہا تھا۔ چند قدم چل کر میں نے شاما سے جرات کر کے پوچھا۔ ''آپ کشتی میں رو رہی تھیں، کیوں؟''

وہ خاموش چلتی گئی۔ سر جھکائے ہوئے۔ میں نے پھر کہا۔ ''میں نے یقین جانیئے نہایت دلی خلوص سے سوال کیا ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ آپ اپنا دکھ مجھ سے کہہ سکیں اور اس میں آپ کے کسی کام آ سکوں، کوئی حرج ہے؟''

اس نے غمناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ یکا یک کچھ سن کر وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر ٹھٹک گئی، وہ گرنے کو تھی کہ میں نے اسے ایک بازو سے تھام کر سہارا دیا۔ عبداللہ چاند کی طرف منہ کئے ہوئے گا رہا تھا۔

ساڈی ڈاچی دے گل وچ ڈھولنا
جھوٹے سجناں دے نال کی بولنا
ڈاچی والیا موڑیں.........................

آواز، ایسا محسوس ہوا تھا کہ دور پرے پھیلے ہوئے پانیوں پر چاند کی سحر فشاں کرنوں پر لرزتی ہوئی آ رہی تھی۔ انداز بیان میں بلا کی شوخی تھی۔ اور فقروں میں ایک بے پناہ طنز جو دل کو

چھیدے ڈالتی تھی۔ میں نے لڑکی طرف دیکھا وہ کانپ رہی تھی اور جلد جلد قدم اٹھانے کی کوشش کررہی تھی۔شاید وہ اس حزیں نغمے کے سیل بے پناہ سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔وہ طوفان جواس کی بےقرارروح کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟

باقی راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ جب میں انہیں تانگوں پر سوار کرا چکا تو لڑکے نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔''شکریہ بہت شکریہ ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی......کیا آپ کا گاؤں یہاں سے نزدیک ہے؟''

''......بس کوئی تین چار میل ہوگا، وہ سیدھی پگڈنڈی جارہی ہے...... پیدل ہی جانا ہوگا......؟

بدصورت عورت نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑےاور پھر سر جھکالیا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا، دو دفعہ، ایک دفعہ بدصورت عورت کو دیکھ کر، اور آخری بار لڑکی کو دیکھ کر،لڑکی نے میری طرف مبہم،خمار آلود، اندوہگیں نگاہوں سے دیکھا، وہ نگاہیں شاید کھل کر دل کا راز کہہ دینا چاہتی تھیں،مگر کامیاب نہ ہوسکیں۔ان آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی مگر پھر فوراً ہی گم ہوگئی۔جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں کھو جائے۔اس کا داہنا بازو تھوڑا سا اوپر اٹھا اور نیچے گر گیا۔ چوڑیوں کی جھنکار پیدا بھی ہوئی اور پھر ایک لمحہ میں لرزتی ہوئی کہیں غائب ہوگئی جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضا میں گھل جائے......اب وہ نظر نیچے کیسے ساڑھی کا پلو ٹھیک کررہی تھی۔

''گڈ بائی'' میں نے جلدی سے کہا۔

تانگہ چلنے لگا۔لڑکے نے زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔''گڈ بائی''

سیدھی کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی جارہی تھی۔آسمان پر ستاروں کے درمیان بھی اسی طرح ایک پگڈنڈی بنی ہوئی تھی......''یہ سفر کب شروع ہوا؟'' میں سوچنے لگا...... یہ دونوں پگڈنڈیاں کدھر جارہی تھیں...... یہ سفر کبھی ختم ہوگا؟......

◆◆◆

سڑک کے کنارے

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں اور جھیل ڈل کا نظارہ کر رہا ہوں۔ میں بہت مدت کے بعد کشمیر آیا ہوں۔ لیکن ڈل مجھے اسی طرح جوان اور خوبصورت نظر آتی ہے۔ اس کے گہرے نیلے پانیوں میں شنکر آچاریہ کے مندر کا عکس لرز رہا ہے۔ اور سرخ پردوں والے سبک خرام شکارے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نشاط باغ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جب یہ شکارے پانی میں تیرتے ہوئے نیلوفر کے پھولوں کے قریب سے گزرتے ہیں تو نیلوفر کے خوابیدہ پھولوں پر پانی کی پھوہاریں پڑ جاتی ہیں اور وہ چونک کے پانی کی سطح پر دوڑنے لگتے ہیں۔ شکارے آگے بڑھ جاتے ہیں اور شکاروں میں بیٹھے ہوئے مرد و زن اور شکاروں کے مانجھیوں کا گیت ڈل کے اجلے اجلے پانیوں سے ابھرتا ہوا آ رہا ہے۔

باغ نشاط کے گلو
شاد رہو جوان رہو
تم پر نثار جنتیں
روح افزا مسرتیں
رنگ بہار نکہتیں
مست نشے میں رات دن

خرم وشادماں رہو
باغ نشاط کے گلو

ہاں یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے جس کے بیٹوں نے ہزار مصیبتوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی حسن کارکردگی نہیں کھوئی۔ اپنے گیت نہیں کھوئے۔ زندہ رہنے کی آرزو اور ہنستے ہوئے محنت کرنے کی امنگ نہیں کھوئی۔ یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے۔

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں۔ یہ سڑک جو سری نگر سے اننت ناگ کو جاتی ہے۔ اس راستے میں شعلہ رو چنار ہیں اور باداموں کے بانکے پیڑ، ناشپاتیوں کے جھنڈ اور سیب کے درخت، برف زمین میں گھل گئی ہے اور ابھی ابھی تو بہار کا سبزہ بن کر پھوٹی ہے۔ سیب کی شاخوں پر کلیاں چٹک گئی ہیں اور ان کی گلابی مسکراہٹیں جگہ جگہ رستہ چلنے والوں کے قدم روک لیتی ہیں۔ میں بھی یہاں ٹھٹک جاتا ہوں کیونکہ یہاں سیب کے پھول ہیں، ایک چشمہ ہے، ایک گائے ہے اور ایک حسین چرواہی ہے جو گائے کو چشمے سے پانی پلا رہی ہے، میں لڑکی سے کہتا ہوں۔ ”تم ذرا گائے کو پرے ہٹالو میں پانی پی لوں“۔

لڑکی: ذرا پرے ہٹ کے بیٹھ جاؤ اور گائے کو پانی پی لینے دو۔ تمہارسامنے سے ڈرتی ہے“۔

میں: مجھے سخت پیاس لگی ہے۔

لڑکی: پیاس انسان اور حیون دونوں کو برابر لگتی ہے۔

میں: پہلے میں پانی پی لوں۔

لڑکی: پہلے گائے پانی پی لے۔ گائے کو دیکھتے نہیں ہو پانی پی رہی ہے۔ اسے بیچ میں کیوں ہٹاؤں؟ تم پانی پی رہے ہوتے تو میں تمھارے ہاتھ سے پانی کا پیالہ چھین لیتی؟“

میں: (ہنس کر) تم بڑی سمجھدار معلوم ہوتی ہو۔ مگر حیرت ہے کہ اتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہوئے بھی تم چرواہیوں کا کام کرتی ہو؟“

لڑکی: چرواہیوں کے کام کیلئے بڑی سوجھ بوجھ چاہیئے۔ گائے بھینسوں کے ریوڑ

سنبھالنے کے علاوہ اسے تمہارے ایسے راہ چلتے ہوئے عقلمندوں سے بھی نپٹنا ہوتا ہے''۔

(دونوں ہنستے ہوئے)

میں: تمہانام بیگماں ہے نا؟''

لڑکی: (ہنس کر) میرا نام زینب ہے، میں یہاں گاؤں میں پڑھاتی ہوں۔

میں: اسکول میں پڑھاتی ہو کہ گائے بھینس چراتی ہو؟''

لڑکی: گائے تو ایک اندھے لڑکے کی ہے۔ جس کے ماں باپ پنجاب کے فساد میں مارے گئے تھے۔ وہ اپنا وطن چھوڑ کے محنت مزدوری کیلئے پنجاب گئے تھے، پھر انہیں آنا نصیب نہ ہوا''۔

میں: یہ اندھا لڑکا کیسے بچ گیا؟ کیا یہ یہاں تھا؟''

لڑکی: یہ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ تھا۔ کچھ فسادی اسے بھی مارنے پر تلے ہوئے تھے مگر انہوں نے رحم کھا کر صرف اس کی آنکھیں نکال دیں اور اسے زندہ چھوڑ دیا۔ اس نے اس دن سے کوئی فساد نہیں دیکھا۔ فساد کو سنا ہے۔ صرف ایسی بھیانک آوازیں سنتا ہے کہ ہر رات کو سوتے سے جاگ کر چیخنے لگتا ہے۔ مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ''۔

میں: ''خیر وہ زمانہ اب گزر گیا''۔

لڑکی: (آہ بھر کر) ''ہاں، لیکن اس بچے کو روشنی نہیں ملے گی، نہ ہی میرا شوہر مجھے ملے گا''۔

میں: تمہارا شوہر''۔

لڑکی: ہاں وہ ہمارے گاؤں کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اب اس کی جگہ میں پڑھاتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ لیکن یہ فساد سے پہلے کی بات ہے۔ وہ مجھے چھپ چھپ کے پڑھایا کرتا تھا اور میرے ماں باپ میری شادی نمبردار کے لڑکے سے کرنا چاہتے تھے اور میں چھپ چھپ کے پڑھتی تھی اور نمبردار کے لڑکے پر سو لعنت بھیجتی تھی۔ پھر میری شادی کی بات پکی ہوگئی۔ اور پھر دنگے فساد کی خبریں آنے لگی اور پھر جب میری شادی

میں چند دن رہ گئے تو یہ اندھا لڑکا گھومتا گھومتا بھیک مانگتا واپس گاؤں میں آ نکلا۔اس کو اس حالت میں دیکھ کر گاؤں والوں کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔

(مجمع کا شور)

(ڈھول پیٹتے جا رہے ہیں،لوگ ہنس رہے ہیں، چیخ رہے ہیں۔اس بے ہنگم شور میں ذیل کی آوازیں ابھرتی ہیں)

1۔مارو،مارو!ان سب کو ماردو،ایک بھی بچنے نہ پائے۔

2۔ایک آنکھ کے بدلے دونوں آنکھیں نکال دو۔

3۔بنیے کا گھر جلادو۔

4۔لالے اوراس کی بیٹی کو زندہ زمین میں گاڑ دو۔

5۔چلو جوانو!مارو،مارو،مارو۔

6۔ہم خون کا بدلہ چکائیں گے!اپنے دشمنوں کا خون بہائیں گے۔

لڑکی: آن کی آن میں سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔دوسرے فرقوں کے لوگوں نے گھبرا کر گھر چھوڑ دیئے اور بھاگ کر اسکول کی چار دیواری میں پناہ لی۔گاؤں میں سکول کے گرد گھیرا ڈال لیا گیا۔اندر اسکول میں استاد پڑھا رہا تھا۔

اسکول ماسٹر: پڑھو بچو!سب انسان بھائی ہیں۔

باہر سے آوازیں:مارو،مارو،سب کو مارو۔

اندر کی آوازیں:ہمیں بچاؤ کسی طرح ہمیں بچاؤ۔

ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ہم تو سینکڑوں سالوں سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں۔

استاد جی!آپ نے کبھی دیکھا ہم نے گاؤں والوں کے خلاف کوئی بات کی ہو۔

یہ لیجئے زیور میری بیٹی کی عزت بچا لیجئے۔

باہر کی آوازیں: زندہ گاڑ دیں گے۔پتھروں سے ہلاک کر دیں گے۔تیل میں تل

دیں گے۔

اندر کی آوازیں: ہم نے کچھ نہیں کیا، یہاں سے چار سو میل دور جن لوگوں نے تمہارے گاؤں والوں کی جانیں لی ہیں تم اس کا بدلہ ان سے لو۔ ہم سے کیوں لیتے ہو۔

ایک لڑکی: بھائی میں بھی تو گاؤں کی کنواری ہوں، میں تمہاری عزت ہوں مجھے بچالو بھائی۔

ایک لڑکا: استاد جی! ہم کیا پڑھیں۔ سب انسان بھائی بھائی ہیں؟''

استاد: چپ رہو۔ میں باہر جاتا ہوں''۔

(قدموں کی آوازیں) باہر کا شور ایک دم بڑھ جاتا ہے، ارد، ارد، ٹکڑے ٹکڑے کر دو، قیمہ بنادو، نکالو سب کو باہر، ایک کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

استاد: گاؤں والو میری سنو۔

(سب چپ ہو جاتے ہیں، پھر ایک دم چلانے لگتے ہیں)

''نہیں، ہم نہیں سنیں گے، ہم کسی کی نہیں سنیں گے۔ لہو چاہیے، لہو خون۔

استاد: تمہیں خون چاہیے؟ میرا خون لے لو، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم باہر کے فسادیوں کا بدلہ اپنے گاؤں والوں سے لو۔

ایک آواز: یہ اندھا لڑکا دیکھتے ہو۔ ان لوگوں نے اس کے ماں باپ کو مار دیا۔ اس کی آنکھیں نکال دیں۔ ہم بھی اب یہی سلوک کریں گے۔

دوسرا: آگے سے ہٹ جاؤ، استاد جی۔

تیسرا: ''میں تم سے کہتا ہوں دروازے سے پرے ہٹ جائیے''۔

استاد: میں پیچھے نہیں ہٹوں گا، مجھے پہلی جماعت کے قاعدے کی حفاظت کرنی ہے جس میں لکھا ہے ''سب انسان برابر ہیں'' اور مجھے میری پیاری اماں جان کی عزت بچانی ہے۔ میں نے دس برس اس قاعدے کو پڑھایا ہے۔ آج یہ قاعدہ تم میرے ہاتھ سے چھین رہے ہو؟ میں یہ قاعدہ نہیں دوں گا۔ اپنے جیتے جی میں اس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کروں گا۔

گاؤں والو! اس قاعدے کو نہ پھاڑو، یہ تمہارے بچوں کا قاعدہ ہے، اس میں سیب کے پھول ہیں اور ناشپاتی کے درخت ہیں اور بھائی بہن مدرسے جا رہے ہیں۔ اور سورج نکل رہا ہے اور کسان کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے۔ اس میں بچے ماں باپ کا ادب کرتے ہیں اور سلیم موہن کا دوست ہے اور رضیہ نرملا کی سہیلی ہے۔ گاؤں والو یہ تمہارے بچوں کا قاعدہ ہے۔ اسے قتل نہ کرو، نئی زندگی کو ابھرنے دو''۔

ایک آواز: کیا بکتا ہے یہ؟ پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرو۔ دشمنوں سے مل گیا ہے یہ''۔

دوسری تیسری آوازیں: ہاں ہاں مار ڈالو اسے، آگے بڑھو جی، دیر ہو رہی ہے''۔

استاد: تمہیں بدلہ چاہیے نا؟ دو آنکھوں کے بدلے میری دو آنکھیں لے لو''۔

چوتھی پانچویں آواز: دیکھتے کیا ہو جی آگے بڑھ جاؤ۔ یہ ماسٹر خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا''۔

آوازیں: ''چلو آگے بڑھو، ہلا، ہلا......''

(شور کم ہو جاتا ہے لڑکی کی آواز ابھرتی ہے)

زینب: گاؤں والوں نے اسے مار ڈالا۔ اسکول کی چوکھٹ پر اسکول ماسٹر کا خون بہا۔ اس کے سرخ سرخ تازہ لہو کو دیکھ کر گاؤں والے ایک دم چونک گئے ان کا سارا غصہ اس کے مقدس لہو میں ڈوب گیا۔ اور وہ...... پریشان ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور اپنے کیے پر پشیمان ہو گئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور پھر اس دن کے بعد انہوں نے دوسرے فرقے والوں کو کچھ نہیں کہا۔ ہمارے گاؤں میں اب سب امن چین سے رہتے ہیں اور کوئی کسی سے باز پرس نہیں کرتا اب کہیں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔

میں: اب شاید تمہارا بیاہ بھی نمبردار کے بیٹے سے ہو گیا ہوگا؟''

زینب: کیسی باتیں کرتے ہو۔ میرا شوہر زندہ ہے، لوگوں کے لئے مر چکا ہے اور انہوں نے اسکول ماسٹر کی لاش کو قبر میں گاڑ دیا ہے، مگر میرے لئے وہ زندہ ہے اور اس کے جیتے جی نمبردار کے بیٹے سے کیسے شادی کر سکتی ہوں''۔ اب میں ہر روز اسکول میں پڑھاتی ہوں اور

ہر روز اردو کے قاعدے میں اس کا مسکراتا ہوا چہرہ......نظر آتا ہے اور پھر میں مسکرا کر اسکول کے بچوں کی طرف دیکھتی ہوں، تو وہ سب مجھے اپنے ہی بچے معلوم ہوتے ہیں۔ میں، میرا شوہر، میرے بچے، اندھے لڑکے کی گائے، میرا دیس کتنا خوبصورت ہے۔

اجنبی......

''......تم کس دیس کے رہنے والے ہو اجنبی؟''

میں: ''میرا کوئی دیس نہیں ہے، میں انسانوں کی سڑک پر رہتا ہوں، چلتا ہوں اور کبھی کبھی رک کر کسی چشمے کی سطح سے ہونٹ ملا کر پیاس بجھالیتا ہوں۔ اب تم اپنی گائے کو پرے ہٹالو، یہ پانی پی چکی ہے اور میرے کوٹ کی آستین چبا رہی ہے۔

(ہنستی ہے اس کی گم ہوتی ہوئی ہنسی میوزک ابھرتا ہے، چند لمحوں کے بیک گراؤنڈ میوزک (نشاطیہ) کے سر اونچے ہوتے جاتے ہیں۔ پھر تھرا تھرا کر گم ہو جاتے ہیں)

میں پھر سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں، یہ سڑک جو مٹن سے چٹا گام کو جاتی ہے۔ مٹن ہندوؤں کا تیرتھ ہے۔ یہاں دور دور سے یاتری آتے ہیں اور مٹن کے مندروں اور چشموں کے درشن کر کے امرناتھ کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مٹن براہمنوں کی بستی ہے اور یہاں ہزاروں برس سے براہمن رہتے بستے آئے ہیں اور بےخوف وخطر پوجا پاٹ میں مصروف نظر آتے ہیں۔

مٹن میں کوئی مسجد نہیں ہے حالانکہ آس پاس کے دیہات میں مسلمان آبادی کی کثرت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پہلے مٹن میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ اب کہ جو کئی سالوں کے بعد آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ میں اس مسجد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دوڑا دوڑا ملا جی کے پاس گیا۔ ملا جی کا ہاتھ کٹا ہوا تھا اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی چمکیلی تھیں۔

میں؛ ملا جی! یہ مسجد کب بنی؟''

ملا: فساد کے دنوں میں۔

میں: فساد کے دنوں میں؟ حیرت ہے فساد کے دنوں میں تو مسجدیں اور مندر بنتے نہیں ٹوٹتے ہیں۔ آپ کیسی عجیب بات کرتے ہیں؟''

ملا: ہمارا ملک کشمیر بڑا عجیب ملک ہے نا۔ اس لیے یہاں پر بڑی بڑی عجیب باتیں ہوتی ہیں''۔

میں: جب تمہارے ہاں فساد ہو رہا تھا اور خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے معلوم ہوتے تھے، ان دنوں فسادیوں نے یہاں ہمارے مٹن میں آ کر بھی فساد کرنا چاہا۔ انہوں نے آس پاس کے دیہاتوں میں کسانوں کو بھڑکا دیا کہ وہ مٹن کے مٹھ پر حملہ کریں اور براہمنوں کو تہ تیغ کر کے اور مٹھ کو جلا کر ان مسجدوں کا انتقام لیں جنہیں بے حرمت کیا گیا ہے۔

میں: ''تو پھر کیا ہوا؟ مندر تو جلے نہیں ویسے ہی موجود ہیں؟''

ملا: تم سنو تو، جب فسادی یہ کھچڑی پکا رہے تھے، تو ان میں کچھ لوگ میرے پاس فتویٰ حاصل کرنے کیلئے آئے، میں نے فتویٰ نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ ''ہمارے شعار کے خلاف ہے۔ اس پر وہ لوگ ناامید ہو کر چلے گئے۔

میں: ''پھر؟''

ملا: لیکن فسادیوں نے ہمت نہ ہاری، انہوں نے کسانوں کو ورغلانا شروع کیا اور آخر میں چند لوگوں کو مٹھ پر حملہ کرنے کیلئے تیار کر لیا۔ جب مجھے اطلاع ملی، میں یہاں نہیں تھا، ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے بہت سے کسانوں کو مٹھ کی حفاظت کیلئے تیار کر لیا۔ اور لوگ راتوں رات مٹھ کے سامنے پہنچ گئے، بے چارے پجاری بہت ڈرے ہوئے تھے۔ دور سے ڈھول تاشوں کی آواز آ رہی تھی۔ فسادی قریب آ رہے تھے۔

(مجمع کی آوازیں، ڈھول پیٹنے کی آوازیں)

1۔ ''یہاں مٹھ نہ رہ سکتا''۔

2۔ ''شہید مسجدوں کا بدلہ لیا جائے گا''۔

3۔ ''جلا دو انہیں''۔

4۔ ''پجاریوں کو چشمے میں پھینک دو''۔

5۔ آگے بڑھو جوانو! لوہے کے جنگلے پار کر جاؤ۔ ان چشموں کی ساری مچھلیاں تمہاری ہیں۔

ملا: ''ٹھہرو! تم اس جنگلے سے آگے نہیں جا سکتے''۔

آواز: ''کیوں نہیں جا سکتے؟ ہم سب کچھ پھونک کر رکھ دیں گے''۔

ملا: ''یہ شعائر اسلامی کے خلاف ہے''۔

دوسری آواز: ان کی طرف داری کر رہا ہے''۔

چوتھی آواز: ملا جی سامنے سے ہٹ جاؤ۔

''میرے جیتے جی تو اس مٹھ پر حملہ نہیں کر سکتے، تم لوگ جن کے بہکانے میں آ کر حملہ کر رہے ہو وہ ہمارے دیس کو برباد کر دیں گے، میں تم سے پھر کہتا ہوں، میرے جیتے جی یہاں فساد نہیں ہو سکتا''۔

ایک آواز: ملا جی ٹھیک کہتے ہیں۔

دوسری آواز: ملا جی خاک ٹھیک کہتے ہیں۔

تیسری آواز: یہ لوگ ہمارے بھائی ہیں، ہزاروں برسوں سے یہاں رہتے چلے آ رہے ہیں۔

چوتھی آواز: ان ہی کے بھائیوں نے وہاں آگ لگائی ہے۔ ہم یہاں لگائیں گے''۔

پہلی آواز: ''نہیں، تم میں ہمت ہے تو وہاں جا کے لڑو یہاں ہمیں کیوں برباد کرتے ہو؟''

دوسری آواز'' آگے سے ہٹ جاؤ''۔

پہلی آواز: ملا جی، سنبھلیے، سنبھلیے''

(شور بڑھ جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کم ہو جاتا ہے۔ آخر ملا جی کی آواز ابھرتی ہے)

ملا جی: ''اسی دنگے میں میرا ہاتھ کٹ گیا۔ کسانوں کو بہت جلد عقل آ گئی کہ فسادی اپنا الو سیدھا کر رہے تھے۔ پجاریوں نے بھی میرا شکریہ ادا کیا۔ اس سے پہلے یہاں مٹھ کے قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ بن سکتی تھی۔ اب ان پجاریوں نے اور یہاں کے جاتریوں نے خود مسجد کیلئے چندہ جمع کیا اور اس کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے پیش پیش رہے۔ یہ مسجد جو اب تم دیکھ رہے ہو اسی چندے سے بنی ہے۔''

میں: ملا جی، آپ بہت اونچے آدمی ہیں''۔

ملا: میں ایک چھوٹا انسان ہوں بیٹا۔ ہاں میری مسجد بہت اونچی ہے۔ آسمان تک جاتی ہے''۔

(خوش آہنگ موسیقی چند لمحوں کیلئے بجتی ہے)

میں سڑک کے کنارے کنارے جا رہا ہوں۔ یہ وہ میرا جانا پہچانا کشمیر نہیں ہے، یہ نیا کشمیر ہے۔ زینب کا، استاد جی کا کشمیر، کشمیر کے بیٹے ڈل میں کھلے ہوئے نیلوفر کے پھول ہیں جو طوفان کی دھمک محسوس کرتے ہوئے اچانک چونک اٹھتے ہیں اور طوفان کی لہروں پر ڈول رہے ہیں اور سنبھل سنبھل کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں اور سرخ پردوں والے شکارے تیزی سے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نشاط باغ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور مانجی چپو چلاتے ہوئے گا رہے ہیں۔

حسن جمال کا کشمیر
دل کش، شوخ و دل پذیر
اپنا وطن بے نظیر
پیارے وطن کے دوستو
سرکش و کامراں رہو
باغ نشاط کے گلو!!
شاد رہو جواں رہو

◆◆◆

سفید جھوٹ

خالصہ سکول کے عقب میں گندے نالے کے قریب وہ مجھے مل گئی۔ تانگا نیا تھا اور گھوڑا عربی۔ جس کی پیشانی پر ایک سرخ رنگ کی بلند کلغی لہرا رہی تھی۔ اس نے ایک خاکی رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی اور خاکی رنگ کے صافے میں میونسپل کمیٹی کا نمبر ٹکا ہوا تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ اور آنکھوں میں کاجل۔ اس نے مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا ''تانگے والے پہلوان''

جب میں تانگے میں بیٹھ گیا تو وہ میری طرف مڑا اور رازدانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''بابو صاحب! یہ آپ کے محلے میں پولیس کا جمگھٹا کیوں ہے۔ میں دیر سے دیکھ رہا ہوں پولیس کا ایک سب انسپکٹر، حوالدار اور ایک گارڈ اس مکان کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ وہ جو سڑک کے اخیر میں واقع ہے۔ ادھر سے کوئلے کی دکان کا مالک گزرا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ اس مکان میں دو بدمعاش گرفتار کیے گئے ہیں اور تین نوخیز لڑکیاں، جنہیں وہ کہیں سے پھانس کے لائے تھے (لبوں پر زبان پھیر کر) اور وہ کوئلوں کی دکان کا مالک کہتا تھا جی، لڑکیاں بہت ہی خوبصورت ہیں، پولیس والوں کی چاندی ہے ہی ہی ہی''۔

''ہاہاہا'' میں نے بے اختیار قہقہہ لگا دیا۔

تانگے والا میری طرف اور بھی جھک کر بولا۔ ''اور سچ بات تو یہ ہے کہ بابو جی کہ

عورت کے بغیر جی نہیں لگتا اور شہروں میں تو پیسہ چاہیے، اس قسم کی عورتیں تو گلی گلی ماری پھرتی ہیں۔ آج زمانہ کیسا ہے! کبھی آپ نے یہ بھی سوچا۔ ٹخ...... ٹخ...... ٹخ...... ٹخ...... تیری ماں کو لے جائیں چور...... حرامی...... چلے گا کہ یونہی کھڑا کھڑا مار کھائے گا۔ کیا صلاح ہے؟''

اگلی گلی کے قریب تانگہ دھیما ہو گیا۔ تانگے والے نے بدستور رازدانہ لہجہ میں کہا۔

''میں جانتا ہوں۔ اس گلی میں بھی کئی اس قسم کی عورتیں رہتی ہیں۔ یہاں ایک بوڑھی دلالہ رہتی ہے۔ جی کیا بتاؤں۔ وہ تو جس قسم کا مال آپ چاہیں...... فی الفور مہیا کر سکتی ہے۔ کٹنی ہے کٹنی ہوا میں گرہ لگاتی ہے''۔

تانگے والے نے یہ کہہ کر ایک آنکھ میچ لی اور آہستہ سے گھوڑے کو چابک لگائی۔

میں نے ذرا کھانس کر کہا۔ ''سچ کہتے ہو پہلوان، اس قسم کی عورتیں گلی گلی ماری پھرتی ہیں۔ میں تمہیں پچھلے دنوں کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ بات یہ تھی کہ آج سے چند سال پہلے جب خون ذرا گرم تھا ارطبیعت میں شدید حدت تھی، مجھے (ایک آنکھ میچ کر) یہ لت لگی تھی تو ان دنوں میں نے...... ایک دفعہ...... بریلی کی رہنے والی تھی۔

''بریلی...... مجیدین...... وہی دوہرے جسم والی سانولا رنگ

''نہیں...... پتلے چھریرے جسم والی تھی رنگ گندمی تھا۔

''اچھا''...... تانگے والے نے کہا...... ''کوئی اور ہوگی''۔

''اس امر کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ میں تو اسے بالکل بھول چکا تھا کہ یکایک وہ مجھے ایک دن اسی سڑک پر اسی گلی...... وہ جو اب ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں اس گلی کے سرے پر مل گئی''۔

''سچ مچ؟''

''اور کیا۔ اس نے میرا نام لے کر پکارا تو میں ششدر رہ گیا۔ لوگ سڑک پر گزر رہے تھے اور میں خود دفتر جا رہا تھا اور وہ برقع پہنے ہوئے تھی۔ میں تو بالکل ہی حیران رہ گیا'۔

''حیرانی کی بات ہی تو تھی بابو جی''

''تب...... پہلوان خدا تمہارا بھلا کرے، میں نے کیا کیا کہ اسے چپکے سے ایک کونے میں لے گیا۔ وہاں جا کر اس نے اپنا نقاب الٹا تو میں نے دیکھا کہ......''

''کہ؟'' تانگے والے نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''کہ...... وہی مجیدن ہے جو آج سے چند سال پیشتر میری داشتہ تھی۔ پہلے تو میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس کی صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی چھائیاں لبوں پر پھیلی سی اداسی اور آنکھوں میں اداسی سی چمک، میں نے کہا۔ ''مجیدن تمہیں کیا ہوا؟'' اس نے کہا میونسپل باغ میں چلو۔ میں تمہیں سب حال سناتی ہوں، میں اسے میونسپل باغ میں لے گیا۔ ہم زمانہ پارک کے باہر چنبیلی کے پودوں کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ یونہی عادتاً اور وہ میرے کندھے سے لگ کر رونے لگی۔

''بیچاری غریب عورت''

''ہاں بیچاری نے مجھے بتایا کہ میں نے جب سے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کا بہت برا حال ہو رہا تھا۔ وہ در بدر ماری ماری پھر رہی تھی۔ کبھی وہ چند مہینے کیلئے ایک کے پاس رہتی اور جب اس کا جی بھر جاتا تو اسے کسی دوسرے کے حوالے کر دیتا۔ اسی اثنا میں اسے کتنی جنسی بیماریاں لگ گئیں۔ وہ مدت تک علاج کراتی رہی...... پھر کچھ عرصہ وہ ایک ہسپتال میں نرس رہی...... پھر وہاں سے بھی نکال دی گئی۔ اب وہ اس گلی میں رہتی ہے دو آدمیوں کے ساتھ'' اور اس نے رو رو کر مجھ سے اپنے حال پر رحم کرنے کو کہا۔

''وہ بریلی سے پنجاب کیسے آ گئی؟ کسی کے ساتھ بھاگ آئی ہو گی؟''

''ہاں تو۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس کا خاوند اسے بہت پیٹتا تھا۔ کئی خاوندوں کو اپنی بیویاں پیٹنے میں مزہ آتا ہے۔ پھر اسی ان بن میں اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی مردہ اور پھر ایک لمبے عرصے تک اس کے ہاں کوئی لڑکا بالا پیدا نہ ہوا اور اس کے خاوند نے اسے میکے بھیج دیا۔ وہ وہاں کسی بدمعاش نے اسے سبز باغ دکھائے اور اسے لاہور لے آیا''۔

''ہی ہی ہی'' تانگے والا ہنسنے گا۔ اور اپنے زانوں پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''یہ عورتیں کتنی

بے وقوف ہوتی ہیں۔ ان کو پھانسنا بھی کیا مشکل ہے؟ کیوں؟''

''اب ہم کراؤن سینما کے قریب سے گزر رہے تھے۔ تانگے والے نے پوچھا'' پھر کیا ہوا؟''

میں نے یونہی اسے ٹال دیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ اس کا منہ چوما اور اس سے کہا کہ کل اسی جگہ شام کے چھ بجے ملوں گا۔ وہ دن تھا اور آج...... پھر کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک عرصہ تک تو میں نے یہ راستہ چھوڑے رکھا۔ اب میرا خیال ہے کہ اب وہ اس گلی میں نہ رہتی ہوگی''۔ تانگے والا دیر تک خاموش رہا۔

''میں نے کہا۔ ''میں ان باتوں کو مدت گزری ترک کر چکا ہوں۔ میری بیوی ہے، بچے ہیں، دفتر میں ملازم ہوں اب وہ باتیں کہاں۔ عزت کا خیال ہے...... ہاں...... یونہی...... گاہے...... چھپ کر......''

تانگے والے نے کہا'' مصری شاہ میں بہت اچھا مال ہے، گڑھی شاہو میں بھی...... اینگلوانڈین...... فسٹ کلاس......'' میں نے جلدی سے کہا...... ''نہیں...... نہیں...... میں تو ایک بات کہہ رہا تھا۔ محض ایک بات''۔

''ایک بات؟ تانگے والے نے کہا۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔ ایک بات...... لیکن عورتیں دراصل اس معاملے میں مجبور ہو جاتی ہیں''۔

ایک دفعہ میرے ساتھ بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ ہمارے محلے میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ ان کی دو جوان لڑکیاں تھیں۔ مجھے بڑی لڑکی بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ میں اسے اکثر تاکتا جھانکتا رہتا۔ ایک دن اس نے تنگ آ کر مجھے اپنے پاؤں کی جوتی دکھائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری اپنے پاؤں کی جوتی کے تلے جتنی پروا بھی نہ کرتی تھی مجھے بہت غصہ آیا''۔

''حرام زادی'' میں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔

تانگے والے نے ایک وقفہ کے بعد کہا۔ ''مولوی صاحب اور ہم ہمسائے

تھے۔ لیکن ہمارا کوئی رشتہ نہ تھا۔ میں نے دل میں بہت پیچ و تاب کھائے لیکن کیا کر سکتا تھا۔ آخر میں ایک دن مزنگ میں اپنے پیر کے پاس گیا اور ان سے کہا یا پیر دستگیر میری مدد کر۔ انہوں نے کہا۔ کیا بات ہے بیٹا؟ میں نے کہا۔ میں مولوی صاحب کی بڑی لڑکی پر مرتا ہوں لیکن وہ میرا کہا نہیں مانتی۔ الٹا مجھے جوتا دکھاتی ہے۔ اس کا دل نرم کر دیجئے۔ میں آپ کا غلام ہوں''۔ یہ کہہ کر دو روپے نذرانہ دیا اور ان کے پاؤں پکڑ لئے۔

پیر صاحب نے دم کر کے مجھے ایک چٹکی دی اور کہا ''بیٹا یہ چٹکی تم کسی طریقے سے اس لڑکی کے سر پر ڈال دو۔ وہ خود بخود تمہاری طرف کھینچی چلی آئے گی''۔

''اچھا''

''ہاں تو...... میں چٹکی لے کر گھر گیا۔ اب مصیبت یہ آن پڑی کہ اس کے سر میں یہ راکھ کون ڈالے؟ آخر میں نے اپلے تھاپنے والی کریمن کو کہا۔ کریمن نے کہا۔ میرا کیا ہے، لو، بھلا میں جب مولوی صاحب کی لڑکی کے بال گوندھنے جاؤں گی تو جب میں اس کے سر میں تیل ڈالوں گی۔ وہاں میں یہ ذرا سی چٹکی بھی پھینک دوں گی۔ لو بھلا...... میرا اس میں کیا لگتا ہے...... میں نے کریم کو شاباش دی اور کہا۔ لو بھئی کریمن چار آنے......''

''اب بابو جی، اس کا تو مجھے پتہ ہے کہ کریمن مولوی صاحب کے گھر گئی۔ لیکن اس کا مجھے پتہ نہیں کہ کریمن نے کب اور کیسے اس لڑکی کے سر میں پیر کی چٹکی ڈالی۔

''لو جی''۔ تانگے والے نے کہا۔ ''اب یوں ہوا کہ دسرے دن وہ لڑکی خود بخود ہمارے گھر آ گئی، میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے سامنے میرا باپ مونڈھے پر حقہ پی رہا تھا اور اماں شلغم چیر رہی تھی۔ لڑکی آئی اور آ کر چپکے سے میرے زانو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ میرا باپ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ کہنے لگی، بیٹی کیوں آئی ہو۔ وہ کہنے لگی یونہی۔ پھر میرے باپ نے مجھ سے اس لڑکی کے قریب سے اٹھ جانے کو کہا۔ میرے باپ کا مزاج بڑا سخت ہے۔ وہ مجھے اکثر غصہ میں آ کر پیٹ ڈالتا ہے۔ چنانچہ میں اس لڑکی کے پاس سے اٹھ گیا۔

لیکن لڑکی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ کہنے لگی، میں تو اس گھر میں رہوں گی اور اگر شادی

کروں گی تو اسی لڑکے سے اب تو محلے بھر میں شور مچ گیا۔ میرے باپ نے مجھے پیٹا۔ کہنے لگا حرام زادے! سچ بتا تو نے کیا کیا ہے؟ میں نے کہا، اب مجھے کیا پتہ۔ میرے باپ نے مولوی صاحب سے صاف کہہ دیا کہ ان کی اپنی برادری بہت بڑی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی اپنی برادری سے باہر نہیں کریں گے۔ ادھر لڑکی نے کہا کہ وہ میرا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ آخر مولوی صاحب نے میرے باپ سے کہا کہ وہ چند دن تک ان کی لڑکی کو اپنے گھر میں ہی رہنے دے، میرے باپ نے منظور کر لیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ تنبیہہ کر دی اگر میں کبھی لڑکی کے نزدیک بھی پھٹکا تو وہ مار مار کر میری چمڑے ادھیڑ دیں گے۔ میرا باپ بڑا سخت آدمی ہے جی۔ ہاں، جی بابو صاحب میں دوڑا پھرا اپنے پیر کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنا عمل پھیر لیں لیکن انہوں نے کہا بیٹا! اب تو یہ بہت مشکل ہے۔ مجھے چالیس دن کا چلہ کاٹنا ہوگا دریا کے کنارے، اور اب میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔ چنانچہ میں واپس چلا آیا۔ وہ لڑکی ہمارے ہاں کئی دن رہی۔ میں والد کے ڈر کے مارے اس کے نزدیک نہ پھٹکتا تھا۔ آخر ایک دن دوپہر کے وقت جب اتفاقاً اور کوئی نہ تھا میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا۔ اب بتا کون کس کے پاؤں کی جوتی ہے؟''

''وہ بولی، ''میں تمہارے پاؤں کی جوتی ہوں......''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

تانگے والے نے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا۔ ''دوسرے دن میں بمبئی بھاگ گیا۔ وہاں دو سال ایک سیٹھ کا کوچوان رہا۔ دو سال کے بعد واپس آیا تو لوگ تقریباً اس واقعے کو بھول چکے تھے۔ اس لڑکی کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ اب اس کے ہاں ایک لڑکا بھی ہے''۔

''اور تم؟''

اب تانگا میو ہسپتال کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دو بدصورت عورتوں کے ساتھ ایک جاٹ عورت مٹکتی ہوئی جا رہی تھی، گدرایا ہوا جسم، گورا رنگ گلے میں سونے کی ہیکل، چال میں جوانی تھی، آنکھوں میں غرور۔

''واہ'' تانگے والے نے کہا۔ ''کیا عجیب چیز ہے۔ لاکھوں میں ایک''۔

''لاکھوں میں ایک'' میں نے کہا ''اول تو غریبوں میں خوبصورتی کم ہوتی ہے لیکن اگر خوبصورتی ہو تو بس پھٹی پڑتی ہے''۔

''ہاں تانگے والے نے فخریہ لہجہ میں کہا۔ ''اب اگر اس جاٹ عورت کو پتلی سی ساڑھی پہنا دی جائے تو ایمان سے...... کیا بات ہے بابو جی''

''کیا بات ہے! پہلوان'' میں نے کہا۔

تانگے والے نے افسوس بھرے لہجے میں کہا ''افسوس کہ ہم لوگوں کو پہننے کیلئے صاف کپڑے نہیں ملتے۔ نہیں تو...... اب آپ میری طرف دیکھیے۔ یہ خاکی کپڑے پہنا کر میونسپل کمیٹی نے ہمیں بالکل بندر بنا رکھا ہے۔ کم از کم اس لباس میں بالکل بندر معلوم ہوتا ہوں...... اب اگر مجھے سوٹ پہننے کی توفیق ہو اور میری جیب میں روپے کھنکھناتے ہوں تو کیا میں اس جاٹ عورت کا من نہیں جیت سکتا۔ وہ دیکھیے چند کالج کے لونڈے اس کے پیچھے لگ گئے ہیں اور وہ حرامزادی دیکھیے کس طرح مٹکتی جا رہی ہے...... سب پیسے کا کھیل ہے۔

میں نے بات کا رخ بدلنے کیلئے کہا۔ ''تم دن بھر میں کتنا کما لیتے ہو؟''

''کہنے کو تو تین روپے کما لیتا ہوں''۔ تانگے والے نے کہا۔ ''ڈیڑھ روپیہ تانگے کا مالک لے لیتا ہے، بارہ آنے روپیہ گھوڑے کا خرچ ہے۔ دس بارہ آنے میرے لیے بچ جاتے ہیں۔ ان بارہ آنوں میں گھر کا خرچ چلاتا ہوں۔ باپ بوڑھا ہے، اب کوئی کام نہیں کر سکتا۔ دیکھیے اب یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اب جنگ شروع ہو گئی ہے۔ سب چیزیں مہنگی ہو گئی ہیں۔ بھاؤ بڑھ رہے ہیں...... اب یہ جنگ کب تک جاری رہے گی جی''۔

''سنا ہے تین سال تک''

''تین سال میرے اللہ۔ پچھلی جنگ میں سنا ہے۔ آٹا روپے کا تین سیر ہو گیا تھا۔ اب مزدور لوگ کہاں سے کھائیں گے۔

میں چپ ہو رہا اور اپنی ٹائی کی گرہ درست کرنے لگا، کیونکہ تانگا نسبت روڈ سے گزر

رہا تھا اور یہاں لڑکیوں کے بہت سے کالج تھے۔

تانگے والے نے ایک واقعہ کے بعد پوچھا۔ ''اور پولینڈ کا کیا بنا جی؟''

میں نے کہا۔ ''وہاں جرمن سرکار اور روس سرکار دونوں نے مل کر اس غریب ملک کو آپس میں بانٹ لیا۔ ہماری سرکار ڈاکوؤں سے لڑ رہی ہے۔ یہ جرمن اور روس سب ڈاکو ہیں''۔

''اچھا جی'' تانگے والے نے حیرانی سے کہا۔ ''...... پر...... میں نے ضمیمے بیچنے والے سے سنا کہ روس سرکار نے پولینڈ کے اپنے حصے میں سب سود دینے والے بینکوں پر قبضہ کر لیا ہے اور بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی زمین چھین لی ہے اور ہر ایک کسان کو پانچ ایکڑ زمین اور ایک گائے حصہ میں دی ہے۔ پانچ ایکڑ زمین اور ایک گائے...... یہ تو بہت اچھی بات ہے''۔

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''باؤلے ہوئے ہو۔ کبھی ایسا ہوا ہے...... یہ سب بکواس ہے محض بکواس، وہ لوگ تو محض ڈاکو ہیں ڈاکو۔ وہ لوگ تمہیں زمینیں تو کیا دیں گے۔ تمہاری بیویاں ضرور چھین لیں گے۔ سمجھے! پانچ، پانچ ایکڑ اور ایک گائے، یہ بالکل سفید جھوٹ ہے، سفید جھوٹ''۔

''یعنی ہماری تمہاری بیویاں سانجھی ہوں گی۔ مشترکہ'' تانگے والے نے پر امید لہجہ میں کہا۔

مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے کہا۔ ''اور نہ تمہاری عزت باقی رہے گی نہ ناموس، دھرم اور ایمان۔ سب غارت ہو جائیں گے۔ روس والے خدا کو نہیں مانتے''۔

''سچ مچ'' تانگے والے نے حیرانی سے کہا۔

میں چپ ہو رہا۔ تانگے والا آہستہ آہستہ نسبت روڈ پر تانگے کو چلاتا گیا۔ اب لڑکیوں کے کالجوں میں چھٹی کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور لڑکیاں بلبلوں کی طرح چہچہاتی ہوئی باہر نکلنے لگی تھیں۔ لیکن اب تانگے والا لڑکیوں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور کسی گہری سوچ میں محو تھا۔ یکا یک ضمیمہ بیچنے والے کی تیز آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ضمیمہ بیچنے والا چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

''روسی پولینڈ میں جاگیرداروں کی زمین ضبط ہوگئی۔امیر آدمی قید کر لئے گئے۔ ہر ایک کسان ک پانچ ایکڑ زمیں اورایک گائے مفت، پانچ ایکڑ زمین اورایک گائے مفت۔

قیمت ایک پیسہ''

تانگے والے کا چہرہ روشن ہوگیا۔رخساروں پرخونی جھلک دکھائی دینے لگی۔اس نے ایک پروقار طریق سے اپنے سر کو جنبش دی اور کہا۔

''آپ نے سنا صاحب''

اس کی آواز میں ایک چابک کی سی درشتی تھی۔شعلے کی لپک اور زہریلے بچھو کا خطرناک ڈنک...... مجھے اپنے گلے میں ٹائی کی گرہ کی پھانس چبھتی ہوئی محسوس ہوئی اور چہرے پر سے خون اڑتا ہوا معلوم ہوا۔میں نے تانگے کو ٹھہرا کر اسے پانچ آنے دیے اور تانگے سے اتر گیا۔

ضمیمے بیچنے والا چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔پانچ ایکڑ زمین اورایک گائے، پانچ ایکڑ زمین اورایک گائے،صرف ایک ضمیمہ باقی رہ گیا ہے''۔

''قیمت ایک پیسہ۔قیمت ایک پیسہ''

دو مزدور عورتیں ٹوکریاں اٹھائے چلتی چلتی کھڑی ہوگئیں اوراس کی آواز کو سننے لگیں۔ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس آوازے کے سحر سے ان کی روحیں بیدار ہو رہی ہیں اورصدیوں کے دھندلکے اڑے جارہے ہیں۔

''روسی پولینڈ میں سب امیر آدمی قید کر دیئے گئے۔

میں بھاگتا ہوا ضمیمہ فروش کے پاس چلا گیا اوراس کے ہاتھ سے ضمیمہ چھین کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

◆◆◆

آتا ہے یاد

1920ء کے موسم بہار میں میں نے اپنی عمر کے ساتویں سال میں قدم رکھا، ان دنوں ہم لوگ انگپور کی وادی میں رہتے تھے، جس کا شمار ابھی کشمیر کی حسین ترین وادیوں میں ہوتا ہے، لیکن مجھے ان دنوں اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آتی تھی اس کی بہت سی وجوہ ہوسکتی ہیں، ہم لوگ یہاں نئے نئے آئے تھے۔ میں اور میرا بڑا بھائی رام اور ماں جی اور پتا جی اور کامنی موسی جس کی عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ تھی، پھر اسکول میں......لڑکے مجھے ایک امیر آدمی کا بیٹا جان کر قابل نفرت سمجھتے تھے اور موقع پا کر پیٹ دیا کرتے، اس کے علاوہ میں اسکول میں غالبا سب سے کند ذہن تھا، اس لیے بھی دونوں استاد مدرس اول اور مدرس دوم دونوں مجھ سے ناخوش تھے، کوئی مونس وغم خوار نہ تھا، جو سات برس کے لڑکے سے ہمدردی ظاہر کرتا۔ ماں جی پتا جی کی دلداری میں مصروف رہتیں، آج پھر تو نے کھٹے آلوچے کھائے ہیں، ٹھہر تو سہی......اور پھر وہ میرا گلا دبوچ کر مجھے اپنی رانوں پر لٹا کر، میرا منہ کھول کر اس میں جوشاندہ ٹپکاتیں، جو اس گھاٹی میں اگے ہوئے بنفشے، سبز چرائتے، سنبلو کی جڑوں اور نہ جانے کس بلا بتر سے تیار کیا گیا تھا، اوہ! کس قدر تلخ، بکٹھا اور بدذائقہ ہوتا تھا، وہ جوشاندہ......اور جب کامنی موسی میری ناک پکڑ کر مجھے زمین پر گرا دیتیں، یا اپنی گود میں دھکیل دیتیں، اور میں غلوغلو کرتے ہوئے جوشاندے کو حلق سے نیچے نہ اتارنے کی کوشش کرتا، اور اسی ناکام کوشش میں موسی کامنی کے

انگوٹھے کو چبانے میں کامیاب ہو جاتا جو شاندہ پی لینے کے باوجود چباتا جاتا۔ اس دنیا میں انصاف کہاں ہے؟ کوئی ایک غریب سات برس کے بچے کی نہیں سنا......

انہی باتوں سے چڑ کر ایک بار میں نے سوچا کہ اب اسکول نہ جاؤں گا، بلا سے جو ہو گا دیکھا جائے گا، آخر ایسا بھی کیا، ہمارا بھی اس دنیا میں رہنے کا اور اپنی سی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ چنانچہ میں نے یہ سوچ کر جلدی سے سلیٹ، کاپی اور کتاب کو جز دان میں بند کیا اور تختی بغل میں داب کر اسکول کی راہ لی۔ تھوڑی دور چل کر جب گھر ٹینگیوں کے جھنڈ میں اوجھل ہو گیا، تو میں نے اسکول کا راستہ چھوڑ کر دوسری پگڈنڈی پر چلنا شروع کیا جو گھاٹی سے نیچے اتر کر ندی کے کنارے کنارے کھیتوں تک جاتی تھی، جہاں پن چکیاں تھیں، چشمے تھے، سبزہ تھا، جہاں دن بھر چرواہے اور چرواہیاں ریوڑ چرواتے تھے۔

اسکول سے اور گھر سے بھاگنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لیے کچھ خوش خوش، کچھ سہا سہا، کچھ آزاد سا اور کچھ اداس چلا جارہا تھا، اپنی دھن میں اور سوچ رہا تھا کہ اس بستے کو کہاں رکھوں۔ اِس کو لیے لیے پھرنا تو حماقت ہوگی، کوئی دیکھ لے گا، تو پکڑ کر سیدھا اسکول لے جائے گا، یا گھر، اب کیا ہو۔ اس بستے کو کہاں چھپاؤں، جب گھاٹی کے زیریں حصے کی طرف پہنچ گیا تو میں نے اپنے بستے کو اور تختی کو داخ کے ایک بہت بڑے جھاڑ میں چپکے سے رکھ دیا۔ یہاں لانبی لانبی گھاس اگی ہوئی تھی اور زمین پر جو بیلیں پھیلیں ہوئی تھیں ان پر نیلے نیلے اور ہلکی قرمزی رنگ کے پھول آئے تھے جو چوڑے چوڑے پتوں کے درمیان گراموفون کے اس بھونپوں کی طرح نظر آتے تھے جس کے سامنے سفید رنگ کا ایک کتا بیٹھا ہوتا ہے...... یکا یک مجھے ایک خوبصورت گلہری نظر آئی اور میں اسے پکڑنے کی کوشش میں داخ کی بیل پر جو منو کے پیڑ پر بل کھاتی چلی گئی تھی، اوپر چڑھتا چلا گیا، پھر گلہری مجھے چکمہ دے کر کہیں ان چوڑے چوڑے پتوں میں گم ہوگئی اور میں داخ کے ان خوشوں کو ٹٹولنے لگا، جن کے دانے ابھی زمرد کی طرح سبز تھے اور اتنے ہی سخت، داخ کے ایک دو دانے میں نے توڑ کر کھائے، بڑے بلبکے اور کڑوے تھے اور بیج جو زبان پر آ کر ٹوٹ گیا تو کونین کی گولی کی طرح تلخ معلوم ہوا، تلخ اور گلے

کو ٹھونٹتا ہوا، میں نا امید ہو کر بیل سے نیچے اتر آیا، قمیض ایک کہنی کے قریب سے پھٹ گئی تھی اور پاجامہ بھی گھٹنوں کی رگڑ سے دو بڑے بڑے بھورے داغ لیے تھا، نیچے اتر آیا، جماہی لی، اف کس قدر اداس ہے یہ دنیا، ان دنوں میں شاعر نہ تھا، افسانہ نویس نہ تھا، پڑھا لکھا نہ تھا۔ ان دنوں نہ شفق میں خوبصورتی تھی، نہ ہوا میں لطافت، نہ گھاس میں سوندھی سی خوشبو، پھول پھول تھے توڑنے کیلئے، گلہریاں پکڑنے کیلئے، تیتریاں پیچھے بھاگنے کیلئے، عورتیں جوشاندہ پلانے اور ناک مروڑنے کیلئے اور کان پکڑ کر اسکول لے جانے کیلئے مامور کیے گئے تھے، اس لیے میں نے زور سے ایک جماہی لی اور سوچا کہ اب کیا کروں، کہاں جاؤں۔ اب نہ گھر جا سکتا ہوں، نہ اسکول۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں ان پہاڑوں سے پرے کہیں دور چلا جاؤں، جہاں اچھے لوگ بستے ہیں، جہاں شہزادے اور شہزادیاں رہتے ہیں، جہاں جادوگر محل بناتے ہیں اور پریزاد ہنس کے پروں پر نیلی جھیلیں پار کرتے ہیں، ہاں بس یہ ٹھیک ہے۔

یہ سوچ کر میں داخ کے جھنڈ سے نکلا اور گھاٹی کی ڈھلوان کی طرف بڑھا، گراموفون کے بھونپوؤں کو اپنے پاؤں سے کچلتا گیا۔ جوتا اتار کر میں نے اپنے بستے کے قریب رکھ دیا، کیونکہ اب نرم نرم گھاس پر ننگے پاؤں چلنے میں لطف حاصل ہو رہا تھا۔ میں نے زور زور سے سیٹی بجانا شروع کی، کامنی، کامنی موسی مجھے اس وقت سیٹی بجاتے دیکھ پاتیں، تو کیا کہتیں...... میں نے ادھر ادھر دیکھا، لیکن کامنی موسی کہیں نظر نہ آئیں......اوہ! مجھے کیا پرواہے...... میں نے اطمینان سے پھر سیٹی بجانا شروع کی۔ یکا یک قریب سے کسی نے مجھے زور سے ڈانٹا اور میں خوف سے اچھل کر بھاگا، پھر مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کامنی موسی نہ تھیں ایک شریر ماہی مار تھا جواب ہوا میں چیختا ہوا شوخی سے پر کھولتا ہوا پر بند کر کے ہوا میں ڈبکیاں لیتا ہوا، اڑا چلا جا رہا تھا۔ کم بخت نے مجھے یوں ہی ڈرا دیا تھا۔ میں نے زمین سے کنکر اٹھا کر اسے مارنا شروع کیا، لیکن ایک کنکر بھی اسے نہ لگا اور وہ قہقہے لگاتا ہوا، مزے سے اڑتا ہوا ندی کی طرف چلا گیا۔ جانے دو بچہ جی کو جب ہم جادوگر سے جادو کی چھڑی چھین کر لائیں گے، پھر اس شیطان ماہی مار سے پوچھیں گے کہ اس طرح چلتے چلتے لوگوں کے سر پر کھڑے ہو کر چیخنے کا کیا مطلب ہے؟

ڈھلوان کے آخر میں، گھاٹی کے دامن میں دو چشمے بہہ رہے تھے، یہاں گاؤں کی لڑکیوں کا اکثر جمگھٹا رہتا تھا، میں نے سوچا، یہاں کسی نے مجھے گھومتے ہوئے دیکھ لیا تو رپورٹ ہو جائے گی، اسی لیے میں نیچے کی طرف جاتا جاتا رک گیا اور پھر رخ بدل کر گھاٹی کے درمیان سبلو کی جھاڑیوں اور کاؤ کے درختوں میں اپنے آپ کو چھپاتا ہوا چلنے لگا۔ نیچے میں ان دو چشموں کو دیکھ سکتا تھا، جہاں لڑکیاں گھڑے بھر بھر کے لیے جا رہی تھیں، لیکن میرا راستہ ان کے راستے سے الگ تھا اور دونوں راستے گویا ایک دوسرے کے متوازی چل رہے تھے۔ جی میں آیا کہ دو چار پتھر اٹھا کر دے ماروں اور گھڑے پھوڑ دوں، تڑاخ سے گھڑے پھوٹ جائیں گے اور بھک سے سارا پانی لڑکیوں کے کپڑوں کو شرابور کرتا ہوا نیچے گر جائے گا، پھر سوچا اگر کسی نے پکڑ لیا تو...... اور مجھے ابھی دور...... / بہت دور پریوں کے دیس جانا ہے، جس کی کہانی مجھے اکثر رات کو مانی موسی سنایا کرتی ہیں اور جوان کے کہنے کے مطابق اس سلسلہ ہائے کوہ کے پرے واقعہ ہے۔ میں سوچ کر رک گیا۔ جھاڑیوں میں دو گلا میں خوشی سے چیخیں اور پھر سے اڑ گئیں، ایک اور گلہری نظر آئی جو کاؤ کے ایک پتلے سے ٹنڈ سے لگی مجھے مقابلے کی دعوت دے رہی تھی، لیکن اب تو میرے پائجامے کے پائنچے بھی اوس سے گیلے اور کانٹوں سے تار تار ہو چکے تھے، اس لئے میں آگے بڑھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ آگے بڑھا تو دیکھا کہ بالکل سامنے ایک خوبصورت چکور، موٹا موٹا چتکبرا چکور مزے سے ٹہلتا ہوا جا رہا ہے، عین سامنے، بالکل راستے میں، میں اسے دیکھ کر رک گیا اور ایک تنے کی اوٹ میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اسے کس طرح پکڑا جائے، پھر سارے داؤں سوچ کر آگے بڑھا، آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل چلنے لگا، تاکہ...... آہٹ نہ ہو، ہر لمحہ مجھے اس کے قریب لا رہا تھا۔ یکا یک چکور نے گردن موڑ کر مجھے دیکھ لیا اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے اپنے پروں کو ایک ہلکی سی جنبش دی اور میں نے ناامید ہو کر سوچا کہ اب یہ اڑا...... لیکن میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب وہ مجھے دیکھ کر بھی بدستور اپنی چال چلتا رہا۔ میں سوچا ضرور یہ چکور جانور کسی کا پالتو ہے اور چھوٹ گیا ہے، یا پھر یہ ابھی بچہ ہے جو اڑ نہیں سکتا، ممکن ہے کہ زخمی ہو، کسی لڑکے نے گوپھیا مار کر اس کا پر توڑ دیا ہو......

میں نے اپنی رفتار تیز کردی، ادھر چکور نے بھی...... پھر میں نے گھٹنوں کے بدل چلنا چھوڑ دیا اور سیدھا اٹھ کر اسکے پیچھے بھاگا اور عین اسی وقت کہ میں اسے دبوچنے کو تھا، چکور نے اپنے پر پھیلائے اور اطمینان سے اڑتا ہوا ہوا میں چکر لگانے لگا اور میں گھبراہٹ میں ایک لگھواڑے کے درخت سے ٹکرا گیا اور نیلا دھاری کی جھاڑی میں جا گرا اور وہاں سے لڑھک کر سبزے پر جو پھسلا ہوں تو بیر کے ایک بڑے جھاڑ کے نیچے جا کر ہی رکا......

یہاں پر ایک لڑکا چاقو کی مدد سے زمین کھود رہا تھا، میری ہیئت کذائی دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی کمر پر......دونوں ہاتھ ٹیک کر قہقہے لگانے لگا۔ میں جلدی سے کپڑے جھاڑ کر اٹھا اور گو میرے پاؤں اور بازو کانٹوں سے زخمی ہو گئے تھے، میں اس پر اپنی مٹھیاں بھینچ کر اس کی طرف بڑھا، اور اس سے پوچھا۔ ''کیوں ہنستے ہو جی؟''

ہو ہو ہو!!! اس نے ہنستے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''معلوم ہوتا ہے تم اسکول سے بھاگے ہو''۔

''ہاں'' میں نے مٹھیاں بھینچ کر جواب دیا ''کیا تمہارے باپ کا سکول ہے؟''

ہو ہو ہو!!! وہ اور بھی زور سے ہنسنے لگا اور کہنے لگا، میرے باپ کا اسکول ہوتا تو تم وہاں سے بھاگ سکتے؟ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے ہیں، اور آج تک ہمارا ایک گھوڑا بھی نہیں بھاگا......!

''میں گھوڑا نہیں ہوں'' میں نے غصے سے کہا۔

ہو! ہو! ہو!!! وہ چیخا، پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک دم مجھے بازو سے پکڑ لیا اور اپنے قریب کھینچ کر بولا۔ ''جانتے ہو، میں چاقو سے زمین کھود رہا ہوں؟''

''کوئی خزانہ ہوگا''۔ میں نے ایسی لاتعلقی کے انداز میں کہا۔ جس میں ذرا سی دلچسپی بھی پائی جاتی تھی، اس سے خفا ہونے کے باوجود میں اس گمشدہ خزانے میں دلچسپی لینے سے اپنے آپ کو کیسے روک سکتا تھا۔

''خزانہ نہیں ہے'' اس نے فیصلہ کن انداز میں ہاتھ جھٹک کر کہا......

''تو پھر جادو کی تختی ہوگی''میں نے جواب دیا

''نہیں جادو کی تختی نہیں ہے''۔

''تو پھر کیا ہے میاں؟''

''خونی بوٹی''

خونی بوٹی؟

''ہاں خونی بیٹی۔کبھی پیاز کھایا ہے تم نے،بس خونی بوٹی کی شکل بھی بالکل پیاز کی مانند ہوتی ہے،لیکن اس میں خون بھرا ہوتا ہے۔

''خون؟''......کس کا خون ہے۔کسی جن کا خون ہے اس میں......؟

''نہیں کسی جن ون کا بھوت بھات کا خون نہیں۔اس میں آدمی کا خون ہے؟''

اس نے جواب دیا اور میرے سارے بدن میں جھری جھری آ گئی۔

''آدمی کے خون کو کیا کرتے ہیں؟''میں نے اس سے پوچھا۔

''پیتے ہیں''

''پیتے ہیں''میں نے خوف زدہ ہوکر اس سے پوچھا۔

''ہاں بڑے مزے کا ہوتا ہے اور میرا باپ کہتا ہے،جولڑکا اس خونی بوٹی کا خون پی لے۔وہ ہوا میں اڑسکتا ہے،اونچا......اڑن کھٹولے کی ضرورت نہیں رہتی''۔

''ارے واہ''......میں نے خوشی سے تالی بجائی اور اس کا چاقو لے کر کہا''لاؤ مجھے یہ زمین کھودنے دو''۔

''تم پرے ہٹ جاؤ''اس نے مجھے غصے سے دھکیل کر کہا۔''یہ بوٹی میری ہے،اس کا خون میں پیئوں گا''۔

''نہیں میں پیئوں گا......میں نے کہا......اور نہیں تو میں تمہیں یہ جگہ کھودنے دوں گا''۔

وہ بولا۔''اچھا......تو ہم باری باری زمین کھودیں گے،جب جڑی نکل آئے گی تو

اس کا آدھا خون تم پی لینا، آدھا میں پی لوں گا، اور پھر ہم دونوں ہوا میں اڑ جائیں گے۔ میں نے خوشی سے کہا'' اور ماسٹر کے سر پر پیشاب کریں گے......اور وہ دور بہت دور پریوں کے دیس میں چلیں گے، کامنی موسی کہتی تھیں......

وہ میری طرف غور سے دیکھ کر بولا۔''تم بنگلے میں رہتے ہو'' اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

میں نے شرمسار ہو کر کہا۔''ہاں'' اور پھر......''تم کہاں رہتے ہو؟''

وہ بولا۔''میں اس اونچے پہاڑ پر رہتا ہوں، ہمارا گھر مٹی کا ہے۔ دو منزلہ ہے۔ تمہارا بنگلہ تو صرف ایک منزل کا ہے۔ میرے باپ کے پاس پچاس گھوڑے ہیں۔ میرا نام امجد ہے''......

خونی بوٹی کی خاطر میں اس سے لڑائی مول نہ لینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس شیخی خورے کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ ہو رہا۔ امجد اور میں باری باری چاقو سے زمین کھودتے رہے، گھونگے، چھوٹی چھوٹی سیپیاں، سفید، زرد اور سبز رنگ کے پتھر نکال کر ان سے اپنی جیب بھرتے رہے، آخر میں ایک لمبی جڑ کے نیچے وہ پیاز کی گٹھلی سی نظر آئی اور میں نے چیخ کر کہا''خونی بوٹی؟''

ہٹو۔ مجھے دیکھنے دو۔ وہ کہاں ہے؟ امجد چلایا اور اس نے پھر مجھے دھکیل دیا۔''ادھر لا چاقو، تم کہیں اسے زخمی کر دو گے اور سارا لہو گٹھلی سے نکل کر مٹی میں گھل جائے گا''۔

''پرے ہٹو''......اب وہ نہایت احتیاط سے اس گٹھلی کے اردگرد کی زمین کھود رہا تھا۔

آخر بھورے رنگ کی گٹھلی جس کے چاروں طرف مٹی لگی ہوئی تھی صحیح سلامت باہر نکال لی گئی۔ اب وہ امجد کی انگلیوں میں لٹک رہی تھی۔ اڑن کھٹولے کی طرح......امجد آہستہ آہستہ اس کی جلد پر سے مٹی اتارنے لگا۔ میں نے امجد سے کہا۔''اسے اچھی طرح تھامے رہو ورنہ یہ اڑ جائے گی''۔

''تمہیں کیسے معلوم ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں'' میں نے کہا

امجد جب گٹھلی صاف کر چکا تو، تو بولا۔ ''اب اس کا آدھا حصہ کیسے ہوگا؟''

''میں بتاؤں اس کے بیچ میں چاقو سے ایک سوراخ اور پھر اس سوراخ کو انگوٹھے سے دبادو اور قطرہ قطرہ کر کے منہ میں ٹپکاتے جاؤ۔ میرے منہ میں اور اپنے منہ میں۔ باری باری، لو اب جلدی کرو۔ مجھے اڑ کر پریوں کے دیس جانا ہے'' میں نے کہا۔

امجد نے چاقو سے گٹھلی میں شگاف کیا اور وہاں انگوٹھا رکھ دیا۔ پھر اپنا منہ کھول کر اس نے انگوٹھے کے دباؤ کو ذرا ڈھیلا کر دیا اور آدمی کا خون اپنے منہ میں ٹپکانے لگا۔

وہ پہلا قطرہ...... میں اس سرخ خونی قطرے کو دیکھنے کیلئے اس قدر بے تاب تھا کہ میرا منہ بے اختیار کھل گیا۔ جیسے وہ قطرہ میرے منہ میں ہی ٹپکنے کو تھا۔

لیکن وہ قطرہ نہ ٹپکا۔

امجد نے انگوٹھے کو شگاف سے ذرا پرے سرکا دیا۔

اور پرے سرکایا

اور پرے سرکایا

بالکل ہٹا دیا۔

ارے!

گٹھلی سے خون کا قطرہ بھی نہ بہا۔

پھر جلدی سے گٹھلی کو چیرا گیا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے لیکن خون کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پس پیار کی مانند تہہ بہ تہہ چھلکے تھے اس میں اور کچھ نہ تھا۔ ذرا سا لے کر چکھا۔ کڑوا زہر تھا۔

امجد نے اسے لے کر ذرا نیچے پھینک دیا اور پھر بولا۔

''یہ گٹھلی کچی ہے۔ ابھی اس میں خون پیدا ہی نہیں ہوا......؟''

امجد اور میں ندی کے کنارے کنارے بہت دیر تک تیرتے رہے اور جب تیرتے تیرتے تھک جاتے تو پانی سے نکل کر ریت پر لیٹ جاتے اور سورج کی گرم گرم کرنوں اور ریت کی تپتی ہوئی سطح سے اپنے جسم کو گرماتے اور کسی چوڑے پتھر پر کانوں کو ٹیک کر ان میں سے پانی نکالنے کی کوشش کرتے۔ یہاں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں جمع تھے۔ چھوٹے چھوٹے چرواہے اور چرواہیاں جوان بڑی بڑی گایوں، گھوڑوں اور گدھوں کے گلوں کی اس چابک دستی سے نگہداشت کرتے تھے کہ مجھے تو بار بار حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح یہ دیو ہیکل جانور جو قریب ہی سبزے پر چر رہے تھے ان منحنی چرواہوں کے رعب میں آ کر ان کے ہر اشارے کو حکم سمجھ کر بلا چوں و چرا اس کی تعمیل کرتے ہیں۔

میں اور امجد ریت پر لیٹے تھے اور امجد کے قریب پارو لیٹی تھی اور پارو کے قریب دو تین اور لڑکے اور لڑکیاں......اور پارو کے بھورے بھورے بال سورج کی کرنوں میں گہرے سنہری ہو گئے تھے، اور پارو مجھے بڑی اچھی لگی تھی اور ندی میں تیرتے وقت بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تیرتے رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ تیرتے تیرتے ہم دونوں پتھر کی ان سلوں پر اچک کر بیٹھ جاتے جو ندی کے بڑے بہاؤ کو ہمارے تیرنے کی جگہ سے الگ کرتی تھیں، وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے پارو سے کہا

''میں ندی کے بڑے بہاؤ میں تیر سکتا ہوں''

''جھوٹ'' وہ بولی۔

میں نے کہا ''اور میں پریوں کے دیس جا رہا ہوں آج مجھے کامنی موسی نے بتایا ہے کہ......''

پارو اپنا نچلا ہونٹ ایک عجیب ادا سے سکیڑ کر بولی۔

''تو تم بنگلے میں رہتے ہونا''

''ہاں! اور میرے بنگلے میں پیلے گلاب کی ایک بہت بڑی بیل ہے۔ تم نے پیلے گلاب دیکھے ہیں؟''

''نہیں'' پارو بولی۔

''اچھا۔تو میں تمہیں بہت سے پیلے گلاب دوں گا اور ایک ہار بناؤں گا تمہارے لئے۔

پارو اپنی پریشان لٹوں سے پانی نچوڑتے ہوئے بولی۔

''اچھا تو ہم تم سے بیاہ کریں گے،امجد سے نہیں کریں گے۔

امجد؟ میں نے کہا۔''امجد تو بدھو ہے۔وہ تو اسکول بھی نہیں جاتا''۔

اتنے میں امجد تیرتا ہوا ہمارے قریب آیا،اور اس نے ہم دونوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر پانی میں گھسیٹ لیا۔ہم پھر تیرنے لگے اور پانی کی کلیاں ایک دوسرے پر پھینکنے لگے۔ہتھیلیوں میں پانی بھر بھر کر اسے اس طرح پھینکتے کہ پانی اک بلند دائرے کی صورت میں فضا میں بکھر جاتا۔کبھی ہم دھب دھب ٹانگیں ہلا کر نقلی آبشار گراتے اور پانی کی سطح کو بلوئی ہوئی جھاگ میں تبدیل کر دیتے۔

اب ہم سب ریت پر لیٹے دھوپ کا لطف لے رہے تھے،پارو اور میں بالکل قریب لیٹے ہوتے،لیکن کم بخت امجد بیچ میں آ کر پارو کے قریب اوندھا پڑ گیا۔اس کی ٹھوڑی ریت میں گھسی ہوئی تھی۔کالے کھر درے بالوں میں کیچڑ اور ریت تھی اور کان کی لوؤں کے قریب ریت میں پانی کے دو چھوٹے چھوٹے گڑھے بن گئے تھے،وہ نیم باز نگاہوں سے کبھی مجھے کبھی پارو کو دیکھ لیتا۔

میں نے کہا''پارو اور میں بیاہ کر رہے ہیں''۔

پارو مجھے دیکھ کر ہنسی۔

امجد نے غصے سے پارو کی طرف دیکھا۔پھر میری طرف......

میں نے کہا''اور پارو میرے ساتھ پریوں کے دیس جا رہی ہے''۔

امجد کی آنکھوں میں گویا خونی بوٹی کا لہو اچھلنے لگا۔اس نے قہر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اس نے اپنی انگلیاں ریت میں گاڑ دیں اور اپنی مٹھی میں ریت بھنچ کر بولا۔

''یہ سچ ہے پارو؟''

پارو نے اپنی سنہری لٹ جو اس کے رخساروں پر لرزاں تھی، اپنے دانتوں کے درمیان رکھ لی اور چپ چاپ ہنسنے لگی۔

امجد نے اپنی ریت بھری ہوئی مٹھیاں اوپر اٹھائیں، اور وہ ریت کو میری آنکھوں میں جھونکنے کو تھا کہ ندی کنارے کسی نے آواز دی...... ''ہو جر یو روٹی کھا گینو''

یکا یک بھوک سب پر غالب آ گئی۔ امجد کی مٹھیاں ریت سے خالی ہوگئیں، اور ہم سب لوگ ندی کے کنارے تنور کے درخت کے نیچے چلے آئے۔ مکئی کی روٹی تھی اور گنبھار کا ساگ، ہر گھر سے گنبھار کا سالن آیا تھا۔ دو ایک گھروں سے یہ سالن بھی نہ آیا تھا۔ صرف مکئی کی روٹی تھی اور پسی ہوئی سرخ مرچ اور نمک، پارو کے گھر سے پیاز کی تین گٹھلیاں بھی آئیں تھیں اور پارو نے جلدی سے پتھر کی ایک سل پر رکھ پر پیس ڈالا اور نمک، مرچ اور وہیں سے جنگلی پودینہ توڑ کر چٹنی بنا ڈالی......سب سے پہلے اس نے مکئی کی روٹی پر چٹنی رکھ کر مجھے کھانے کو دی، پھر امجد کو۔ بعد میں خود۔ امجد اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ مجھے روٹی کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ پارو کے کندنی چہرے پر اس وقت ایک عجیب معصوم، شریر، شوخ اور بھولی بھالی سی مسکراہٹ تھی، وہ چہرہ، وہ مسکراہٹ مجھے اب بھی یاد ہے......

کھانے کے بعد ہم لوگ ندی سے پانی پی رہے تھے کہ امجد نے مجھے دھکا دے کر پانی میں گرا دیا۔ پارو چیخی، میں نے غصے میں آ کر امجد پر پانی پھینکا اور پھر ندی سے نکل کر اس سے ہاتھا پائی کرنے لگا۔

امجد بولا ''بس اپنے بنگلے کو چلے جاؤ، سیدھے۔ پارو سے میں بیاہ کر رہا ہوں''۔

میں نے کہا ''نہیں پارو سے میں بیاہ کروں گا، تو تو مسلمان ہے پارو سے بیاہ کیسے کرے گا؟''

وہ بولا۔ ''اس میں کیا ہے اور تم تو باہر کے رہنے والے ہو۔ تم پنجابی، ہم کشمیری ہیں اور پھر تمہارا باپ بنگلے میں رہتا ہے''۔

بنگلے کا ذکر سن کر سارے چرواہے ہنسنے لگے۔

''اور پھر امجد دوسرے چرواہے اور چرواہیوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔ دیکھا تم نے...... یہ لڑکا روز اسکول جاتا ہے''۔

اسکول پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اور میں نے تاؤ میں آ کر امجد کو ایک گھونسا لگا دیا۔ امجد نے مجھے...... جلد ہی ہم ایک دوسرے پر پل پڑے۔ گتھم گتھا ہو گئے اور لڑکے لڑکیوں نے ہمیں اپنے حلقے میں لے لیا اور شور مچا مچا کر داد دینے لگے، تھوڑی دیر کے بعد میرا دم پھولنے لگا اور امجد نے مجھے زور سے زمین پر پٹخ دیا۔ اڑی گھوڑا دے کر، اور میری چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ اب میں بازی ہار چکا اور ریت میری آنکھوں میں تھی اور کانوں میں اور حلق، پھر بھی جب تلک میں نے اچھی طرح دانت کٹکٹا کر اس کے بازو کو نہ کاٹ کھایا۔ امجد نے مجھے چھوڑا نہیں......!

ایک لڑکے نے کہا ''یہ غلط بات ہے۔ اس نے امجد کے بازو کو کاٹ کھایا ہے''۔

دوسرا بولا ''ہاں کشتی کے داؤ میں داخل نہیں''۔

تیسرا بولا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے''۔

ایک لڑکی بولی۔ ''اسے سزا ملنی چاہیے۔ یہ ٹھیک نہیں لڑا......''

پارو بولی۔ ''ہاں! اس لڑکے کے کپڑے یہاں رکھ لو۔ اس نے امجد کی بازو کاٹ کھایا ہے۔ یہ لڑکا ہے...... یا باؤلا کتا''۔

پھر سب چرواہے۔ ''باؤلا کتا، باؤلا کتا'' کہہ کر مجھے چڑانے لگے، میری آنکھیں جو پہلے ہی ریت سے جل رہی تھیں، اب غم و غصے سے بھر آئیں اور میں دہاڑیں مار مار کر روتا ہوا ننگ دھڑنگ اپنے بنگلے کو روانہ ہوا اور دور تک چرواہے اور چرواہیاں ناچ ناچ کر اور چیخ چیخ کر مجھ پر آوازی کستے رہے۔ ''بنگلے کا باؤلا کتا، بنگلے کا باؤلا کتا''۔

کپڑے کھوئے، جوتا کھویا، جزدان کھویا اور ہر جگہ اچھی ٹھکائی ہوئی۔ ندی پر...... گھر پر...... اسکول پر...... لیکن مجھے کسی پر غصہ نہ تھا۔ نہ ماجد پر...... نہ گھر والوں پر...... نہ مدرس پر...... مجھے صرف پارو پر غصہ آتا تھا اور رہ رہ کر آتا تھا...... کم ذات کمینی...... کہتی تھی، اس سے

کپڑے چھین لو...... ہائے ہائے نہ ہوئی اس وقت میرے پاس جادو کی چھڑی ورنہ کم بخت کو ایک پل میں چوہیا بنا دیتا......

پارو میرے جذبہ محبت کی پہلی شکست تھی۔ یہ الگ بات ہے اس وقت میں اس وجہ سے، اس شکست، اس رنج، اس آنسوؤں کو نہ پہچان سکا تھا۔ لیکن...... شکستوں کے اس لمبے جلوس پر جب کبھی میں مڑ کر نظر دوڑاتا ہوں...... تو حد نگاہ پر مجھے پارو کا کندنی چہرہ نظر آتا ہے، اسکی بھولی بھالی آنکھوں میں معصوم شرارت ہے اور اپنے دانتوں میں اس نے ایک سنہری لٹ داب رکھی ہے اور خاموشی سے ہنس رہی ہے......!

دوسرے دن شاید کوئی تیوہار تھا اور میں نیچے نئے کپڑے پہنے بنگلے کے باہر زرد گلاب کی بیل کے نیچے کھڑا تھا اور اس امید میں تھا کہ کب ماں کیمرہ لے کر باہر آئیں اور میرا فوٹو اترے، اتنے میں امجد ہاتھ میں گوپیا لیے دوڑتا ہوا وہاں سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا کہنے لگا ''یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''

میں نے منہ پھیر لیا۔

اس نے گلاب کے پھولوں پر منڈلاتی ہوئی رنگا رنگ تیتریوں کو دیکھا اور کہنے لگا۔

''آہاہا، تمہارے ہاں تو بڑی اچھی تیتریاں ہیں۔ تم انہیں پکڑتے نہیں......''

اس کے لہجے میں بڑی ملائمت تھی۔ جیسے وہ مجھ سے معافی طلب کر رہا ہو۔ میرا دل بھی تھوڑا سا پسیجا۔ لیکن میں چپ ہو رہا۔ اس نے اپنے گوپیے میں ایک کنکر رکھ کر زور سے چلایا اور بولا۔ ''لو...... یہ کنکر وہاں پارو کے گھر چلا گیا ہے۔ آج پارو نے نئے کپڑے پہنے ہیں۔

میں چپ ہو رہا۔

''ہم مندر میں بیاہ کرنے جا رہے ہیں'' وہ بولا۔

میں جواب دینے کو تھا کہ سامنے سے مجھے پارو آتی دکھائی دی اور اجلے کپڑے پہنے اپنے باپ کی انگلی سے لگی چلی آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ جس کے سر پر ایک نہایت خوبصورت سبز رنگ کی ستاروں والی مخملی ٹوپی تھی اور پاؤں میں چر چر کرتا ہوا نیا جوتا

تھا۔

''یہ اس کے چچا کا لڑکا ہے'' امجد نے خود ہی مجھے بتایا......

پارو نے ہم دونوں کو پیلے گلاب کی بیل کے نیچے کھڑا دیکھا۔ اس نے ہم دونوں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور پھر ایک مغرور ادا سے منہ پھیر لیا اور اپنے چچازاد بھائی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ پارو کا باپ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

امجد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے نہایت احتیاط سے گوپیے میں ایک کنکر رکھا اور اسے زناٹے کے ساتھ پارو اور کے ساتھی لڑکے کی طرف پھینکا۔ پارو نے مڑ کر ہماری طرف شریر نگاہوں سے دیکھا اور پھر مسکرا کر اس نے بالوں کی ایک لٹ اپنے دانتوں میں داب لی اور پھر ناچتے دوڑتی آگے چلی گئی......!

امجد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''بڑی کمینی ہے پارو''

''کم ذات'' میں نے کہا۔

اور اس کا باپ تو دیکھو۔ وہ بولا ''گنجا سڑے چمڑے کی طرح......

میں نے کہا۔ اس کی ناک دیکھی؟ کریلے کی طرح......

امجد بولا۔ اور اس لڑکے کا منہ کیا تھا؟ جیسے پھولا ہوا ڈھول......!

اور وہ چلتا کس طرح تھا۔ میں نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''باگڑ بلے کی طرح''

ارے وہ تیتری۔ آہاہاہا! امجد چلایا۔

اور پھر ہم دونوں باڑھ پھاند کر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، اس یاقوتی تیتری کی طرف لپکے جو باغیچے میں ناچتی ہوئی جا رہی تھی۔

◆◆◆

یرقان

کرشن چندر کا پہلا افسانہ جو انہوں نے کالج کے زمانے میں لکھا ''یرقان'' تھا۔ ان پر ایک بار یرقان کا سخت حملہ ہوا تھا۔ اس بیماری کے بعد ہی کرشن جی نے افسانہ ''یرقان'' لکھا۔ جس پر یرقانیت کا کافی اثر ہے۔

....

''یرقان بذات خود کوئی بیماری نہیں'' یہ ڈاکٹروں کا ایک مفروضہ ہے۔ سائنسدان کے اس مفروضہ کی طرح کہ چاند بذات خود روشن نہیں دراصل اسی قسم کے مفروضوں سے ڈاکٹر اور سائنسدان عامیوں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ورنہ یہ تو غیر ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی چاند کی ٹھنڈی چاندنی اور یرقان جیسی تکلیف دہ بیماری سے انکار کر سکے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری بات پر مطلق یقین نہ کیا جائے اور اسے محض ایک یرقانی نظریہ قرار دے کر طاق نسیاں پر دھر دیا جائے۔

بہر حال آپ کو باور کر لینا چاہیے کہ یرقان ایک بیماری ہے اور بہت اذیت پسند بصورت دیگر آپ کو اس کہانی کے پڑھنے سننے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کہانی کے شروع ہونے پر میں یرقان میں مبتلا تھا اس جس طرح طرح طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف سبزہ ہی سبزہ دکھائی دیتا ہے اسی طرح یرقان میں آدمی کو ہر طرف زردی ہی

زردی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی غیبی ہاتھ نے کل کائنات پر زعفران انڈیل دیا ہو اور بس، اس کے بعد مرض کا ایک درجہ ہے، زندگی کی ایک منزل ہے جہاں دوئی مٹ جاتی ہے اور مجھ جیسا کنوارہ نروان حاصل کر لیتا ہے۔

بس یہی بیماری اس مختصر سے قصہ کی ابتداء تھی، نہ میں بیمار پڑتا نہ شاما میری عیادت کو آتی۔ شاما کے متعلق میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری محبوبہ ہے یعنی میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے جو چکوال میں اینٹوں کے بھٹے پر ملازم ہے بیس روپے تنخواہ لیتا ہے اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے اور کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے جس میں اکثر سیف الملوک، شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں۔ شاما وہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے اس وقت اس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا۔ بچاری ان پڑھ ہے نا۔ اور جب میں سیف الملوک ملوک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص یرقان زدہ انداز میں کرتا ہوں تو کس قدر گھبرا جاتی۔ لجاتی ہے اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گل عارض پر چمک اور آنکھوں میں دمک آ جاتی ہے۔ لب کانپتے ہیں اور پھر مجھے یکا یک اس کی مہین اور شیریں آواز سنائی دیتی ہے ''آگے کیوں نہیں پڑھتے؟'' اور میں بھلا پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا، محبت؟ نہیں یرقانیت! یا اللہ مجھے محبت ہے کہ یرقان؟

ایک دن...... وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے...... میں بستر پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا ہمارے پڑوسی نے ریشم کے کیڑے پالے تھے، وہ ان کے کوئے بیچتا تھا، بڑی اچھی تجارت ہے، پچھلے سال اس نے دو ماہ کے قلیل عرصے میں کوئے بیچ کر تین سو روپے کمائے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی اس سے آٹھ دس ریشم کے کوئے مانگ لایا تھا۔ ان کویوں میں سے پانچ پھوٹ گئے تھے اور ان میں سے ریشم کے کیڑے نکل آئے تھے، سفید اور زردی مائل کیڑے جو کویوں سے نکل کر نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، صرف سات دن زندہ رہتے ہیں، اس عرصے میں نر و مادہ آپس میں جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد نر مر

جاتا ہے۔ پھر مادہ انڈے دیتی ہے، زرد، باریک اور گول گول، خشخاش کے دانوں جیسے، اس کے بعد مادہ بھی مر جاتی ہے۔ بس یہی سات دن ان کی حیات معاشقہ ہے۔

میں ان ریشم کے کیڑوں سے کھیل رہا تھا، ان میں سے چار نر تھے اور ایک مادہ بڑے بڑے پروں والی جو خاموش نر کیڑوں کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے تک رہی تھی، وہ کسے پسند کرے گی۔ کس پر اس کی نظر انتخاب پڑے گی۔ وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس سیمیں تن حسینہ کا محبوب ہوگا۔ آپ سچ جانیے مقابلہ واقعی سخت تھا، نر کیڑے دیوانہ وار بھنوروں کی طرح اس کی طرف اڑ اڑ کر چلے جاتے تھے۔ وہ پروانوں کی طرح شمع کے گرد طواف کرتے تھے، کبھی وہ آپس میں گتھ جاتے، اس طرح مجھے ان میں سے کسی ایک کی ہلاکت کا شبہ ہو جاتا پھر میں جلدی سے انہیں الگ الگ کر دیتا۔ وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہتے، بالکل خاموش بے حس حرکت مگر جلد ہی وہ حسین مجسمہ انہیں اپنی طرف مائل کر لیتا اور وہ پھر بے اختیار پھڑ پھڑانے لگتا، کبھی ایک کبھی دوسرا اڑ کر مادہ کے پاس جاتا اور اپنے منہ کو اس کے منہ کے قریب لا کر نہایت چرب زبانی سے اپنے عشق کا اظہار کرتا، وہ کافر ادا کبھی مسکراتی، کبھی بے اعتنائی سے منہ موڑ کر پرے ہو جاتی۔ نر بیچارا اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا...... عورت کی فطرت میں دورخی کیوں ہے، ایک ہی نظر سے یہ گھاؤ بھی پیدا کرتی ہے اور اس پر پھاہا بھی رکھ دیتی ہے۔ دل تڑپا دیتی ہے اور تسکین بھی پہنچاتی ہے۔ ستم بھی اس کو پھبتا ہے کرم بھی اس کے شایان ہے......

یہی سوچتے سوچتے میں نے آنکھیں بند کر لیں، کسی کے پاؤں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اور کوئی میرے سرہانے آ کھڑا ہوا۔

میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہا۔ ''ماں...... دلیہ لائی ہو؟''

''نہیں میں ہوں شاما''

اگر میرے پیٹ پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل یک لخت پھٹ جاتی تو بھی مجھے اس قدر تعجب نہ ہوتا جس قدر شاما کے آنے پر ہوا، جب سے میں بیمار ہوا تھا اور مجھے بیمار پڑے تین ماہ ہو چکے تھے، وہ ایک بار بھول کر بھی مجھے پوچھنے نہ آئی تھی، کیا اس کے خاوند کا چکوال سے کوئی خط

آیا تھا؟

''شاما، تم؟'' میں نے خالص ڈرامائی انداز میں کہا۔

''ہاں میں!'' اس نے خالص دیہاتی انداز میں جواب دیا، یہ لو'' تمہارے لئے چند ایک خوبانیاں لائی ہوں۔ خوب پکی ہیں اور میٹھی''۔ یہ کہہ کر اس نے رومال کھول کر سب خوبانیاں میرے بستر پر رکھ دیں۔

یرقان میں مجھے دو چیزیں بہت مرغوب و موافق ہیں، ایک خوبانی دوسری شاما، پھر جب دونوں اکٹھی مل جاتی تو خوش قسمتی سے کیا کہنے، آج میں واقعی خوش قسمت تھا۔ میں آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اخبار کا وہ صفحہ جس پر ریشم کے کیڑے دھرے تھے آہستہ سے پرے رکھ کر کہا۔ ''آؤ بیٹھو''۔

وہ پائنتی پر بیٹھ کر بولی ''کیا حال ہے؟''

''اچھا ہے''

کچھ دیر ہم دونوں صم بکم بیٹھے رہے۔ میں نہ جانتا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ دل میں جذبات کا طوفان سا امڈ آیا تھا، اپنے غم اور غصے کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا مگر یکا یک زبان گنگ ہو گئی، دل میں شکایتوں کا طور مارتھا، مگر لب جیسے کسی نے سی دیئے تھے، دل میں بے چینی کا طوفان تھا۔ مگر آنکھیں اس کے چہرے کو دیکھ کر مسرور ہو گئیں......آخر سوچ سوچ کر میں نے کہا۔ ''چکوال سے کوئی خط آیا؟''

''نہیں تو، تم بہت ہی نحیف ہو گئے ہو۔ تمہاری آنکھیں اس قدر زرد کیوں ہیں، مجھے از حد افسوس ہے میں اس سے پہلے تمہارے ہاں نہ آسکی۔ ماں کی طبیعت علیل تھی، خوبانی کیوں نہیں کھاتے، کھاؤ''۔

میں نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا، ایک خوبانی اٹھائی اور منہ میں ڈال کر دل کو لعنت و ملامت کرنے لگا۔ ارے میاں کچھ تو کہو، اگر شکایت کی جرات نہیں تو اظہار محبت ہی سہی، ان تعریفی نگاہوں سے کیا ہوتا ہے نکل کر بات کرنا سیکھو، گونگے عاشق کو تو ادھیڑ عمر کی

عورتیں بھی پسند نہیں کرتیں۔

''شاما، تم......'' میں نے کہنا شروع کیا۔

''اچھا، یہ ریشم کے کیڑے ہیں''۔ شاما نے جلدی سے اخبار کو اپنی طرف سرکا کر کہا۔ ''کس قدر خوبصورت ہیں، تم نے کہاں سے پائے؟ اچھا یہ مادہ ہے، یہ نر ہیں، کیا خوب اور اب اس نر مادہ کا آپس میں ایجاب قبول ہو گیا، دیکھو یہ کیڑا بڑا السان ہے نا، پتہ نہیں اس سے کیا کیا میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں نا یہ جوڑا تو الگ ہوا۔

اب یہ باقی تین کہاں جائیں گے بچارے کس طرح سسک رہے ہیں دیکھو''۔

میں نے شاما کی طرف دیکھا، سونے کی مورت معلوم ہوتی تھی لب تھوڑے سے کھلے ہوئے تھے اور طلائے احمر کی طرح دمک رہے تھے۔

''تم کس قدر خوبصورت ہو شاما''۔ میں نے سینمائی انداز میں کہا۔ ''اس سے بھی زیادہ خوبصورت جتنا کہ تم اپنے آپ کو سمجھتی ہو، میری آنکھوں اور تمہارے حسن کے درمیان اک زرد پردہ حائل ہے، مگر پھر بھی تم مجھے بہت حسین نظر آتی ہو۔ اور یہ پردہ سامنے سے ہٹ جائے تو پھر کیا یہ تابناک حسن میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے گا......اور تمہاری آنکھیں کس قدر روشن ہیں۔ صاف اور پاکیزہ، نیلوفر کی طرح کھلی ہوئیں''۔

ماں دلیہ لے کے اندر آئیں، کہنے لگیں، ''بیٹا نیلوفر کی بابت کیا کہہ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں اماں! یہی...... یہی...... کہ...... سنا ہے نیلوفر یرقان میں بہت مفید ہے''۔ نہیں بیٹی، مجھے دیسی دوائیوں پر یقین نہیں اور بعض حکیم تو......'' اماں شاما سے باتیں کرنے لگیں۔ میں چپ چاپ دلیہ کھانے لگا۔

''ہاں میں ابھی ابھی ان سے یہ ذکر کر رہ تھی۔'' شاما نے سر جھکا کر کہا ''پتہ نہیں انہیں موافق آئے نہ آئے''

شاما بہت حسین تھی۔ اس لیے اس کے چاہنے والے بھی بہت تھے، وہ بیاہی ہوئی تھی اور یہاں میکے آئی ہوئی تھی، عاشقوں کے وافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا

اوراس کی والدہ اس رنڈاپے میں بھی سہاگ کی شان اور جوانی کی آب قائم رکھے ہوئے تھی، اس امر نے بھی شاما کے عاشقوں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ کر دیا تھا اور ان تمام امور کا شاما کو بخوبی احساس تھا۔ اس کے شریف اور باعصمت ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے، اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم ڈاکٹر اور دو وید پریکٹس کرتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی صرف ایک دکان ہے۔ ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں اور ایک نوجوان ہے، منچلا اور شاما کا چاہنے والا۔ شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں، ایک بیچارہ سیدھا سادھا آدمی، قمیض کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے دوسرا راولپنڈی پاس ہے۔ اس نے تین سال تک راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف ''ٹیلرنگ شاپ'' میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت ہو۔ ہمارے قصبے کے نوجوان ان سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔

ہمارے قصبے میں ایک مڈل سکول ہے، پہلے پرائمری تک ہی تعلیم دی جاتی تھی، مڈل کلاسیں اس سال کھلی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نو وارد ہیں۔ خوبصورت، خوش طبع جوان ہیں، سکول کو اپنے کالج کا بدل بنانا چاہتے ہیں۔ گاتے خوب ہیں، دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی گراموفون بج رہا ہے۔ پر قوال کا ''من تو شدم تو من شدی'' انہیں بہت مرغوب ہے، شاما کے گھر سے گزرتے ہوئے انہیں اکثر گنگاتے بلکہ صاف گاتے ہوئے سنا گیا مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جوش رقابت میں میں اسے محبت سے تعبیر کرتا ہوں۔

ہمارا قصبہ نائب تحصیل دار کا صدر مقام ہے وہ مجسٹریٹ بھی ہیں اور طبیب بھی، ان کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کا بڑا بھاری سبب یہی ہے۔ فارسی اچھی خاصی جانتے ہیں اور ادیب بھی ہیں، شاما کو خالص فنی نکتہ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں اور اس پر اس انداز سے تنقید کرتے ہیں گویا، شاما، شاما نہیں، زندہ عورت نہیں بلکہ لڈ گیو کا ایک مرمریں مجسمہ ہے یا باطلی سیلی کی پر کیف تصویر۔

ہمارے قصبہ میں باوا تھمن گکا استھان بہت مشہور ہے۔عقیدت مند روحیں جو اکثر طبقہ اناث سے تعلق رکھتی ہیں انہیں صرف ''باواجی'' کہہ کر پکارتی ہیں، باواجی کی جوانی ڈھل چکی ہے مگر ہر بات میں نوجوانوں سے آگے قدم دھرتے ہیں ''فنا ہونے سے پہلے کھیلتی ہے موج پانی پر''۔ چرس کا دم لگاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور شاما سے افلاطونی محبت رکھتے ہیں، قد لانبا، جسم اکہرا اور رنگ بگلے کی طرح سپید ہے۔

ساون!

ساون برسات کا مہینہ ہے، ساون میں جھولے پڑتے ہیں، شاعر اور ندی نالے طغیانی پر آجاتے ہیں، دل میں امنگیں اٹھتی ہیں، شاید خون کچا ہوتا ہے، جوش مارتا ہے، میں نے بھی اپنی کوٹھری چھوڑ دی اور باہر باغ میں آرہا۔سر دل کے ایک گھنے چھتنار کے نیچے میرا بستر تھا اور اس کے نزدیک ہی ایک چنار پر میری چھوٹی بہن نے جھولا ڈلوایا تھا، قصبہ بھر کی لڑکیاں دوشیزائیں اور نویلی بہوئیں ہمارے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں، بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔ جب شاما پینگ بڑھاتی تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگتا اور جب وہ پینگ بڑھاتے بڑھاتے دور اوپر چنار کی ٹہنیوں کے سرسبز پتوں میں ایک لمحہ کیلئے گم ہو جاتی تو میرا دل اچک کر گلے میں آرہتا کہیں وہ گر نہ پڑے۔

ایک دن شاما جھولا جھول رہی تھی اور میرا نوکر رالی میرے پاؤں داب رہا تھا، میں ے اس سے پوچھا، رالی، اگر وہ گر پڑے تو پھر کیا ہو؟''

رالی بولا ''کون بابو جی''

''شاما''

رالی بیچارا حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا، اسے میری بات سمجھ میں نہ آئی۔اسے کیا پتہ تھا محبت کیا چیز ہوتی ہے۔

رالی بیچارہ سیدھا سادا نوکر ہے، کبھی کبھی ہکلا کر بات کرتا ہے۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہے کیونکہ اس کی سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور وہ بڑے بھائی

کے اور ماں باپ کے لاڈ اور چاؤ نے عام شباب ہی میں اس کے بال کھچڑی کر دیئے ہیں۔

''رالی'' میں نے اسے ایک لمبے وقفے کے بعد کہا ''تم میری بات نہیں سمجھتے'' اتنے میں شاماں کی ماں دوڑتی ہوئی آئی، کہنے لگی، بابو جی، ذرا رالی کو اجازت دینا، پن چکی سے آٹا پسا کر لے آئے، مہربانی ہوگی (آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر) آج ضرور بارش ہوگی اور رالی ابھی ابھی آٹا نہ لے آیا تو پھر ندی زوروں پر ہو جائے گی، دیکھیے بادل پہاڑوں پر کیسے چھائے ہوئے ہیں۔

رالی بولا۔ ''میں ابھی جاتا ہوں''۔

میں نے کہا۔ ''میری طرف سے اجازت ہے'' رالی یہ سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

رالی بیچارا بہت سیدھا سادا ہے۔ میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی چاروں طرف بادل چھا رہے تھے اور مشرق کی طرف تو کالا دھاری کی چوٹیاں کالی گھٹاؤں میں چھپی ہوئی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا آج ندی میں طغیانی آئے گی۔ پہاڑی نالہ کمزور آدمی کے غصے کی طرح جلد چڑھتا ہے اور جلد ہی اتر جاتا ہے۔ ساون کے دنوں ندی کئی جانیں لے لیتی ہے نالہ ایک دم ٹھاٹھیں مارتا ہوا آتا ہے اور کناروں سے اچھل کر میلوں اطراف میں پھیل جاتا ہے، گاؤں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، ڈھور ڈنگر اور اناج اور مال کے نقصان کا کچھ اندازہ نہیں۔

اماں میرے قریب آ کر کہنے لگیں۔ ''اندر چلو، آج بارش ہوگی، گھٹا تلی کھڑی ہے رالی کہاں ہے؟''

شاما کی ماں نے پن چکی سے آٹا لانے کو کہا تھا، ادھر ہی گیا ہوگا، چلو اندر چلتا ہوں''۔ لڑکیوں کے جھولا جھولتے بارش شروع ہوگئی پل میں جل تھل ہو گیا، ندی کی پرشور روانی میرے خواب کے اندر بھی سنائی دے رہی تھی۔

رات کے دس بج گئے رالی نہ آیا۔ اماں اسی فکر میں کھوئی ہوئی میرے پاس بیٹھی رہیں ''کم بخت کو اس وقت جانے کی کیا ضرورت تھی، انکار کر دیتا''۔ اماں نے کہا۔

''میں نے ہی اجازت دی تھی'' میں نے آہستہ آہستہ سے جواب دیا۔

''تم بھی نادان ہو، وہ بھلا موسلا دھار بارش میں کیسے آئے گا۔ ذرا ندی کا شور تو سنو۔ ندی ٹھاٹھیں مار رہی ہے اور وہ اس وقت تک کیوں نہیں آیا، پن چکی بھی تو دور نہیں، یہی چار میل کے قریب ہوگی۔ اسے اس وقت تک آ جانا چاہیے تھا۔ کہیں اس پار ہی نہ رہ گیا ہو''۔

''اور ماں'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس نے ندی عبور کرنے کی کوشش کی ہو، یوں تو اچھا خاصا تیراک۔

''چپ بیٹا، یوں نہیں کہا کرتے، رام سب کا بھلا کرتے ہیں''۔

بارہ بج گئے مگر مجھے نیند نہ آئی، شمع کی تھرتھرائی ہوئی لو میں میں نے دیکھا کہ اماں وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی ہیں، اتنے میں آنگن میں آہٹ سی ہوئی کسی نے دیوار کے ساتھ اپنا سونٹا ٹیک دیا اور لمبی سانس لی۔

میں نے کہا ''رالی''

''جی ہاں''

''آٹا لے آئے''

''لے آیا بابو جی، وہاں ان کے گھر تو سب سوئے پڑے تھے، ودھوا کو جگایا اور اس کے حوالے کر کے ابھی آ رہا ہوں''۔

''کم بخت پوچھتا ہوں تم آٹا کیسے لے آئے؟''

''کھال میں بابو جی، بالکل نہیں بھیگنے دیا، ندی بڑے زوروں پر تھی پرمیشر نے ہی جان سلامتی رکھی''۔

''بیوقوف تمہیں آنے کی اتنی کیا جلدی تھی۔ ندی کے پار ہی رہ جاتے''۔

''میں نے سوچا شاماں بھوکی رہے گی......''

جواب سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ بینگن کے پودے میں انگور کے خوشے کیسے۔ تلخ لہجے میں میں نے اس سے پوچھا ''اور اگر تم ندی میں غرق ہو جاتے تو......

رالی تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر ہکلانے لگا۔ ''میرا...... را کیا ہے بابو جی یہ زندگی

ک......ک...... کسی کے کام آجاتی، میں اپنے آپ کو بھاگوان سمجھتا''۔

''کم بخت، مجنوں بھی کوئی تمہاری ہی طرح کا گنوار ہوگا''۔

''کیا کہا بابو جی؟''

''کچھ نہیں جاؤ، سو جاؤ''

اب شمع زرد پڑ چکی تھی، زرد اور بالکل ساکن، صرف ایک پروانہ اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ میں غنودگی سے لبریز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پروانہ......شمع......رالی...... پروانہ......رالی......شمع......رالی......شاما......شمع......

باوا لچھمن گر کا ''استھان'' ندی کے کنارے شمشان بھومی کے قریب واقع ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا مندر ہے اور ایک مختصر سا باغیچہ اور اس کے ساتھ کپڑے دھونے کا گھاٹ، باوا جی اور ان کا چیلا سومناتھ وہیں دیوی کے قدموں میں آسن جماتے ہیں اور رات کو بھی وہیں پڑ کر سو رہتے ہیں۔ ندی میں ہر سال طغیانی آتی ہے مگر مندر ہمیشہ محفوظ و مامون رہتا ہے۔ پچھلے سال تو گھاٹ بھی نہ رہ گیا تھا۔ مگر مندر جوں کا توں کھڑا رہا۔ یہ سب باوا جی کی دعا کا اثر ہے اور انکے فوق الفطرت ہونے کا ثبوت۔ شاما کی ماں ودھوا باوا جی کو ہر روز پرنام کرنے جاتی ہے اور شاما بھی کبھی کبھار اس کے ساتھ جایا کرتی ہے۔ میں نے پہلے پہل اسے باوا جی کے باغیچے میں ہی دیکھا تھا۔ اس نے جوہی کے پھولوں کا ایک گچھا اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا اور دوپٹہ میں پھول چن چن کر رکھ رہی تھی آہ جوہی کے پھول۔

کتنی مدت ہوگئی اس اولین ملاقات کو، مگر آج پھر وہ پہلی نگاہیں اور جوہی کے پھول مجھے رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ ہم گھڑی کی سوئیوں کو الٹ پلٹ کر سکتے ہیں۔ مگر زمانے کی سوئی کو الٹا پھیر دینے کی کس میں ہمت ہے۔ کاش وہ پہلی نگاہیں مجھے واپس مل جائیں، کاش میں انہیں پھر اک بار دیکھ لیتا۔ وہ نگاہیں جنہوں نے میرے سینے میں امنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ جنہوں نے محبت کی سوئی ندی کو اپنے نازک پتواروں سے متلاطم کر دیا تھا۔ مگر آج وہ حقیقت محض ایک خواب ہے۔ شفق کی طرح رنگین قوس قزح کی طرح دور......

رالی میرے پاؤں داب رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔''رالی مندر سے جوہی کے پھول لاؤ گے؟''

رالی بولا۔''بابو جی بارش ہو رہی ہے'' پھر یہ کہہ کر خود ہی اٹھ کھڑا ہوا۔''اچھا جاتا ہوں'' رالی اسی موسلا دھار بارش میں اٹھ کر چلا گیا۔ اس نگاہ اولین کی یاد نے دل کی دبی ہوئی امنگوں میں ایک ہیجانی کیفیت سی پیدا کر دی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنی خیالی دنیا میں گم ہو گیا۔ اس دنیا کو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اس خیال سے مجھے ایک گونہ تسلی ہوتی ہے کہ دنیا میری ہے اور اس جسد خاکی کے آخری سانس، زندگی کے آخری لمحے اور دل کی آخری دھڑکن تک یہ دنیا میری ہو گی۔ شاید یہ دنیا ہی میرا سرمایہ حیات ہے۔ اس دنیا میں پہنچ کر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ایک ناؤ بن گیا ہوں۔ ایک ناؤ جو چاروں طرف لہروں میں گھری ہوئی ہے۔ لہریں کھیلتی ہیں، مسکراتی ہیں، ڈوبتے سورج کی ارغوانی کرنوں کو ہمک ہمک کر پیار کرتی ہیں۔ یکا یک میں اپنے بادبان پھیلا دیتا ہوں اور لہریں اپنے شانوں پر لیے ہوئے مجھے دور بہا لے جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کس طرف؟ نجانے کیوں؟ مجھے صرف اک خاموش موسیقی اور جانفزا سرور کا احساس ہوتا ہے۔ کیف آور اور شیریں۔

پتہ نہیں میں کتنا عرصہ اسی خیالی دنیا میں گم رہا یا کتنا عرصہ اور اسی خیالی دنیا میں گم رہتا۔ اماں میرا شانہ جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتیں۔''بیٹا اٹھو تو سہی وہ دیکھو رالی......

میں نے آہستہ سے کہا''کیا بات ہے۔ رالی پھول لے آیا؟''

''اچھا تو کیا تم نے اسے مندر بھیج دیا تھا؟'' اماں نے کہا۔''آہ بیچارہ رالی، اس کا بازو ٹوٹ گیا اور اس کے سر پر کئی چوٹیں آئیں ہیں، برآمدے میں پڑا ہے''۔

میں جلدی سے اٹھ کر برآمدے میں گیا۔ رالی آنکھیں بند کیے چارپائی پر پڑا آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ سر پر اور دائیں بازو پر پٹیاں بندھی تھیں۔ میں نے پوچھا''بیوقوف کیا مندر میں باوا جی لڑ پڑے؟ اگر وہ پھول نہ دیتے تھے تو واپس چلے آتے جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سومناتھ نے بھی پیٹا ہو گا تمہیں، جیسا گرو ویسا چیلا''۔

''وہ مندر کہاں رہا بیٹا، جو تین دن سے لگا تار بارش ہو رہی تھی اس کم بخت جھڑی کو کچھ لے کر ہی ٹلنا تھا۔ آج ندی میں اس قدر طغیانی ہے کہ توبہ ہی بھلی، ذرا شور تو سنو، اور جب رالی مندر کی طرف پھول لینے گیا تو مندر کے چاروں طرف پانی چڑھ رہا تھا اور گھاٹ بہہ رہا تھا۔

تو...... میں نے اسے یوں ہی بھیج دیا تھا اگرچہ پانی چڑھ رہا تھا تو نہ جاتا ایسی بھی......''میں نے فقرہ تمام چھوڑ دیا۔

کیسے نہ جاتا بیٹا، وہاں شاما......''

''کیا کہا، شاما؟''

اماں میری بات ان سنی کر کے بولیں،''اور دیکھو یہ باوا اور اس کا چیلا...... دونوں کتے کمینے نکلے، ان کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ

''مگر شاما کیا؟''میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

''کہہ تو رہی ہوں بیٹا''اماں جلدی سے بولیں۔''کہ شاما بھی وہاں گئی ہوئی تھی اور دیوی جی کو پرنام کر کے باغیچہ میں جوہی کے پھول چن رہی تھی کہ بارش نے آگھیرا، وہیں مندر میں ٹھہر گئی، سوچا ہوگا کہ بارش تھمے تو جاؤں۔ آن کی آن میں جل تھل ہو گیا، مندر کے چاروں طرف پانی لہریں مارنے لگا اور جب گھاٹ بھی بہنے لگا اور ندی کا رخ مندر کی طرف مڑا تو باوا جی بڑے گھبرائے، چیلے سمیت بھاگ کھڑے ہوئے''۔

''اور شاما کو وہیں چھوڑ دیا؟''میں نے جلدی سے پوچھا

کچھ نہ پوچھو، جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے، جب رالی وہاں پہنچا تو پانی نے مندر کو چاروں طرف اچھی طرح سے گھیر لیا تھا، شاما سیڑھیوں پر کھڑی چیخیں مار رہی تھی اور باوا جی اور ان کا چیلا تیرتے ہوئے خشکی کی طرف آ رہے تھے''۔

''کمینے''میں نے تیز لہجے میں کہا۔

اتنے میں کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا اماں اندر چلی گئیں، نائب تحصیلدار صاحب

تھے برآمدے میں آ کر رالی سرہانے بیٹھ گئے کہنے لگے۔ ''آپ کے نوکر نے آج بڑی جوانمردی دکھائی مندر کی گرتی ہوئی دیواروں اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کے ریلوں سے شاما کو بچا کر لے آیا۔ چوٹیں تو بہت لگی ہیں بیچارے کو'' میں نے ڈاکٹر سے وہیں پٹی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا آج شام کو ڈاکٹر پھر آئے گا......رالی بیٹا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے''۔

اتنا کہہ کر تحصیلدار صاحب چپ ہو گئے اور رالی کی طرف دیکھنے لگے رالی خاموش لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''کیوں روتے ہو رالی'' میں نے پوچھا۔

رالی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''بابو جی سر میں بہت درد ہے''۔

تحصیلدار صاحب چارپائی سے اٹھ کر بولے ''اچھا تو میں چلتا ہوں اور ڈاکٹر ابھی آپ کے ہاں بھیجتا ہوں، چوٹیں تو معمولی ہیں۔ میرے خیال میں ایک دو دن میں اچھا ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔ شاما کا خاوند سنا ہے کل یہاں پہنچے گا''۔

وہ چلے گئے، میں چپ چاپ رالی کے پاس بیٹھا رہا ''شاما کا خاوند کل یہاں پہنچے گا......کل فکر نہ کریں...... چوٹیں معمولی ہیں...... چوٹ......کاش تحصیلدار صاحب کو پتہ ہوتا کہ یہ چوٹیں معمولی نہیں ہوا کرتیں......

اماں رالی کیلئے گرم دودھ لے کر آئیں، میں چمچے سے اسے پلانے لگا۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اس واقعے کے پانچ روز بعد شاما اپنے خاوند کے ہمراہ چکوال چلی گئی۔ جانے سے قبل وہ مجھ سے ملنے کیلئے آئی۔

''میں جا رہی ہوں بھیا''۔

اس کا چہرہ زرد تھا اور لب انار کی طرح سرخ تھے۔

میں نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا اور چپ ہو رہا، ماں نے ہاتھ پھیلا کر اسے دعا دی ''پرمیشر تمہارا سہاگ ہمیشہ قائم رکھے''۔

رالی کدھر ہے بھیا، میں اسے ملے بغیر نہ جاؤں گی''۔

ماں نے جواب دیا۔''رالی پانی بھرنے گیا ہے۔اب آتا ہی ہوگا۔'' گھنٹہ پون گھنٹہ گزر گیا۔مگر رالی نہ آیا۔

میں نے نہایت نرم لہجے میں آہستہ سے کہا''شاید وہ نہ آئے گا شاما؟''

جیسے اس نے میری بات سمجھ لی ہو،فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔آہستہ سے بولی''تم اچھے ہو جاؤ گے بھیا''۔پھر اس نے سر جھکا کر ماں کو پرنام کیا۔

اور وہ چلی گئی۔چپ چاپ خاموش سر جھکائے ہوئے مجرم کی طرح۔

کائنات کا ہر ذرہ بے مصرف ہے اور انسان کی ہر کوشش بے سود، یہ انسان کتنا حقیر ہے اور یہ دنیا اس سے بھی حقیر تر، یہ عقدہ لانیحل ہے کیا اور کس لیے۔اور پھر اگر تمام زندگی کو یوں مٹھی میں بند کر کے چرمر کر دیا جائے۔اس طرح کہ اس کے ریزے ریزے ہو کر بکھر جائیں اور کوئی ان کی ہوا تک نہ پا سکے تو پھر......تو پھر کیا ہو......کس لیے؟......کیونکر؟

دل میں ہزاروں خیال تھے۔

بے سود، سب بے سود۔

بہت دیر کے بعد رالی آیا، پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے ہوئے،اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور ہونٹ نیلے، تھوڑی دیر ٹھہر کر جب وہ میرے پاؤں داہنے بیٹھا تو میں نے اس سے پوچھا رالی آج کہاں غائب رہا۔

''ہاں مجھے دیر ہوگئی بابو جی، مجھے معاف کر دو'' اس نے جواب میں کہا۔

کچھ دیر ہم خاموش رہے، پھر رالی بولا۔''اس دن آپ نے جوہی کے پھول مانگے تھے۔آپ یہ گچھا لے سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے جیب سے پھولوں کا ایک گچھا نکالا اور میرے ہاتھ میں رکھ دیا۔''باسی پھول اور پتیاں زرد،مگر ان میں خوشبو تھی۔

مجھے تحصیل دار صاحب کی بات یاد آ گئی، میں نے کہا۔''رالی، اسے تم رکھ لو، یہ لو اسے تمہیں اپنے پاس رکھو۔

''نہیں بابو جی اسے نہیں لے سکتا''

''کیوں؟''

رالی چپ ہو رہا۔

میں نے ایک پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ''رالی مجھے معلوم ہے تم جذباتی اور شاعر مزاج ہو''۔

رالی چپ بیٹھا رہا بے جان، بے حس و حرکت، مٹی کی مورت پھر سر جھکا کر آہستہ سے میرے پاؤں دابنے لگا، گرم آنسوؤں کے ایک دو قطرے میرے پاؤں پر گر پڑے۔

زندگی کس قدر عجیب ہے۔

شاما......ودھوا...... باواجی......رالی......سومناتھ......ریشم کے کیڑے......

زندگی کس قدر عجیب ہے۔

◆◆◆

پل

وہ ڈھلوان سڑک پر چہل قدمی کرتا ہوا خوش باش جوڑوں سے بہت آگے نکل گیا، راستے میں اسے ایک ادھیڑ عمر کی عورت ملی جو ایک نو جوان عورت کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ ہر شام چہل قدمی کرتے ہوئے اسے یہ دونوں عورتیں سڑک کے اسی حصہ پر مل جاتی تھیں۔ وہ اکثر پلکیں اٹھا کر لمبی نو جوان عورت کے تیکھے ابروؤں کے قریب اپنی نگاہیں جما دیتا۔ حتیٰ کہ معمر عورت کے گنجان ابروؤں پر بل آ جاتے اور لمبی عورت اپنا سر جھکا لیتی اور اس سے اس کے آراستہ بال، سیدھی مانگ اور لمبے اوور کوٹ کے سموری کالر کے قریب گندھا ہوا جوڑ نظر آ جاتا۔ جس پر کبھی کبھی بنفشے کے پھولوں کا گچھا ٹکا ہوتا۔ بنفشے کے پھول اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کی شرمیلی نگاہیں اور گلابی معصومیت ...... اور وہ اپنی استحسان آمیز نگاہوں میں ہمیشہ اس کے سلجھے ہوئے مذاق کی داد کو شامل کر دیتا۔ لیکن لمبی عورت مسکرا نہ سکتی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر وہ شفقی رنگ آتا جو بے باک نگاہوں کے لمس سے نو جوان عورتوں کے چہرے پر آ جایا کرتا ہے۔ وہ غازہ استعمال کرتی تھی اور اس کے ہونٹوں کی لطیف تراش پر ہمیشہ ایک قدرتی سرخی کی چمک دکھائی دیتی تھی، قریب سے بھی رنگ روغن کی ایک گڑیا نظر آتی تھی اور اس کے ساتھ کوئی مرد نہ ہوتا۔ بلکہ وہ ادھیڑ عمر کی عورت۔ وہ انہیں ہر شام سڑک کے اس حصہ پر چہل

قدمی کرتا ہوا دیکھتا تھا۔ اس کے قریب سے گرتے وقت وہ نہایت دلچسپ انداز سے اپنا سوال نوجوان عورت سے پوچھ لیتا۔ لیکن نوجوان عورت بجز اپنے سر کو جھکا لینے کے اس کی مستفسرانہ نگاہوں کا کوئی جواب نہ دے سکتی تھی......اور پھر اس معمر عورت کے گنجان ابروؤں کے ٹیڑھے بل، وہ جلد جلد ان کے قریب سے گزر گیا۔ آج غازہ مدھم تھا اور سرخی تیز اور داہنے رخسار پر ایک مدھم سی لکیر دکھائی دیتی تھی۔ یہ پتلی کمر کی لچک زیادہ گہری تھی اور ٹانگیں گھوم گھوم کر چلتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے سوچا، شاید وہ بیمار ہے، کوئی خطرناک جنسی بیماری اور پھر اس کے ساتھ کوئی مرد بھی۔ خوش باش جوڑے ہنستے ہوئے پیچھے رہ گئے تھے۔ سڑک کا یہ حصہ ہمیشہ سنسان ہوتا تھا۔ ریاڑ کے درخت سبز چھتناروں کو لیے کہیں کہیں اکیلے کھڑے تھے۔ سڑک کے کنارے ایک طرف لال جھنڈی لگی ہوئی تھی، وہ سڑک کا یہ حصہ نیا نیا بنا تھا۔ لال جھنڈی خطرے کا اشارہ، کوئی خطرناک جنسی بیماری اور اب اس کے دل میں تمام جزئیات ایک جگہ نقش ہوگئیں۔ اس نے دل میں کہا۔ ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کی افسردگی معمر عورت کے ٹیڑھے ابرو، سر کو جھکا لینے کا انداز مجبوری اور ٹانگوں کا گھوم گھوم کر چلنا، وہ یقیناً بیمار ہے۔ لیکن بنفشے کے پھول، شریف خاندان کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ شریف اور امیر اور پھر اس نے سوچا کہ یہی دو چیزیں تو بدمعاشی کی اساس ہیں۔ ایک بھورے رنگ کا ٹٹو دلکی چال چلتا ہوا اس کے قریب سے گزر گیا۔ سوار ایک یورپین مرد تھا۔ خاکی قمیض میں اس کے گلے کا سرخ پھلبہری کا بڑا داغ معلوم ہو رہا تھا۔ یہ لوگ بہت زیادہ کھاتے ہیں اور پیتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ، آج تو خود اس کے پاس صرف ایک روپیہ تھا اور اس کا منی آرڈر جس کی وہ ہر روز توقع کرتا تھا۔ ابھی تک نہ آتا تھا۔ یکایک اس کے دل میں تمام دنیا کے غریبوں کیلئے جذبہ ترحم پیدا ہوگیا اور اسے سرخ رنگ کا پھلبہری کا داغ اور معمر عورت کے ٹیڑے ابروؤں سے سخت نفرت پیدا ہوگئی، کمینے...... کتے......ڈاکو......شخصی جائیداد......وہ ٹٹو ''بھورے رنگ کا ٹٹو'' کسی غریب' ہاتو'' کا تھا لیکن وہ یورپین اسے اس طرح دلکی پر چلا رہا تھا اور اس کی کمر میں اس طرح ٹھوکے دیئے جا رہا تھا، گویا وہ اس کا اپنا زرخرید ٹٹو تھا اور ادھیڑ عمر کی عورت لمبی عورت کو لیے اس طرح چل رہی تھی، گویا وہ

اس کی شخصی جائیداد ہو۔

سورج کے بعد اب شفق بھی بھاگی جا رہی تھی۔ سڑک کے اگلے موڑ پر اسے لدر کا تیز بہاؤ نظر آیا، پانی کا سفید جھاگ شفق کے رنگ میں مل کر بنفشی ہو گیا تھا اور پانی شور مچاتا ہوا ایک لکڑی کے پل کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ پل نیا نیا تھا۔ اسے پل سونے کا بنا ہوا معلوم ہونے لگا اور سڑک کے قریب ایک ڈھلوان سے گزر کر پل پر چلا گیا۔ پل کے قریب ایک بوڑھا کشمیری جس کا سر گنجا تھا اور کنپٹیوں پر سفید بال ایک میلی ٹوکری میں بٹنگ کے پھل رکھے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے دیکھتے ہیں سلام کیا۔ بٹنگ پیلے اور موٹے تھے، اور زرد زرد چھلکوں کے اندر میٹھا رس جھانک رہا تھا۔ اس نے ایک آنہ کے بٹنگ لے لئے اور ایک بٹنگ منہ میں ڈال کر اور باقی جیب میں رکھ کر وہ پل کے جنگلے کی طرف کھڑا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ پانی تیزی سے پل کے نیچے سے گزر رہا تھا اور بلویا ہوا جھاگ سفید اور بنفشی رنگوں کے درمیان کانپتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ چند لمحوں کیلئے نیچے سے گزرتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا اور پھر یکا یک اسے پل اوپر کی طرف اٹھتا ہوا معلوم ہوا، پل ہوا میں پانی کے اوپر اڑ رہا تھا، نہایت تیز اور وہ اس لکڑی کے اڑن کھٹولے میں بیٹھا ہوا اس انوکھی اڑان کے مزے لینے لگا۔ بٹنگ میٹھے تھے، اور پل کی اڑان بہت دلفریب، پل کے قریب بیٹھا ہوا ''بوڑھا ہاتو'' اس حقیر کیڑے کی طرح دکھائی دیا۔ وہ غالباً صبح سے اسی پل کے کنارے بیٹھا تھا اور اس نے ابھی تک اس ہوائی سیر کا لطف نہ اٹھایا تھا۔ بیچارا غریب، انجان ہاتو......انجان ہاتو اتنا غریب نہ تھا۔ اس نے آج ایک آنہ حاصل کر لیا تھا......آج اسے ابھی ایک آنہ حاصل ہوا تھا اور وہ صبح سے لے کر اب تک اسی پل کے کنارے بٹنگ بیچنے کیلئے بیٹھا تھا۔ یہ جان کر اسے ہاتو کے صبر پر بہت حیرت ہوئی، صرف ایک آنہ، لیکن اب اس کی جیب میں بھی تو صرف پندرہ آنے تھے اور شاید کل اس کا منی آرڈر آ جائے، اسے یہ ہوائی سیر بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ وہ ایک اڑتے ہوئے پل پر بیٹھا تھا جو لدر کے پانیوں پر اڑا جا رہا تھا اور اسے جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ کوئی بھی تو اس کی طرف حیران نگاہوں نہیں دیکھ رہا تھا۔ چند لڑکے ٹٹوؤں پر سوار چابک لگاتے ہوئے آئے اور سڑک سے گزر

گئے اور انہوں نے اس معجزہ کو نہ دیکھا۔ بے وقوف لڑکے، بس یہاں پہلگام میں ٹٹوؤں کے مالک تیز تیز قدموں سے بھاگے جا رہے تھے۔ٹٹو کی سواری دو آنے فی گھنٹہ،ٹٹو بھی دوڑاؤ اور ہاتو کو بھی،ٹٹو کو بھی ٹٹو کے مالک کو بھی...... پسینہ میں شرابور گنجے ہاتو تیزی سے بھاگے جا رہے تھے۔ دو آنے فی گھنٹہ،اس نے سوچا انسان اور ٹٹو میں کیا فرق ہے؟ اور اگر کوئی فرق ہے تو ہم نے اسے کیوں سمجھا......اور سمجھا ہے تو اس پر کب عمل ہوگا؟......اور اس کے دل میں بیٹھے ایک چور نے کہا۔''کیا بک رہے ہو، بٹنگ کھاؤ، پیلے اور میٹھے بٹنگ، اور اس سنہری پل کی سواری کرو''۔کتنی نفیس بات ہے۔اس نے سوچا اور جیب سے ایک بٹنگ نکال کر کھانے لگا۔معاً اسے پل کے دوسرے طرف ایک معمر آدمی چلتا ہوا نظر آیا۔کیا اسے بھی اس دلفریب اڑان کا لطف آ رہا تھا۔غالباً نہیں، کیونکہ اس معمر آدمی کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک محدب شیشہ تھا اور اس کے منہ پر ڈاڑھی تھی۔ وہ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے بوڑھے آدمی سے پوچھا۔''کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟''

بوڑھے آدمی نے کہا۔''پروفیسر ردرفورڈ میں برٹش رائل سوسائٹی آف سائنس کا پریذیڈنٹ ہوں''۔

اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''بہت خوب! مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی'' اور پھر اس نے اپنی جیب سے ایک پیلا بٹنگ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا۔ ''کھایئے''

پروفیسر ردرفورڈ نے بٹنگ کو محدب شیشے کے اندر جھانکا اور پھر واپس کر دیا۔اس نے کہا۔''میں بٹنگ نہیں کھاؤں گا۔ میں برٹش رائل سوسائٹی آف سائنس کا صدر......''

''بہت خوب......خوب......ہوں......اچھا تو...... کہیے آپ کو اس ہوائی سیر کا بھی لطف آ رہا ہے یا نہیں، اس سنہری پل کو دیکھیے کس تیزی سے پانی کے اوپر اڑا جا رہا ہے۔ایک بحری طیارے کی......''

بوڑھے پروفیسر نے ایک بوڑھی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ

اپنے محدب شیشے کے اندر سے پانی کے تیز بہاؤ کا جائزہ لینے لگا۔

پروفیسر نے محدب شیشے کے اندر سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل انجان ہو، پل اڑ انہیں جا رہا بلکہ وہیں کھڑا ہے، یہ صرف پانی کا تیز بہاؤ ہے، جو پل کے نیچے سے گزر رہا ہے۔ اسے ہم سائنسدان ''نظر کا دھوکا'' کہتے ہیں، نظر کے دھوکے اور نظری مرکز میں جو تعلق ہے، یہ ایک مادی چیز ہے اور......''

''جھوٹ''، معاً قریب سے ایک آواز آئی ''بالکل سفید جھوٹ''

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لمبا خوبصورت آدمی اس کے قریب کھڑا تھا، وہ ایک خوبصورت گیروے رنگ کی دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اس کا سینہ فراخ تھا اور ننگا۔ اس کے سر پر بالوں کی سنہری جٹا تھی اور اس کی غلافی آنکھوں میں سے ایک عجیب سا نور چھن رہا تھا۔

اس نے پوچھا ''کیا سفید جھوٹ ہے؟''

لمبے خوبصورت آدمی نے جواب دیا۔ ''یہ جو کچھ بھی پروفیسر ردرفورڈ کہہ رہے ہیں۔ بالکل سفید جھوٹ ہے۔ یہ پیلے بٹنگ، یہ غریب ہاتھ تو...... یہ تیز پانی کا بہاؤ...... یہ سنہری پل...... یہ دنیا، ایک سفید جھوٹ ہے''۔

وہ بٹنگ کھاتے کھاتے بولا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں کہ اس دنیا پر سفید آدمیوں کی حکومت ہے اور اس اعتبار سے یہ ممکن کہ یہ دنیا بھی ایک ''سفید'' جھوٹ ہو۔ لیکن......''

پروفیسر ردرفورڈ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''تم اس جگہ پر بات نہیں کر سکتے، میں برٹش رائل سوسائٹی کا صدر رہوں اور یہ میرا فرض ہے کہ......''

اس نے قطع کلام کرتے ہوئے دراز قد خوبصورت آدمی سے پوچھا۔ ''لیکن تم ہو کون؟''

دراز قد آدمی نے اپنی نورانی آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں اور جواب دیا۔

''میں گوتم ہوں...... گوتم بدھ...... ہندوستان کا سب سے بڑا آدمی''۔

اس نے جواب دیا۔ ''بہت خوب! میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں...... لیجئے

یہ بٹنگ کھائیے، خوب پیلے ہیں اور میٹھے۔ وہ پل کے کنارے پر جو غریب ہاتو بیٹھے ہیں، اس سے خریدے ہیں''۔

''نہیں، نہیں'' گوتم نے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''میں بٹنگ نہیں کھاتا...... یہ بٹنگ سب مایا ہے......اور میں نے مایا کو ہمیشہ کیلئے تیاگ دیا ہے اور اگر تم نروان چاہتے ہو تو......''

اس نے دراز قد آدمی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اوہ کتنی بھول ہوئی'' اور پھر اسے یک لخت یاد آیا کہ رات کا سماں ہے اور وہ دراز قد خوبصورت آدمی شاہی محل کی ایک خواب گاہ میں اپنی سوئی ہوئی حسین بیوی اور ننھے معصوم بچے کو الوداع کہہ رہا ہے۔ اس نے آہستہ سے گوتم بدھ سے پوچھا۔ ''تمہاری بیوی کہاں ہے؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں پہلگام میں کیا خاک سیر کرنے کو آئے ہو، دیکھو دور سڑک پر خوش باش جوڑے ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے چہل قدمی کرتے ہوئے جارہے ہیں، ادھیڑ عمر جوڑے، نوجوان جوڑے، بوڑھے جوڑے...... یہاں صرف وہی شخص اپنی بیوی نہیں لاتے جن کی اپنی کوئی بیوی نہیں ہوتی یا جن کی بیویاں بیمار ہوتی ہیں...... بیمار......کوئی خطرناک جنسی بیماری......'' یکا یک ایک افسردہ چہرہ دیکھا۔ لبوں پر غیر قدرتی سرخی، جوڑے میں بنفشے کے پھول گندھے ہوئے اور ایک پتلی کمر جو ایک محور کے گرد گھومتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، محور...... دائرے...... گولائیاں...... زاویے...... نقطے...... عمود...... یوکلڈ نے کہا۔ حسن جیومیٹری ہے......

گوتم اس کا شانہ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا ''میں نے یشودھا کو اس لیے تیاگ دیا کہ عورت کا پیار بھی مایا ہے، یہ سب مایا ہے اور مایا کے دائرے میں یشودھا محض ایک نقطہ تھی''۔

پروفیسر ردرفورڈ نے بے صبری سے کہا۔ ''تم ایک نقطے کو کیا سمجھتے ہو......نظری احساس سے شاید تم نقطے کو حقیر سمجھتے ہو۔ لیکن سائنس کے نقطہ نگاہ سے نقطہ ایک لامتناہی دنیا ہے۔ اچھا، میں......تم یوں نہیں سمجھ سکو گے...... میں تمہیں اس محدث شیشے سے ایک تجربہ کر کے سمجھاتا ہوں کہ جب ایک نقطے پر سورج کی کرنیں جمع ہو جاتی ہیں تو کس طرح وہ نقطہ آگ کی

دنیا بن جاتا ہے''۔

گوتم نے دل جمعی سے جواب دیا۔''جھوٹ بالکل جھوٹ، نروان کا راستہ الگ ہے اور اگر تم......

معاً پل کے کنارے بیٹھا ہوا بوڑھا ہاتو چلانے لگا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو بوڑھے ہاتو کے قریب دو آدمی، میونسپل کمیٹی کے ملازم، اس کے قریب اسے بلند آواز میں جھڑک رہے تھے۔

ایک نے کہا۔''تمہارا لائسنس کہاں ہے؟'' اور تم یہاں بغیر لائسنس حاصل کیے میونسپل کمیٹی کی حدود کے اندر کیوں بٹنگ بیچ رہے ہو؟'' دوسرے نے بوڑھے ہاتو کے ایک زور کی ٹھوکر لگائی۔ حرامزادے، گنجے......بغیر لائسنس کے پھل بیچتا پھرتا ہے......کیا یہ تیرے باپ کا ملک ہے''۔

بوڑھے ہاتو نے چلا کر کہا۔''میرے اللہ! مجھے معاف کر دو، بابا...... مجھے معلوم نہ تھا...... میں غریب آدمی ہوں...... میں اب پھر کبھی ایسا کام نہ کروں گا، میں کبھی پل کے کنارے دوبارہ نہ بیٹھوں گا......خدا کیلئے مجھے معاف کر دو''۔

پہلے آدمی نے اسے ٹھوکر لگائی۔''حرامی، کتے، سور کے بچے، اٹھ، اب کیا دیکھتا ہے؟ اٹھا ٹوکرا اور چل انسپکٹر صاحب کے پاس''۔ لیکن دوسرے آدمی کو بہت غصہ آرہا تھا۔ اس نے ٹوکرے کو اوندھا کر دیا اور سب بٹنگ دریا کے تیز بہاؤ میں گرتے گئے۔

''وہ دیکھو، وہ دیکھو'' اس نے پروفیسر ردرفورڈ اور گوتم کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''دیکھو، اس بوڑھے غریب ہاتو پر ظلم ہو رہا ہے، میرے خدا...... یہاں اس دنیا میں رہنے کے لئے بھی غریب آدمی کو لائسنس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے......لیکن تم کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ آؤ، اس بوڑھے ہاتو کو بچائیں......آؤ......آؤ......''

لیکن یکا یک اس نے محسوس کیا کہ وہ لکڑی کے جامد پل پر اکیلا کھڑا ہے، شفق کی سرخی غائب ہو چکی تھی اور دو آدمی بوڑھے ہاتو کو پکڑے ہوئے لیے جا رہے تھے۔

◆◆◆

آخری بس

آخری بس ورسوا کے لئے تیار تھی۔ گیارہ بج چکے تھے اس کے بعد کوئی بس نہیں جائے گی۔ گیارہ بجے رات کے بعد جسے ورسوا جانا ہو پیدل جائے یا دو روپے کی گھوڑا گاڑی میں بیٹھے یا تین روپے کی ٹیکسی لے۔ ورسوا اسٹیشن کے بس اسٹینڈ سے تین میل دور ہے۔ راستہ سنسان اور ویران نشیبوں میں سے گزرتا ہے۔ سڑک کے دورویہ بڑے بڑے ڈراؤنے جھاڑ ہیں جو چوری چکاری اور قتل وخون کیلئے بڑی عمدہ پناہ گاہوں کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ اکا دکا مسافر اکثر لوٹے جاتے ہیں اور خودکشی یا قتل کیلئے بمبئی کے لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں جن کا اخباروں میں اکثر چرچا ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے بس اسٹینڈ پر جو ٹیکسی ڈرائیور ہیں یا گھوڑا گاڑی والے ہیں وہ اکثر سندھ کے مکرانی یا سرحد کے نڈر پٹھان ہیں اور ہر وقت اپنے پاس ایک خنجر رکھتے ہیں۔ رات کو اکثر پیے ہوئے ملتے ہیں اس پر بھی یہ لوگ کبھی اکیلے دکیلے سفر نہیں کرتے، بدمعاشوں اور موالیوں کا کیا بھروسہ بھئی......!

اس لیے میں گاڑی کے پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی بھاگا اور جلدی سے آ کے بس میں بیٹھ گیا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی...... یہ سواری کی بس نہ تھی، سامان کی بس تھی۔ دوسری بسوں میں مسافر سامان نہیں لے جا سکتے۔ لیکن سامان والی بس میں سامان رکھنے کی اجازت ہے دوسری بسوں میں پچیس آدمی سوار ہوتے ہیں اس میں صرف اٹھائیس۔

پھر اس میں اٹھائیس سے زیادہ آدمی ہوں گے۔ میں نے دل ہی دل میں آدمیوں کو گننا شروع کیا۔ بتیس آدمی تھے...... کیا بس کنڈکٹر بتیس آدمیوں کو لے جائے گا۔ آخری بس ہے اکثر بس کنڈ یکٹر بڑے رحم دل ہوتے ہیں خصوصاً آخری بس کے موقع پر زیادہ قانون دانی نہیں بگھارتے۔ چار پانچ آدمی اگر مقررہ تعداد سے زیادہ بھی ہوں تو بٹھا کر لے جاتے ہیں۔ پھر بھی ممکن ہے جھگڑا ہو اسی لیے میں خوب اچھی طرح جم کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اطمینان سے کھڑکی کے باہر دیکھ کر سیٹی بجانے لگا، جیسے بس میں سب سے پہلے میں ہی سوار ہوا تھا۔

بس کنڈ یکٹر نے اندر کے مسافروں کو گنا، کہنے لگا۔

''چار آدمی زیادہ ہیں۔اتر جائیں......''

بہت سے آدمی بول اٹھے۔

''جانے دو نا، بس کنڈ یکٹر صاحب...... آخری بس ہے بے چارے پیدل کیسے جائیں گے......بس کنڈ یکٹر صاحب۔

بس کنڈ یکٹر نے مسکرا کر گھنٹی بجائی، ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پہلے بس کے اندر کی بتیاں گل کیں۔ پھر انجن سٹارٹ کرنے لگا۔تھوڑی دیر تک انجن کے کھانسنے کی آواز آئی اس کے بعد وہ بھی بند ہو گئی۔

ڈرائیور نے سوئچ دبا کر اندر کی بتیاں روشن کر دیں اور پھر اپنی سیٹ سے اتر کر انجن دیکھنے لگا۔مسافروں کے چہروں پر ناامیدی دوڑ گئی۔بس کنڈ یکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''ابھی پانچ منٹ میں سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

یہ کہہ کر وہ بھی اتر کر ڈرائیور کے پاس چلا گیا۔

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

میری طرح اور بہت سے مسافر بھی گیارہ بجے والی بس پکڑتے ہیں۔اس لیے اکثر جانے پہچانے چہرے لگے، ان میں ڈاکٹر کامتا پرشاد کا چہرہ تھا، گول مٹول چہرے پر ایک کمزور سی ٹھوڑی، ایک ڈھیلے سوئچ کی طرح لٹک رہی تھی چہرہ مایوس اور تھکا تھکا سا تھا۔

میں نے سوچا......اس سوئچ کو اوپر کرنے کے بعد بھی کیا اس چہرے پر کسی طرح کی برقی روشنی نہیں دوڑ سکتی......اندر سے میں نے یوں سوچا اوپر سے ڈاکٹر سے یوں کہا۔

''ڈاکٹر صاحب بڑی دیر سے آ رہے ہیں آپ''

کامتا پرشاد میری طرف دیکھ کر مسکرایا، بولا۔

''کیا کروں آج کل کامپی ٹیشن بہت ہو رہا ہے، کاروبار مندہ ہے اور دکان پر دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔

کامتا پرشاد کی دندان سازی کی دوکان فارس روڈ اور چینی گلی کی نکڑ پر تھی، چینی گلی میں چاؤین دندان ساز کی بھی تھی۔ بڈھا چینی تیس سال سے وہاں جما ہوا تھا۔ اس کی دو بیٹیاں فارس روڈ پر پیشہ کرتی تھیں اور وہ خود دانت بناتا تھا۔ اس لیے بار بار ریٹ کم کرنے کے باوجود بھی کامتا پرشاد آمدنی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنی لڑکیوں سے پیشہ کیسے کرا سکتا ہوں......؟ ڈاکٹر پرشاد نے شکایتاً مجھ سے کہا۔ اس لیے مجھے دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلے میں بھی چاؤین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ تو اپنی دوکان ہی میں سوتا ہے۔ اب میں رات بھر اپنی دوکان کیسے کھول سکتا ہوں...... گیارہ بجے تک دکان کھولنے کا حکم ہے کھولے رکھتا ہوں اس کے بعد مجھے یہ بس بھی پکڑنا ہوتی ہے......اتنی دور رہتا ہوں......''

میں چپ رہا۔

ڈاکٹر نے ایک آہ بھر کر کہا۔

''یہ دنیا کو کیا ہو رہا ہے؟''

کامتا پرشاد کی ٹھوڑی کا سوئچ اور بھی نیچے لٹک گیا۔ اور میرا جی چاہا کہ اس سوئچ کو اوپر نیچے ہلا کر دیکھوں کہ کہیں پر زندگی کا کنکشن بھی ہوتا ہے کہ نہیں مگر پھر یہ سوچ کر رہ گیا۔ آخری بس ہے مجھے بہت دور جانا ہے آخری بس اسٹینڈ سے آگے پندرہ منٹ تک پیدل چلنا ہے اور میں کوئی الیکٹرک کمپنی یا مکینک تو ہوں نہیں کہ ڈھیلے ڈھالے سوئچوں کو دبا دبا کر ٹھیک

کرتا رہوں جہنم میں جائے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھ کر بڑے مایوس لہجے میں کہا..... ''اب دن بھر بیٹھے رہو، تو بھی گاہک نہیں آتا۔ ہاں رات کو جب فارس روڈ کی گلیوں میں بحری ملاحوں کے ٹولے آنے لگتے ہیں تو اکثر لڑائی دنگا ہو جاتا ہے کسی کا دانت بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ بس سمجھئے کہ عین موقع پر لوگ دانت نکلوانے یا بنوانے آ جاتے ہیں۔ بس دکان کیا ہے فرسٹ ایڈ کا اڈہ ہے اب تو میں نے فارس روڈ کے ایک موالی کو کمیشن دے کر راضی کر لیا ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دانتوں کے سارے کیس مجھے بھجوا دیا کرے اس پر بھی گزارا نہیں ہوتا۔

کامتا پرشاد کی بات تین دکانداروں نے بھی سنی جو اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے دو سندھی تھے اور ایک پنجابی تھا۔ بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ تینوں کی دکانیں ایک دوسرے کے آس پاس واقع تھیں، تینوں رو رہے تھے، کاروبار کو کیا ہو گیا ہے صبح سے بوہنی ہی نہیں ہوئی، شام کو دو دو روپے کمائی، بس دو دو روپے۔

وہ تینوں مکھن لعل مٹھائی والے کی دوکان کے شاکی تھے۔ گاہک کو ادھر آنے ہی نہیں دیتا۔ کمبخت وہیں نکڑ پر سنبھال لیتا ہے، ہم منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

جب اس کی اچھی مٹھائی ساری بک جاتی ہے تو گاہک کہیں ہماری طرف آتا ہے۔ جی چاہتا ہے سالے کی دوکان کو آگ لگا دوں...... آج صبح سے کل بارہ آنے کمائے ہیں۔ اب اس میں گھر کیسے چلے گا؟

اس کے بعد لوگ بٹوارے کی باتیں کرنے لگے۔ گھر جو وہ کراچی میں چھوڑ آئے تھے، کھانا جو لاہور میں تھا...... کیا ہوئے وہ دودھ، وہ گھی...... وہ آب و ہوا۔ ہماری گورنمنٹ ریفیوجیوں کیلئے کچھ نہیں کرتی۔ مگر پاکستان والے بھائی کچھ بھی کہو۔ ان مسلمانوں میں بڑا ایکا ہے۔

وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے نظر دوڑائی...... کھڑکی سے ٹیک لگائے بیکل ایم، اے ایڈیٹر فلم روز تھا اس کا سوکھا بھوکا پتلا چرخ چہرہ بھنگ کے نشے میں سب کو گھورتا ہوا

معلوم ہوتا تھا۔ یکا یک اس نے فلم روز کی فائل پر ہاتھ مار کر کہا۔

''ہر روز دیر ہو جاتی ہے۔ ہر روز اسی طرح دیر ہو جاتی ہے۔ آٹھ دس گھنٹے فلم روز کے دفتر کام کرو...... جین صاحب کی جھڑکیاں سنو...... پھر ڈیڑھ گھنٹے بوری بندر کے لمبے کیو میں بس کا انتظار کرو یہاں پہنچو تو بس خراب ہو جاتی ہے یہ کیا انتظام ہے، کیا سلیقہ ہے...... کیا سوراج ہے، بسٹ کمپنی کو تالا لگا دینا چاہیے''۔

بسٹ کمپنی کا ایک ورکر بھی بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ رومال میں آم باندھے گھر لے جا رہا تھا وہ غصہ میں تاؤ کھا کے بولا۔

''کیا بکتے ہو؟''

بیکل ایم، اے نے فلم روز کی فائل پر ہاتھ مار کر کہا۔

''تالا لگا دو...... میں کہتا ہوں بسٹ کمپنی کو تالا لگا دو......''

''کیوں تالا لگا دو......'' ورکر بولا۔

''اس لیے کہ انجن کبھی کبھار خراب ہو جاتا ہے اس میں کمپنی کا کیا قصور ہے؟''

''کمپنی کا قصور نہیں تو پھر تمہارا قصور ہوگا...... جب سے تم ورکروں نے یونین بنائی تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے میں اچھا طرح جانتا ہوں'' بیکل ایم، اے بولا۔

''کیا سمجھتے ہو......''

ورکر غصے میں بولا۔

''تم لوگ ہڑتال کرتے ہو...... ڈبل بھتہ مانگتے ہو...... مہنگائی الاؤنس مانگتے ہو۔ کہاں سے وہ روپیہ آتا ہے؟ ہماری جیبوں میں سے جاتا ہے، غریب پبلک کی جیب سے جاتا ہے۔ تم مزدور لوگ مزے کرتے ہو، مڈل کلاس بھوکی مر جاتی ہے''۔ بیکل ایم، اے بڑے مزے سے بھنگ کی ترنگ میں کہہ رہا تھا۔

بہت سے سفید پوش بابو لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ان میں کچھ چہرے میں بھی پہچانتا تھا۔ سیٹھ حاجی داؤد ٹھیکیدار تھے جنہیں جوہو پر بلڈنگ بنانے کا ٹھیکہ ملا تھا۔ ان

میں جے جے شاہ نو بھارت کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ پکچر دیکھنے کے بعد واپس جا رہا تھا۔ ان میں ملیالی کرسچین جان تھا جو بی اے پاس کرنے کے بعد بے کار تھا اور نوکری کی تلاش میں گھومتا رہتا تھا۔ اس کی سیاہ مونچھوں کے نیچے سفید دانت اکثر چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ اس لیے اکثر اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کب غصے میں ہے اور کب مسکرا رہا ہے۔

''ہاں دیکھونا...... ہم بی اے پاس ہوئے ہم کو نوکری نہیں ملتا دو سال سے نہیں ملتا ہے۔ یہ چار جماعت پڑھ کر سالا مجے کرتا ہے اور سوشلزم سوشلزم پکارتا ہے۔ ہماری طرح بھوکا رہے تو سالے کا سب سوشلزم نکل جائے ایک دم......''

بس کمپنی کے ورکر نے آستینیں چڑھا لیں لیکن اس کے قریب ریلوے کمپنی کا ایک مزدور بیٹھا ہوا تھا اس کی نیلی کچیلی تیل کے چکتوں سے داغدار وردی کوئلے کے غبار سے اٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی کوئلے کی کالونچ تھی جس کے اندر سے اس کی گہری آنکھوں کی روشنی ایک خوفناک سرخی کی طرح چمک جاتی تھی۔

لوگ اس کے کوئلے کے غبارے بھرے ہوئے کپڑے دیکھ کر اس سے ذرا دور دور بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ریلوے کمپنی کے مزدور نے بس کمپنی کے ورکر کو بازو سے پکڑ کر کہا۔

''کیوں بے کار میں جھغرا کرتے ہو ان لوگوں کو ہماری حالت کیا معلوم، جانے دو ابھی تھوڑی دیر میں بس چلے گی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلے گی پھر اس بابو کا دماغ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

''تم کیا سمجھتے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو میرا دماغ خراب ہے......''

ملیالی جان غصہ سے بولا اس کے دانت ہونٹوں سے باہر نکل آئے ایسا معلوم ہوتا تھا ابھی قہقہہ مار کر ہنسنے لگے گا۔ ریلوے کمپنی کے مزدور کو ہنسی آ گئی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

جے جے شاہ نے اپنی بیوی سے کہا۔

''بیٹی ڈیوس کی اداکاری تمہیں پسند آئی''۔

بیوی نے شاہ کی آنکھیں میں آنکھیں ڈالدیں اور ہولے سے مسکرائی جیسے بیٹی ڈیوس کی اداکاری کو شراب کے گھونٹ کی طرح پی رہی ہو۔

جے جے شاہ نے اپنی بیوی کے بازو میں چٹکی لے کے گجراتی میں کہا۔

تمہاری آنکھیں بھی تو بس بیٹھی ڈیوس کی طرح ہیں''۔

بیوی نے بڑی ادا سے اپنی آنکھیں مٹکائیں اور گجراتی میں اپنے خاوند سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب غالباً یہ تھا۔

''ہٹو پگلے......''

اس کے بعد مسافر ایک دم بس کمپنی کی شکایت کرنے لگے۔

''یہ کیا مذاق ہے...... کیا ہم لوگ رات کے بارہ بجے گھر پہنچیں گے۔ کمپنی کو فوراً دوسری بس کا انتظام کرنا چاہیے بلکہ ایک فالتو بس ہمیشہ اڈے پر کھڑی رکھنی چاہیے۔ سالے جنگلی لوگ ہیں۔ ان کو کچھ پتہ ہی نہیں......''

ایک مارواڑی بزنس مین سوئٹزرلینڈ کی بسوں کا ذکر کرنے لگا۔ جب میں سوئٹزرلینڈ میں تھا......لیکن اس کی آواز لوگوں کے شور وغل میں ڈوب گئی اور جب کنڈیکٹر شور سن کر اندر داخل ہوا تو سب آوازیں ایک بھوکے کتے کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں...... ہر ایک چہرہ وحشی اور خشونت آمیز نظر آرہا تھا، دن کی تھکن اور گھٹن، مایوسی محنت کی سوگواری اور بے مقصد انتظار کا اضمحلال اور غصہ اور جھنجھلاہٹ سے ہر چہرے پر رگیں اور شریانیں یوں ابھر آئیں تھیں جیسے سر بازار کوئی حادثہ ہو جائے اور بجلی کے بہت سے تار ایک دوسرے میں الجھ کر گر پڑیں۔

ہر شخص اپنی ناکامی کے بخار میں تپ رہا تھا۔ اور جھنجھلا کر اپنا غصہ کنڈیکٹر پر اتار رہا تھا۔

کنڈیکٹر بھی آٹھ گھنٹے کی مسلسل کھڑے رہنے والی ڈیوٹی سے اکتایا ہوا تھا۔ آوازیں سنتے ہی برس پڑا۔

''تو میں نے کیا جان بوجھ کر روکی ہے۔ کیا میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتا ہوں۔ کیا

میرے بچے نہیں ہیں۔ کیا مجھے بھوک نہیں لگی ہے۔ تم لوگ تو ابھی ابھی اپنے گھروں کو پہنچ جاؤ گے۔ مجھے ورسوا سے واپس کولابہ جانا ہوگا۔ یہاں سے بیس میل دور......اس کا بھی خیال کیا ہے سب اپنی اپنی ہانک رہے''۔

''ہانک رہے ہیں......''

جے جے شاہ کو اس دو ٹکے کے بس کنڈیکٹر پر بہت غصہ آیا۔ بس میں کھڑا ہو کر چلانے لگا۔

''ہم ہانک کرہے......اور تم فرمارہے ہو......ابھی اپنے الفاظ واپس لو۔ ورنہ اخبار میں خبر لوں گا......تم جانتے نہیں ہو میں کون ہوں؟''

''کون ہو......؟''

بس کنڈیکٹر نے غصے سے پوچھا۔

''بمبئی کے گورنر ہو......''

''جے جے شاہ ہوں......نو بھارت کا ایڈیٹر...... پبلک کا نمائندہ ہوں، تم نے ہماری بے عزتی کی ہے۔ ہمیں کیا گدھا سمجھا ہے الو......''

''شٹ اپ......''

کنڈیکٹر نے آگے بڑھ کر کہا۔

''شٹ اپ......''

جے جے شاہ نے غصہ میں تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

ریلوے کا مزدور دونوں کے بیچ آگیا اتنے میں گیارہ دس کی گاڑی آگئی۔

اور جب ان لوگوں نے دیکھا کہ آخری بس ابھی تک اڈے پر کھڑی ہے تو وہ لوگ بھی بس کی طرف بھاگے۔

'''آجاؤ......آجاؤ......''

جنارکروالے نے اپنے ٹوکرے کو سیٹ کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔

بس کنڈیکٹر نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی مگر لوگ اندر آتے چلے گئے۔ اب بس کے لوگ کنڈیکٹر سے بہت خفا تھے اس لیے کسی نہ کسی طرح وہ سکڑ کر آنے والے لوگوں کو اندر جگہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں جہاں بتیس آدمی تھے وہاں اب بیالیس آدمی بھرے ہوئے تھے۔

بس کنڈیکٹر نے گاڑی سے اتر کر کہا۔

''اب تو اٹھائیس سے اوپر ایک آدمی بھی نہیں لے کر جاؤں گا''۔

''تمہیں سب آدمی لے جانے ہوں گے''۔

شاہ چیخ کر بولا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے''۔

جنار کرآم پسٹن جی بھاجی والا اور مزدور بنگلی ایم اے نے چلا کے شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ریلوے کے مزدور نے جنار کر سے کہا۔

''یہ کیا دھمالی مچاتے ہو...... اٹھائیس آدمیوں کی بس ہے۔ وہ بتیس لے جا رہا ہے۔ اب تم دوسرے آدمیوں کو اندر آنے کی دعوت دیتے ہو۔ بس اتنا بوجھ کیسے لے جا سکتی ہے عقل کی بات کرو......''

''ساری عقل تم میں بھری پڑی ہے''۔

جنار کرآم والے نے بڑی نخوت سے مزدور کے گندے لباس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور گاڑی سے باہر کھڑی ہوئی ایک گورے رنگ کی سندھی عورت سے زور سے کہا۔

''ماں تم بھی اندر آ جاؤ...... یہ بس سب کو لے جائے گی''۔

بہت سے لوگ ہنسنے لگے بس کنڈیکٹر دانت پیس کے رہ گیا بولا۔

''ابھی پولیس کو بتاتا ہوں......''

اتنا کہہ کر وہ قریب کے ایرانی ریستوران میں پولیس کو ٹیلی فون کرنے چلا گیا۔

''لانے دو پولیس کو......''

دربارا سنگھ فلوٹیا جو شراب کے نشے میں دھت تھا بولا۔

''ہم پولیس سے ڈرتے ہیں۔ بس والوں سے ڈرتے ہیں؟ پوچھ لو کسی سے؟ دربارا سنگھ کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس روز ہولی کے دن میں ایک مُدراسی کے منہ پر رنگ مل دیا۔ سالا بولا ہم تم کو مارے گا۔ تو میں نے ڈانگ مار کر اس کا سر توڑ دیا۔ سالا مُدراسی بھاگ گیا، دوسرے دن پھر ملا...... سر پر پٹی باندھے تھا میں نے کہا تم مُدراسی ہے ہم دربارا سنگھ ہے ہم تمہارا سر توڑ دے گا۔ پولیس کو بلاؤ سب کے سامنے تمہارا سر توڑ دے گا۔

دربارا سنگھ کی پگڑی اتری ہوئی تھی اس کا چہرہ شراب سے سرخ تھا! اس کے گھٹنوں پر فلوٹ کا ایک بکس بند پڑا تھا۔

وہ غصے سے بولا۔

''یہ سالا بس کیوں نہیں چلاتا......''

ایک آدمی نے دربارا سنگھ سے کہا۔

''وہ پولیس کو بلانے گیا ہے......''

''بلا کے لائے...... پولیس کو کیا اپنے باپ کو بلا کے لائے دربارا سنگھ سب کا سر توڑ دے گا۔ اس دن وہ مُدراسی......

بہت سے لوگ دربارا سنگھ کی تعریف کرنے لگے۔

''بڑا جی دار آدمی ہے جی...... بے خوف، بے جگرا، اکیلے ہی دس آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے......''

دربارا سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔

''پوچھ لو......اسی مُدراسی سے پوچھ لو......'' وہ بولا۔

''تم ہم کو مارے گا۔ میں نے کہا۔ ہاں......ہم تم کو مارے گا''۔

آج بھی مارا کل بھی مارے گا......!

''ہمارا نام دربارا سنگھ ہے سارا بمبئی ہم سے ڈرتا ہے۔

جنار کرنے کہا۔

''اس بس کنڈیکٹر کے بچے کو تو اب ایسا مزا چکھاؤں گا کہ یاد ہی کرے گا''۔

تھوڑی دیر میں بس کے بہت سے آدمی ایک ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنی بہادری اور بے جگری کی من گھڑت داستانیں سنا رہا تھا۔ صرف ریلوے مزدور چپ بیٹھا تھا۔ لوگوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

میں نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ میری نگاہ گورے رنگ کی بڈھی سندھی عورت پر تھی جو واقعی کسی زمانے میں بڑی خوبصورت ہوگی۔ اس کے قریب ایک نو بیاہتا جوڑا بیٹھا تھا۔ جو دوسری گاڑی سے آیا تھا وہ جوڑا دنیا مافیہا سے بے نیاز ہو کے صرف ایک دوسرے کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں بھی یکا یک بس کے سارے منظر کو بھول گیا......کیسی خوبصورت تھی دس سال کے بعد بمبئی میں ایسی موہنی صورت دیکھنے کو ملی اسے دیکھ کر میں بس سے اٹھ کر کہیں بہت دور چلا گیا اور میرے ذہن میں وہ پھول کھلنے لگے جو کبھی تیرے ہونٹ تھے۔ وہ نورس کلیاں جو تیری باتیں تھیں، وہ بوسے جو کبھی میرے تھے۔ کیا وہ جھرنا ابھی تک بہہ رہا ہے کیا تو اسی طرح وہاں سیب کی ڈالی کی طرح جھکی ہوئی کھڑی ہے۔ کیا تیرے دل میں میری محبت کے شگوفے ابھی لرز رہے ہیں۔ کیا تیری آنکھوں کے نیلگوں آسمان پر میرے دل کا حیران حیران تارا ابھی تک ڈول رہا ہے......

کہاں ہے تو اے میری گزری ہوئی محبت کی پچیس سالہ بازگشت، تو کیوں اس وقت رات کے سناٹے میں اک دور جانے والی گاڑی کی صدا کی طرح مجھے چونکانے آئی ہے۔ اپنی یاد کو واپس لے جا کیونکہ اب مجھے میرے لیے کچھ نظر نہیں آتا۔ کوئی گلاب نہیں ہے، کوئی تارا نہیں ہے اور کوئی شگوفہ نہیں ہے۔ میں ہوں۔ زندگی کا بس اسٹینڈ ہے اور آخری بس کا انتظار ہے۔

آدمی خدا کو بھی معاف کر دیتا ہے لیکن محبت کبھی معاف نہیں کرتی۔ میں نے اس

لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے پر جھکتے ہوئے ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتے دیکھا۔

''نہیں......نہیں......''

''یہ وہ نہیں ہے۔ ہرگز ہرگز وہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہیے۔

میں نے نگاہیں پھیر لیں......اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

بس کنڈ یکٹر ایک پولیس انسپکٹر اور اسٹیشن لائن کے تین سپاہیوں کو لے کے آ رہا تھا۔

یکا یک لوگوں کا شور تھم گیا۔ چہرے خوفزدہ ہو گئے۔ جنار کر اور دربارا سنگھ فلوٹیا جو سب سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہے تھے یکا یک ایسے چپ ہو گئے جیسے ان کی سانپ سونگھ گیا ہو۔ جے جے شاہ بار بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کی بیوی گجراتی زبان میں غالباً اسے تسلی دیتی جاتی تھی۔

پولیس انسپکٹر نے آتے ہی گرج کر کہا۔

''اتنے فالتو آدمی کیوں بیٹھے ہیں نکالو ان سب کو''۔

سب لوگ چپ چاپ بیٹھے رہے ان میں سب سے زیادہ چپ دربارا سنگھ فلوٹیا تھا۔

''کون کون دیر سے آیا ہے؟''

انسپکٹر نے سختی سے پوچھا۔

سب لوگ چپ رہے۔

انسپکٹر نے گھوم کر بس کنڈ یکٹر سے کہا۔

''تم بتاؤ نا اب میں کس کس کو نکالوں کس کو رکھوں؟''

بس کنڈ یکٹر نے جے جے شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ آدمی دیر سے آیا ہے''۔

جے جے شاہ نے کانپتے ہوئے غصے سے کہا۔

''جھوٹ بولتا ہے۔ انسپکٹر صاحب، میں تو کب سے گاڑی میں بیٹھا ہوا ہوں اپنی

بیوی کے ساتھ پوچھ لو اس سے......''اس نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

انسپکٹر مسکرایا۔ بولا۔

''تم نیچے آجاؤ......''

''مگر''

''اگر مگر نہیں چلے گی''

''مگر میرے ساتھ میری بیوی ہے''

بیوی بولی۔

''میں بس میں گھر جاؤں گی۔ تم خواہ مخواہ جھگڑا مت کرو''۔

''میں نو بھارت اخبار کا ایڈیٹر ہوں میں پبلک کا نمائندہ ہوں......سمجھ لوں گا۔

پولیس انسپکٹر بولا۔

''میں خود بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے جانے والا تھا کہ یہ آ گیا۔

''مجھے مت ستاؤ۔ جلدی جلدی بولو......کون دیر سے آیا تھا؟''

بس کنڈیکٹر نے جنار کر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ بھی دیر سے آیا ہے''

''میں......میں......''

انسپکٹر صاحب جنار کر گڑ گڑا کر بولا۔

میں تو بس میں سب سے پہلے گھسا ہوں۔ بس اک دم خالی تھی۔ جب میں گھسا۔

''باہر نکلو......''

انسپکٹر بولا۔

''یہ دربارا سنگھ......''

بس کنڈیکٹر دربارا سنگھ کا نام تک جانتا تھا۔

دربارا سنگھ خاموشی سے اپنی پگڑی اور فلوٹ سنبھال کے اتر گیا۔

بس کنڈیکٹر نے چاروں طرف گھور کے دیکھا۔ میرا رنگ فق ہو گیا۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح مسکراتا رہا۔

بس کنڈیکٹر نے آگے بڑھ کر پستن بھاجی والے کو اتار دیا۔

جب کنی لال دھوبی کو اتارنے لگا تو اسے بہت غصہ آیا کنی لال دھوبی نے اسے سرزنش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''آنا کبھی سات بنگلے کی طرف تیری اچھی طرح تکا بوٹی......''

بس کنڈیکٹر نے گھبرا کر پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھ کر شکایتاً کہا۔

''سن لیجئے حضور سن لیجئے......ابھی سے دھمکیاں دے رہا ہے''۔

''کیا کہا......؟

پولیس انسپکٹر نے گرج کر کہا۔ اس نے کنی لال کو شانے سے پکڑ لیا اور ایک سپاہی سے کہا۔

''اسے تھانے لے جاؤ......ڈبل چارج مارو......''

''نہیں حضور نہیں حضور میں تو آپ کا غلام ہوں......'' کنی لال گڑگڑانے لگا۔

بس کنڈیکٹر پھر مجھے گھورنے لگا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ جب وہ میری طرف جھکا تو میں نے بھی اس کی طرف جھک کر بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''وہ جو آدمی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہے''۔

میں نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''وہ دوسری گاڑی سے آیا تھا۔

بس کنڈیکٹر نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کے کندھے پر جھپٹا مار کر کہا۔

''نکلو باہر......''

''مگر میں سچ کہتا ہوں...... میں سب سے پہلے۔ پوچھ لو، اس سے......'' ڈاکٹر نے

میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

اس لڑکی اور لڑکے کو نکالنے کی جرات بس کنڈیکٹر میں نہ تھی وہ کئی بار ان کے پاس سے ہو کر چلا گیا۔ کئی بار وہ ان کے پاس آ کے ٹھٹکا......رکا......پھر گھبرا کے آگے چلا گیا۔

کئی بار وہ محبت کے ساحل پر آ کر رکا۔ مگر وہ محبت ایسی والہانہ تھی ایسی اپنے میں کھوئی ہوئی تھی ایسی اس سے بیگانہ تھی، ایسی سرمستی میں میں سرشار تھی۔ دل کے دروازوں کو بند کر کے ایسی بے سدھ ہوئی پڑی تھی کہ بس کنڈیکٹر کو دروازے کھٹکھٹانے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

اور دوسرے دو چار آدمیوں کو باہر بھیجنے لگا۔ وہ لوگ اللہ بھگوان کی گواہی پیش کر رہے تھے مگر بس کنڈیکٹر کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ اس وقت وہ صرف سمندر کا نغمہ سن رہا تھا۔

''اب گنو......''

انسپکٹر نے بس کنڈیکٹر سے کہا۔

بس کنڈیکٹر نے مسافر گنے......انتیس مسافر تھے۔ مجھے تو اب وہ کسی طرح نہ نکال سکتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان میر جعفر کا رشتہ قائم ہو چکا تھا بس وہی گورے گورے رنگ کی سندھی عورت رہ گئی تھی جو واقعی دیر سے آئی تھی۔ وہ واقعی دیر سے آئی تھی۔

اسے اڈے پر سب جانتے تھے۔ یہ بڑھیا ایک نائٹ اسکول میں ایک غریب استانی تھی اور سب سے آخر بس اسٹینڈ پر پہنچتی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک بڑا تھیلا ہوتا جس میں آلو، پیاز اور دوسری ترکاریاں بھری ہوتیں۔ وہ بیوہ تھی اور ہمیشہ سفید کپڑے پہنتی تھی جن پر اکثر پیوند لگے ہوتے تھے۔

بس کنڈیکٹر نے بادل نخواستہ اس سے کہا۔

''تم بھی اتر جاؤ ماں جی......''

''پھر میں اس وقت کہاں جاؤں گی......کیسے گھر پہنچوں گی۔

پولیس انسپکٹر نے کہا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں...... یہ میونسپل کمیٹی کا حکم ہے''۔

''مگر بچہ میرے پاس ٹیکسی کے پیسے نہیں ہیں۔ میں تین میل پیدل کیسے جا سکتی ہوں رات کے بارہ بجے ہیں...... مجھے جانے دو...... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔

وہ پولیس انسپکٹر کے پاؤں چھونے لگی۔

پولیس انسپکٹر نے جلدی سے پاؤں پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

میں مجبور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا''۔

''بس کنڈیکٹر نے شکایت کی ہے۔ میں اٹھائیس سے زیادہ آدمیوں کو اس میں سوار نہیں ہونے دوں گا۔ تم نیچے اتر جاؤ''۔

''بھگوان کیلئے مجھے جانے دو......''

بڑھیا گڑگڑانے لگی۔

''میں دس بجے نائٹ سکول سے فارغ ہوتی ہوں۔ گیارہ بجے یہاں پہنچتی ہوں ابھی گھر جا کے اپنا کھانا بناؤں گی ایک بیوہ پر ترس کھاؤ''۔

بڑھیا رونے لگی۔

پولیس انسپکٹر نے بس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اگر آپ میں سے کوئی ایک آدمی اتر جائے اور اس عورت کو جانے دے تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

کوئی اپنی سیٹ سے نہیں ہلا۔ نہ حاجی داؤد...... نہ بکل ایم اے، نہ وہ مارواڑی جو سوئٹزرلینڈ سے ہو کے آیا تھا۔ نہ وہ سندھی دوکاندار...... گاڑی میں سب لوگ اطمینان سے بیٹھے رہے اور کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگے۔ جیسے پولیس انسپکٹر ان سے نہیں خلا میں کسی سے مخاطب ہو آخر سب کو گھر جانا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے بڑھیا سے کہا۔

''کوئی نہیں اٹھے گا۔ تمہیں نیچے اترنا پڑے گا''۔

بڑھی نے سسکیاں لیتے لیتے اپنے جھولے کو سنبھالا اور چاروں طرف بس کے بے رحم مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر آہستہ آہستہ بس سے باہر جانے لگی۔

یکا یک وہ نیلی وردی والا میلے کچیلے تیل کے دھبوں والا انجن میں کوئلے جھونکنے والا مزدور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ آہستہ بڑھی استانی کو روک کر کہا۔

''تم سیٹ پر بیٹھو ماں ...... میں اتر جاتا ہوں ......''

اتنا کہہ کر اس نے ایک قہر آلود نگاہوں سے بس میں بیٹھے ہوئے خوش پوش آدمیوں کی طرف دیکھا۔

اس کے سیاہ چہرے پر اس کی آنکھیں دو سرخ بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا اور خاموش ہو کے لنگڑاتا ہوا اپنی سونٹی کا سہارا لیتا ہوا نیچے اتر گیا۔

اس کی بائیں ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

شائد وہ نیچے نہیں اترا تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو ان کے ضمیر کی سیڑھی سے نیچے اتار دیا تھا۔ کیونکہ جب بس چلی تو ہر شخص اپنی سیٹ پر چپ چاپ خوفزدہ بیٹھا تھا۔

چیچک رو گنجن ٹاکیز میں کام کرتا ہے۔ اس سے یہ خاموشی سہاری نہ گئی۔

اس نے میری طرف جھک کر بڑے رازدانہ لہجے میں مسکرا کر کہا۔

''بھائی آپ بھی تو دیر سے آئے ہیں''۔

میں نے گرج کر کہا۔

میں کہاں دیر میں آیا......؟

گنجن میرے گرجنے پر حیران سا ہو گیا۔ پھر وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''ہاں بھائی صاحب آپ پہلے آئے تھے مجھ سے غلطی ہو گئی۔

''تم ہمیشہ غلطی کرتے ہو......''

میں نے چلا کر کہا۔

گنجن چپ ہو گیا۔

گاڑی میں کوئی نہیں بولا۔

بس موڑ پر سے گزری

اور لنگڑاتے ہوئے مزدور کو پیچھے چھوڑ گئی۔

کھڑکی سے باہر دیکھنے والے لوگوں نے یکا یک اپنے چہرے اندر کر لیے۔

لیکن مزدور کی سونٹی ٹک ٹک ان کے دلوں کے سخت فرش پر ایک ہتھوڑے کی ضرب کی طرح بجتی گئی۔

اب ہر شخص اپنی جگہ شرمندہ محجوب ایک بیدزدہ کتے کی طرح دم دبائے چپ بیٹھا تھا۔

یکا یک مجھے احساس ہوا جیسے یہ بس آگے نہیں پیچھے چل رہی ہے اور وہ مزدور ہم سے کہیں بہت دور آگے جا رہا ہے۔

◆◆◆

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کرلا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی، ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے، کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر، سڑک کے دورویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے نہ چھاؤں، سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ، سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے، نہ شگاف، سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے۔ اور اب اس پر تارکول بھی بچھی ہے جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی بھالی ہیں، لمبی لمبی، چوڑی چوڑی سڑکیں برادے سے ڈھنپی ہوئی سڑکیں، سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو شمشاد کے درخت کھڑے تھے، سڑکیں...... مگر نام گنانے سے کیا فائدہ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی۔ لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں، کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔ متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں، اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں سے قریب ہی ہے اٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لاء کالج کے پاس واقع ہے۔ بس یہی دو فرلانگ کی سڑک، ہر صبح اور ہر شام کچہریوں سے لے کر لاء کالج کے آخری دروازے تک، کبھی

سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا، اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے، اور یہ ہے بھی سچ اسے کسی کی پرواہ کیوں ہو؟ سینکڑوں ہزاروں انسان۔ گھوڑے گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اسی طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسے پہلے روز تھی۔ جب ایک یوریشین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ یا شاید یہ سوچتی ہی نہیں، میرے سامنے ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز ہر لمحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی، لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ہی، اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک درز بھی پیدا نہیں ہوئی۔

''ہائے بابو، اندھے محتاج غریبن فقیر پر ترس کر جاؤ، اے بابا، اے بابو خدا کیلئے ایک پیسہ دیتے جاؤ اے بابا، ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں، ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پر''۔

بیسیوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے، تو کوئی لنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک خطرناک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے چھوٹے بچے گود میں لئے حسرت بھری نگاہوں سے راہ گیروں کی طرف دیکھتی جاتی ہے۔ کوئی پیسہ دے دیتا ہے۔ کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے کوئی گالیاں دے رہا ہے، حرام زادے مسٹنڈے، کام نہیں کرتے۔ بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بے کاری، بھیک۔

دولڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں، ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک سست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آ گیا ہے۔ اس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اس کی ہلکی ہلکی دردناک

ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا ہوا اس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے، اس کی سیاہ ساڑھی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی چھدری چھاؤں میں، ایک ٹانگے والا گھوڑے کو ستا رہا ہے۔ گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں، پولیس کا سپاہی آتا ہے۔ ایک زور کی سیٹی، او تانگے والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کیا نام ہے تیرا، کردوں چالان؟ ہجور، ہجور کا بچہ! چل تھانے، ہجور؟ یہ تھوڑا ہے، اچھا جا تجھے معاف کیا۔

ٹانگے والا ٹانگے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک ''گورا'' آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی ہاتھ میں بید کی چھڑی، رخساروں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سر۔

''کھڑا کردو، کنٹونمنٹ''

''آٹھ آنے صاحب''

''ویل، چھ آنے''

''نہیں صاحب''

''کیا بکتا ہے، ٹم......''

تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے، پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں، پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔ حرام زادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پوچھ رہا ہے، لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سنسان ہے۔

شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ کچہریوں کے قریب چند مزدور، بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کر رہے ہیں۔

''بھیا بھرتی ہو گیا''۔

''ہاں''

تنخواہ تو اچھی ملتی ہو گی''۔

''ہاں''

''بڑھیو کیلئے کما لائے گا۔ پہلی بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑھی میں رہتی تھی''۔

''سنا ہے، جنگ شروع ہونے والی ہے''

''کب شروع ہو گی؟''

''کب؟ اس کا تو پتہ نہیں، مگر گریب ہی تو مارے جائیں گے''۔

''کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر''

''ننھا کیسا ہے؟''

''بخار نہیں ٹلتا، کیا کریں، ادھر جیب میں پیسے نہیں ہیں ادھر حکیم سے دوا......''

''بھرتی ہو جاؤ''

''سونچ رہے ہیں''

''رام رام''

''رام رام''

پھٹی ہوئی دھوتیاں ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں۔ نہ حریت، یہ کیسی عجیب باتیں ہیں، پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔

دو عورتیں، ایک بوڑھی ایک جوان، اپلوں کے ٹوکرے اٹھائے۔ خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے،

''بیٹی ذرا ٹھہر تو۔'' بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں۔ اس کی چال مدھم ہے۔ اس کی لہجے میں بے کسی ہے۔

''بیٹی، ذرا ٹھہر، میں تھک گئی......میرے اللہ''

''اماں، ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے، تو تو باؤلی ہوئی ہے''

''اچھا بیٹی، اچھا بیٹی''

بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جا رہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔

وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے، اپلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے، کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا، کوئی سے ایک لمحہ ستانے نہیں دیتا، وہ بھاگی ہوئی جا رہی ہے۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ اس کی جھریوں میں غم ہے اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی۔

تین چار نوخیز لڑکیاں۔ بھڑکیلی ساڑھیاں پہنے۔ بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے جا رہی ہیں۔

''بہن، آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں''

''بہن آج لارنس گارڈن چلیں''

''بہن آج انارکلی''

''ریگل؟''

''شٹ اپ یوفول''

آج سڑک پر سرخ حلوان بچھا ہے، آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں، جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں۔ کسی بڑے آدمی کی آمد ہے۔ جبھی تو سکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دورویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں میں پپڑیاں جم گئی ہیں، ان کے چہرے دھوپ کی حدت سے تمتما اٹھے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ پہلے پہلے یہاں سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اب سب

چپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب استاد انہیں کان سے پکڑ کر اٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھل گئی تھی، استاد اس سے گھور کر کہہ رہا ہے او شفی پگڑی ٹھیک کر، پیارے لال کی شلوار اس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔ "تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال"

"ماسٹر جی، پانی"

پانی کہاں سے لاؤں، یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ دو تین منٹ اور انتظار کرو، بس ابھی چھٹی ہوا چاہتی ہے۔

دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ

ماسٹر جی، پانی۔

ماسٹر جی، پانی۔

ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے۔

لیکن استاد اب اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے وہ ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ لڑکو ہوشیار ہو جاؤ۔ دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا، ابے تیری جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہو جاؤ بدمعاش کہیں کا......سواری آرہی ہے۔

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی۔ سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے۔

بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا، لڑکوں کی جان میں جان آ گئی ہے۔ اب وہ اچھل اچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں، ریوڑیاں، گرم گرم چنے، حلوہ پوری نان، کباب۔

ایک خوانچے والا ایک طرے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے۔ مگر آپ نے میرا خوانچہ الٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا۔ میں غریب آدمی ہوں، میرا نقصان پورا کر دیجئے تو میں جانے دوں گا۔

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہے ہیں۔ ان کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے۔ جیسے بیلوں کے منہ پر جب وہ کولہو چلاتے ہیں۔ وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دیئے جا رہا ہے۔ میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ چھکڑے کے آگے جتے ہوئے دو بیلوں کی گردنوں میں زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ چھکڑے والا سردی میں ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا گداگر مرا پڑا ہے۔ اس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔

خدا کیلئے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا۔

کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے سنتی ہے۔ مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ انسان کے دل کی طرح بے رحم، بے حس و وحشی ہے۔

انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنامیٹ لگا کر اڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی، اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے میں پاگل سا ہو جاتا ہوں، چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں۔ میں انسان نہیں ہوں، میں پاگل ہوں، مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔

سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔

یہ دو فرلانگ لمبی سڑک۔

◆◆◆

مہالکشمی کا پل

مہالکشمی کے اسٹیشن کے اس پار لکشمی جی کا ایک مندر ہے اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں۔ جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے۔ اور اس بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پل ہے۔

مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ ان کے پہننے والے بھی کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کیلئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے اس پار جاتے ہوئے لوگ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، گہرا، بھورا، مٹ میلا، نیلا، قرمزی بھورا، گہرا سرخ کنارہ گہرا نیلا اور لال، وہ اکثر انہی رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ایک لمحے کیلئے دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذب نظر نہیں رہے۔ کسی زمانہ میں ممکن ہے جب یہ نئی خریدی گئی ہوں۔ ان کے رنگ خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں، مگر اب نہیں ہیں۔ دھوئے جانے سے ان کی چمک دمک مرچکی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سے روزمرہ کے انداز کو لئے بڑے بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انہیں سو بار دیکھئے۔ یہ آپ کو کبھی دکھائی نہ دیں گی نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا ابھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں روزن نظر آتے ہیں۔ کہیں ادھڑے ہوئے ٹانکے ہیں۔ بدنما داغ جو اس قدر پائیدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔

میں ان ساڑھیوں کی زندگی کو جانتا ہوں کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے بڑی غریب کی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ اس لئے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ابھی وزیر کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے اس لئے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔

ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی ساڑھی دکھائی دیتی ہوگی مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی تھی اب نہیں میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا اور اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شانتا بائی کی ساڑھی کا اور شائد آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں۔ میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی وہ شانتا بھائی کی

ساڑھی ہے اور جو دوسرے بھورے رنگ کی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ جیون بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیون مل کے کپڑا کھاتے میں کام کرتا ہے۔ اسے بہت جلد جانا ہوتا ہے۔ اس لئے شانتا بائی اپنے خاوند کیلئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا کے رکھتی ہے۔، کیونکہ صبح اسے خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونے کیلئے دوسروں کے گھروں میں جانا ہوتا ہے اور اب وہ ساتھ میں اپنی چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے اور دوپہر کے قریب واپس چال میں آتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لئے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے میں لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر چولہا اس وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولہے ٹھنڈے ہو جائیں۔ یعنی دوپہر کو دو بجے اور رات کے نو بجے۔ ان اوقات میں ادھر اور ادھر سے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجھی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں اور اس وقت شانتا بھی میری نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھنتی بڑبڑاتی چولہا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولہے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے۔ شانتا بائی اس کے چینی کے ایسے نازک رخساروں پر زور زور کی چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا ہے اور اسے اکثر بھوک

رہتی ہے اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجرے اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر دن بھر باجرا اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر اک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے ہیں اور جب پیگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا رخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن پئے گا۔ دو دن پئے گا تیسرے دن کی تاڑی کے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔ راشن کا خرچہ ہے۔ بھاجی ترکاری ہے۔ تیل اور نمک ہے۔ بجلی اور پانی ہے۔ شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدی نکمی ساڑھی دیتے ہیں، ان کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کر جوڑ کے گانٹھ کے ٹانکے لگا کے کام چلتا ہے اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آ جاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتا ہے۔ برتن صاف کرنے ہوتے ہیں، تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ وہ بھورا رنگ پسند نہیں کرے گی تو کیا چمکتے ہوئے شوخ رنگ گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی اور اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے۔ پہنے تھے۔ انہیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا جب وہ دھاروار میں اپنے گاؤں میں تھی جب اس نے بادلوں

میں شوخ رنگ بھی دیکھے تھے۔ پہنے تھے۔ انہیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا جب وہ دھارواڑ میں اپنے گاؤں میں تھی جب اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے۔ جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے، ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیڑو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ پیڑو توڑ توڑ کر کھایا کرتی تھی۔ جانے اب پیڑو میں وہ مزہ ہی نہیں ہے وہ شیرینی اور گلاوٹ نہیں ہے۔ وہ رنگ اور چمک دمک کہاں جا کے مرگئی اور وہ سارے رنگ کیوں یک لخت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے مانجھتے کھانا پکاتے، اپنی ساڑی دھوتے، اسے پل کے جنگلے پر لا کر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹڑی پر بہتے جاتے اور دوسرے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا۔ لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ بھی ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں اور اتنی دور سے معلوم بھی ہوتے ہیں۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی، لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس پہلی ساڑھی کا ہے اور اس دوسری ساڑھی کو مضبوط کرنے کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کی ڈھنگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کیلئے روتی ہے جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لئے نشے

میں تھا کہ وہ اس روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈ واب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور انٹیوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دمے میں مبتلا کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں ہو کام کرتا تھا سنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکالدیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا کیا ہوا اگر غصے میں آ کر ایک دن اس نے جیونا بائی کی آنکھ نکال لی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصے پر قربان نہیں کی جا سکتی اور غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا اسے اپنی بے کاری کا غم تھا، اپنی 35 سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا غم تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ 35 سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کیلئے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا۔ اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آنے پر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان 35 سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اسے بیکار سمجھ کر باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکا یک ڈھونڈو نے غم اور غصے سے اپنے ہاتھ ملے۔ زمیں پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی۔ اگر اس کے پاس علاج کیلئے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر، سڑ سڑ کر، خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپاؤنڈروں اور نرسوں کی

بداحتیاطی اور گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہوگئی۔ اور جب جیونا اچھی ہوگئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجنے کا کام دلوا دیا تھا اور گو وہ اب بوڑھی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی اور اب اسے صرف اپنا دھندہ کرنا تھا شادی کے دو سال بعد اسکے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھی ہے لیکن جیونا بائی کو یقین نہیں آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کردی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہ کرے گی، اس کا اسے خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ پر نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی۔ باجرے کی روٹی، ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کیلئے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کیلئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے کیلئے لے جانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آکے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگی۔ اور اسے دیکھ کر جیونا کو یقین آیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے۔ اس کا پتی، اس کی بیٹی اس کی عزت جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا، شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے نہتا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونا کو اس ایک لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہوگئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کر بیٹھ گئی۔ ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کو لئے گنے کا رس نکالنے والی مشین میں ٹھونسا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکا جاتا ہے۔ اور یکا یک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہوگئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے اور مٹیالا بھی ہے کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا اور غلیظ ہو جاتا ہے۔ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں۔ پنسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیون مل اور بکسر یا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے اس لئے میں بھی انہیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں مگر میں مزدور نہیں ہوں، کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں۔ میں دسویں پاس ہوں۔ ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیر اعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں تھوڑی دیر بعد ان کی گاڑی مہالکشمی پر آئے گی۔ نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیر اعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اسے اپنے ساتھ لے نہیں جا سکتا کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ③ جاتی ہے ... کم پڑتا ہے ... "پانی ... تا ہے ... کو سونے کیلئے ... کم پڑتی ہے ... کم پڑتی ہے کہ مہینے "صر ...

ہے باقی سو تا

ما کی طر ندگی ہے

کے ٹھ

لایا لی جب گئے

کے سوچا کرتی تھی با بڑ ترے دنو نے سوچا تو

کی طرح یری کی سینما کی تو تی مسکی جب با کی طرح

خو کرتی ہٹ نہ جا کی یک مستقل

کر شا با پر لے لی

جت

تر

شاید خا

یک یک یک شاید یک

یک یک یک

کہ دیا تا

یر تر

پڑھی تھی بگو یر

تھے پرد قریب پڑھا لیے

پر د

یک جٹ نگ

نزدیک بھنچی تھی د

جسے د

جسے

◆◆◆